اس شمارے کے ساتھ ماسک کا تحفہ ضرور حاصل کیجیے
کراچی
ماہنامہ
آنکھ مچولی
نومبر ۱۹۹۵ء
خوفناک نمبر

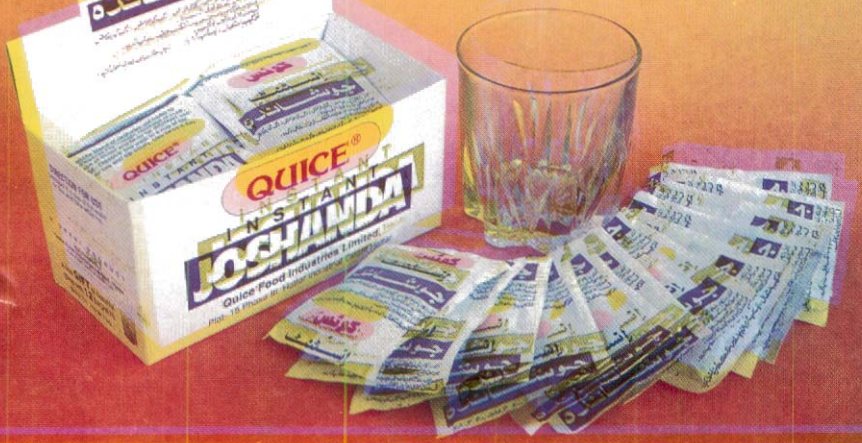

نزلہ، زکام، کھانسی، گلے کی سوزش اور خراش سے فوری آرام کیلئے
کوئس
اِنسٹنٹ
جوشاندہ
12 ساشے
کے ساتھ ایک خوبصورت گلاس کا تحفہ
بالکل مفت
QUICE
INSTANT
JOSHANDA
Quice Food Industries Limited
کوئس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ
ہیڈ آفس: 11/139 جمال الدین افغانی روڈ۔ نزد بہادر آباد، شرف آباد۔ کراچی
فون: 4924814 فیکس: 4947941
لاہور برانچ آفس:
A - 32 جیل روڈ لاہور فون: 7575011
پشاور برانچ آفس:
1-2C گل پلازہ۔ چارسدہ روڈ پشاور فون: 241945
راولپنڈی برانچ آفس:
چاند پلازہ۔ گلی نمبر 6۔ پشاور روڈ۔ راولپنڈی فون: 473407
ملتان برانچ آفس:
521 معصوم شاہ روڈ۔ یسین آباد کالونی ملتان
فون: 551895

SUPER CRISP

Snacks for all seasons

مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور اَب بادام بھی

حفظانِ صحت کے بین الاقوامی

معیار کے مطابق

مصر طرح کی ملاوٹ سے پاک

WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY

RNEW CONCEPTS

NOORANI

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا.... بتادو نا

ناز پان مصالحہ

ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-74800 PAKISTAN
CABLE: "TWO-IN-ONE" FAX: 021-7219548

LASER DOT

نہ وقت کا زیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت

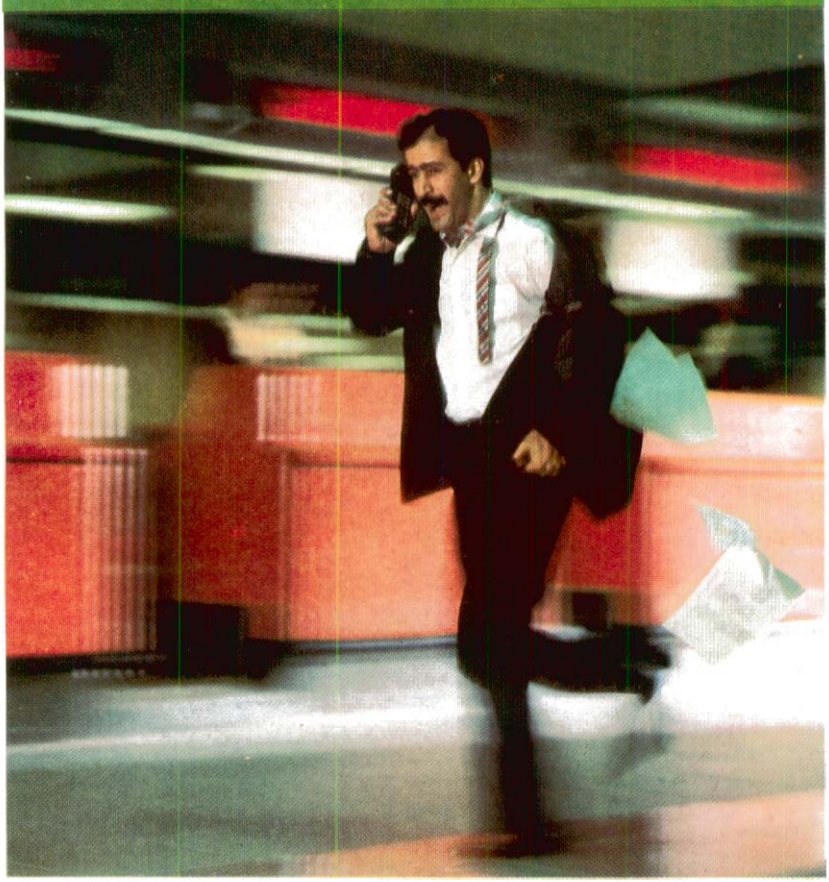

ان میں ہماری روزانہ ۴۷ بین الاقوامی پروازیں بھی شامل کیجئے تو ہم ہی آپ کو روزانہ دوسروں سے کہیں زیادہ مقامات تک پروازیں فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے اندرون ملک دائرۂ پرواز کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مثلاً صرف کراچی اور لاہور کے درمیان ہم روزانہ تقریباً سات پروازیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات تک رسائی کے لئے ہم آپ کی سہولت کے مطابق ہر وقت تیار ہیں۔ پروازوں کا وسیع ترین دائرۂ کار ہمارے ساتھ سفر کا ایک اور جواز۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل

نہایت موثر اجزاء کے اضافے کے ساتھ
نئے اسٹرپ پیک میں

نئی، مفید ترین

سُعالین

گزشتہ ساٹھ سال سے انکشافاتِ حاضرہ اور اکتشافاتِ جدیدہ سے ہم آہنگ
کھانسی، نزلہ و زکام کے لیے سب سے مفید اور سب سے موثر کھانسی کی ٹکیاں

انکشافاتِ ماضی اور اکتشافاتِ جدیدہ نے ہر طرح ثابت کر دیا ہے کہ نباتات ہی ہیں جو جسمِ انسانی میں کوئی غیر طبعی ہنگامہ آرائی کیے بغیر شفائے امراض کا سامان کرتی ہیں۔

ہمدرد اس اندازِ فکر کا پُرجوش حامی رہا ہے۔ ملکی اور عالمی سطح پر۔ تحقیقاتِ نباتات کو ہمدرد نے اپنا موضوع بنائے رکھا ہے۔

آج ساری دنیا بھرپور اعتراف کے ساتھ نباتات سے شفائے امراض پر متوجہ ہو چکی ہے۔ اسی لیے سُعالین جس طرح پاکستان میں ایک بہترین دوائے شافی کے طور پر مقبول ہے اسی طرح دنیا بھر میں سُعالین کو قبولِ عام حاصل ہے۔

خاص طور پر تیار کردہ نئی اسٹرپ پیکنگ تاکہ سُعالین کے نازک ضروری اجزاء مکمل طور پر محفوظ رہیں اور استعمال پر سُعالین تیر بہدف ثابت ہو۔

سُعالین اسٹرپ کے علاوہ
پچاس قرص کی شیشی میں
بھی دستیاب ہے۔

سُعالین جوشاندے کا جوہر ہے۔
تین ٹکیاں گرم پانی میں ڈال کر
نوشِ جاں کیجیے۔ نزلہ، زکام اور
کھانسی سے راحت پائیے۔

جب کھانسی کا ٹھسکا ہو، ایک ٹکیہ
سُعالین منہ میں ڈال کر چوسیے۔
منٹوں میں راحت پائیے۔ ہر قسم کی
کھانسی کے لیے مفید ترین۔ سُعالین

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت
کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔
اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ
ہمدرد خریدتے ہیں۔
جائز منافع بین الاقوامی شہر
علم و حکمت کی تعمیر میں لگ
رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں
آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-SUA-1/93

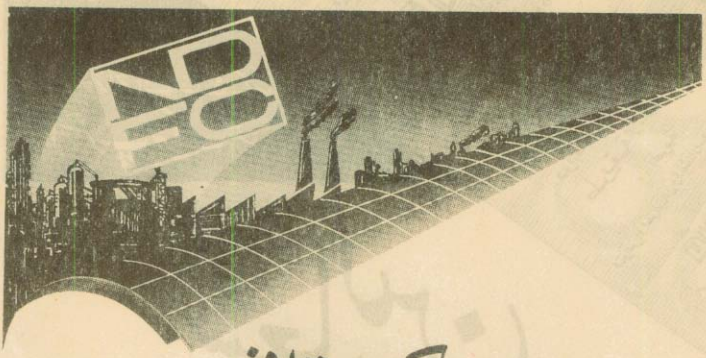

پاکستانی معیشت کی ترقی میں ایک مثبت کردار

نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن، اپنی ابتدا ہی سے پاکستان کی صنعتی اور معاشی ترقی میں انتہائی اہم اور بنیادی کردار ادا کر رہی ہے۔

کارپوریٹ سرمایہ کاری کے تمام مراحل کے دوران، این ڈی ایف سی صنعتی اور مالیاتی سیکٹر کے دوش بدوش ملک اور بیرونِ ملک معاون اور مددگار رہتی ہے۔

ہماری پیش کردہ جامع سہولیات :

- صنعتی منصوبوں کے لئے سرمایہ کاری اور اس سلسلے میں کنسورشیم کا قیام
- حصص (Equity) میں سرمایہ کاری
- اسٹاک مارکیٹ میں حصص کی خرید و فروخت
- مختلف بچت اسکیمیں اور ان پر بہتر منافع
- صنعتی پیداوار کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے قرضہ
- مشاورتی خدمات

— ایسی مہارت جس پر آپ بھروسہ کریں۔

(ملکیت حکومتِ پاکستان)

نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن

NDFC

بہتر اور روشن مستقبل کے لئے کوشاں

چھٹی منزل، فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر، شارع فیصل کراچی۔ پی او بکس 5094 فون : 9-525240

کیبل .TERMFUND ٹیلیکس : 20842 این ڈی ایف سی پی کے۔ فیکس : 525353, 5683923

SofTouch
Baby Lotion

SofTouch بے بی لوشن سے دِن کا آغاز کریں تو ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں شامل مخصوص موائسچرائزر آپ کے بچے کی جلد کی تازگی برقرار رکھتا ہے اور نیپی ریش سے تحفظ دیتا ہے۔

آپ اس یقین کے ساتھ SofTouch بے بی لوشن، شیمپو اور پاؤڈر استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ انتہائی معیاری اجزاء کا مرکب ہیں اور ایک ایسے ماحول میں تیار کئے گئے ہیں جہاں حفظانِ صحت کے اصولوں کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ بچوں کے لئے محفوظ، سازگار اور آرام دِہ ہیں۔ بچوں کے ہر دن کا آغاز SofTouch بے بی شیمپو، لوشن اور پاؤڈر سے کیجئے... غسل کرتے وقت، نیپی تبدیل کرتے وقت... کسی بھی وقت!

Soft, Pure, Gentle.

ICI

ICI Pakistan Limited

Consumer Products

5-West Wharf, Karachi-74000.

" All polishes shine shoes ...

... but only new Cherry Blossom gives them that brilliant shine ! "

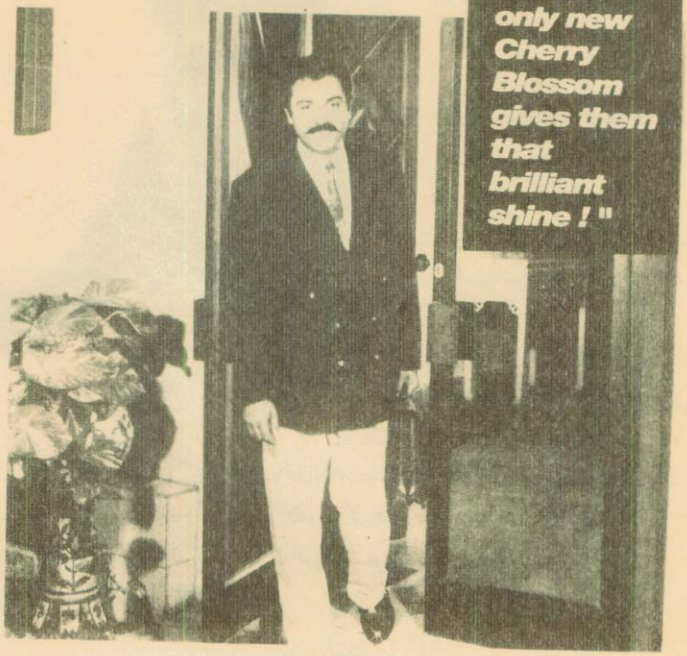

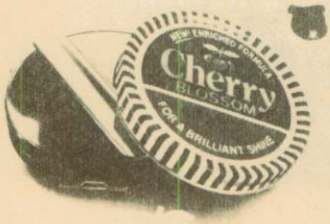

That's because
New Cherry Blossom's
New Enriched Formula
now gives shoes
such a brilliant shine
that is simply not possible
with any other shoe polish.

That is why everybody says:

" For a truly brilliant shine
- the one and only
New Cherry Blossom "

New Cherry BLOSSOM

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ / نومبر ۱۹۹۵ء

شمارہ ۵

جلد ۱۰

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر: ۴۹۴۲۸۵۷ - ۴۹۴۲۴۲۱

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۰-اے پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۳۵ روپے
۱۲ درہم ۱۲ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی۔ مطبع لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف	ادارہ	۱۴
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۱۵
حمد باری تعالیٰ (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء	۱۶
وہ خوف ناک دن	ڈاکٹر حافظ احسان الحق	۱۷
انگاروں پر نماز	ڈاکٹر پرمود پوروال	۲۱
بھید	فصیح باری خان	۲۴
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا (نظم)	محمد جاوید خالد	۳۶
روحوں کی سیکریٹری	عامر اعجاز	۳۸
بھوت نگر	عروبہ منیر	۴۳
موت کا کھیل	شیخ عاکف حمید	۴۵
سر کٹا (نظم)	فیروز خسرو	۴۸
دہشت زدہ	اظہر علی خان	۵۰
مکڑی، خوف کا علاج	نادرہ انصاری	۵۳
ہٹلر کی روح	حنا زہرا	۵۵
خوف ناک بونا	سلمان غزالی	۶۰
خوف ناک تارہ	ابن سلام	۷۰
بندروں کا انتقام	قرۃ العین کلیم	۷۲
آسیبی مکان	مدیحہ اظہر ڈار	۷۴
رات کا ہنگامہ	محمد عادل منہاج	۷۸
چڑیلوں کا شکاری	شیخ عبدالحمید عابد	۹۲
خوف کی قید	اشتیاق احمد	۹۷
ملکہ کا صندوقچہ	نعیم احمد بلوچ	۱۰۳
انوکھا درندہ	ظلِ ہما حمید	۱۰۹

حسنِ ترتیب

آزمائش	عبدالستار خان طاہر	۱۱۴
ڈراپ سین (نظم)	محمد علی انصاری	۱۲۲
مولانا شبلی نعمانی	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۲۵
سرِراہ ایک قتل	عمر صدیقی	۱۳۳
اصلی روپ	صائمہ دلدار	۱۳۴
لہو لہو ہے مرا کراچی (نظم)	ضیغم حمیدی	۱۳۷
نمک سے موت	محمد ظریف	۱۳۸
دنیا کے خوفناک اور خطرناک کھیل	اے ایچ عابد	۱۴۲
کیا وہ خواب تھا	نادیہ غفور	۱۴۶
اندھی قید	الطاف حسین	۱۵۱
اب میں کیا کروں	ادارہ	۱۵۸
ہوا یوں کہ	ادارہ	۱۶۳
ٹیوشن رحمت ہے یا زحمت	تحریری مباحثہ	۱۶۷
دادا کنواں اور کھوپڑی	منصور احمد مگسی	۱۷۵
ہنستے ہنستے	منتخب لطائف	۱۷۹
بنام آنکھ مچولی	خطوں کے جواب	۱۸۳
قصہ اس رات کا	شہناز بیانو	۱۸۷
وہ بھیانک لمحے	عثمان بن سلیم	۱۹۶
غیبی امداد	علی اکمل تصور	۲۰۳
کہانی انسان کی	اسحاق منصوری	۲۰۹
قلم دوست	ننھی تحریریں	۲۱۵
کترنیں	لطائف اور کارٹون	⁂

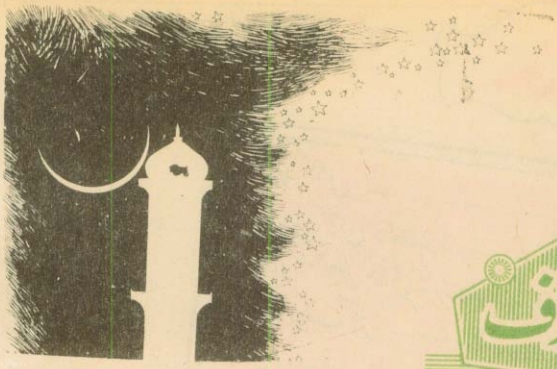

سنہرے حروف

کرناٹک کے نواب والا جاہ محمد علی خان کو اپنے کم سن بیٹے عمدۃ الاُمرا سے بے پناہ محبت تھی۔ عمدۃ الاُمرا ایک دن دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس نے ایک معمار کے بیٹے کے سر پر چھڑی ماری۔ معمار کے لڑکے کے سر سے خون کے چند قطرے نکل آئے۔ نواب صاحب عدالت سے نکل کر محل کی طرف آرہے تھے۔ راستے میں انہوں نے معمار کے لڑکے کو روتے دیکھا اور اس سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ لڑکے نے بتایا کہ عمدۃ الامرا نے اسے چھڑی سے مارا ہے۔ نواب کو یہ سن کر سخت غصہ آیا اور انہوں نے اپنے چہیتے بیٹے کو قاضی کی عدالت میں لے جاکر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کردیا اور قاضی سے کہا کہ انصاف کرے۔

قاضی نے نواب سے کہا کہ یہ سب ابھی بچے ہیں ان میں سے کوئی بھی ابھی اس عمر کو نہیں پہنچا کہ اس پر قانون نافذ ہوسکے۔ نواب نے کہا کہ قانون کے مطابق خواہ عمدۃ الامرا کو سزا نہ دی جاسکے پھر بھی انصاف کا تقاضا پورا ہونا چاہیئے تاکہ دوسرے لڑکوں کو عبرت ہو۔ نواب نے معمار کے لڑکے کو حکم دیا کہ وہ بھی عمدۃ الامرا کے سر پر چھڑی مارے۔ معمار کا لڑکا کانپنے لگا لیکن اسے مجبوراً حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

یہ تھا ایک مسلمان نواب کا انصاف اور یہ تھی اس کی اپنی رعایا سے محبت جس کی آج کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

ماہِ رواں کی پہلی بات

اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں انہیں کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ اس کے برعکس ان لوگوں پر غور کیجئے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں' وہ کتنے خوف زدہ اور بات بات پر پریشان و فکر مند ہو جاتے ہیں۔

آنکھ مچولی کا خوفناک نمبر' تیسری بار اس نصیحت کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے کسی حال میں کسی سے نہ ڈریئے' کبھی خوف زدہ نہ ہوئیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارا محافظ ہے۔ اس خاص نمبر کی فرمائش آپ لوگوں کی جانب سے کافی عرصے سے کی جارہی تھی۔ پچھلے دونوں خوفناک نمبر' اتنے مقبول ہوئے کہ دفتر میں ریکارڈ کی کاپیاں تک ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ہی سے اس کی اشاعت پر اصرار کیا جانے لگا۔ تنگ آکر ہم نے خوفناک نمبر کی اشاعت کا اعلان کردیا۔ لیکن جب پرچہ تیار ہو گیا تو دو ایک خط ایسے بھی آئے جس میں کراچی کے حالات کے حوالے سے خوفناک نمبر نکالنے پر اعتراض کیا گیا تھا۔ سچ پوچھیے تو تھوڑی دیر کے لئے ہم بھی سوچ میں پڑ گئے۔ "آنکھ مچولی" ہمیشہ سے ایک بامقصد رسالہ رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثریت نے اس نمبر کے اعلان کو نہ صرف سراہا بلکہ مضامین اور کہانیوں کا انبار لگا دیا مضامین اور کہانیوں کا انتخاب ہم نے نہایت احتیاط سے کیا ہے۔ "خوفناک نمبر" میں ہم نے خوف کے جذبے کو مختلف پہلوؤں سے دکھانے کی کوشش کی ہے اور اکثر تحریروں کے انجام میں کوئی نہ کوئی نیک پیغام پوشیدہ ہے۔ لہٰذا انشاء اللہ "خوفناک نمبر" کے بارے میں جن دو ایک ساتھیوں نے تشویش ظاہر کی ہے امید ہے رسالہ پڑھ کر ان کی تشویش دور ہو جائے گی۔ اس نمبر کے لئے ہمیں ڈھیروں مضامین موصول ہوئے۔ افسوس کہ ان میں صرف معیاری تحریروں کا انتخاب کیا جاسکا۔ جن ساتھیوں کی تحریریں شائع نہ ہو سکیں۔ ان سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

"خوفناک نمبر" آپ کو بے خوف بنانے کی ایک کوشش ہے۔ اگر آپ بے خوف ہو جائیں تو آپ بہادر ہو جائیں گے اور دنیا بہادروں کے قدموں میں ہوتی ہے۔

آپ کا دوست
طاہر مسعود

حمد باری تعالیٰ

ضیاء الحسن ضیاء

چاند تاروں کو چمک دی تونے
گلستانوں کو مہک دی تونے
اپنے بندوں کو زباں بخشی ہے
اور پرندوں کو چہک دی تونے
تازگی باغِ جہاں کو بخشی!
سبزہ و گُل کو لہک دی تونے
دل سے جو تیرے ہوئے ہیں مولا
غیب سے ان کو کمک دی تونے
میرے دل کو بھی ضیا دے یارب
جیسے جگنو کو دمک دی تونے

وہ خوفناک دن

ڈاکٹر حافظ احسان الحق

جی ہاں۔ وہ واقعی بہت خوفناک دن ہوگا۔ اس دن زمین پوری قوت سے ہلادی جائے گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں گے، زبردست صور پھونکا جائے گا جس کے بعد سارے انسان قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور سب کے نامۂ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے۔ یہ دن قیامت کا ہوگا۔ یہ بڑا خوفناک دن ہوگا۔ اس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ نہ باپ بیٹے کے اور نہ بیٹا باپ کے۔ سب کو اپنی اپنی فکر ہوگی بلکہ باپ کو جہنم میں پھینکا جارہا ہوگا تو وہ التجا کرے گا کہ اس کے بدلے اس کے بیٹے کو یا بیوی کو یا سارے انسانوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے لیکن اسے چھوڑ دیا جائے، معاف کردیا جائے۔ لیکن وہ دن عدل کا ہوگا، کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔

اس دن کیا کچھ ہوگا۔ قرآن حکیم میں جابجا اس کی منظر کشی کی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کمال یہ ہے کہ جہنم کے منظر کو بعض مقامات پر تفصیل سے اور بعض جگہوں پر نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے مثلاً جہنم کتنی وسیع و عریض ہوگی، اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے لگائیے :

"اس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟"

(ق آیت نمبر ۳۰)

گویا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر قیامت تک جب سارے سرکش اور نافرمان لوگ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کی تعداد اربوں اور کھربوں میں ہوگی، تب بھی جہنم کا پیٹ نہیں بھرے گا اور وہ جواب میں کہے گی کہ کیا ابھی کچھ اور مجرم باقی رہ

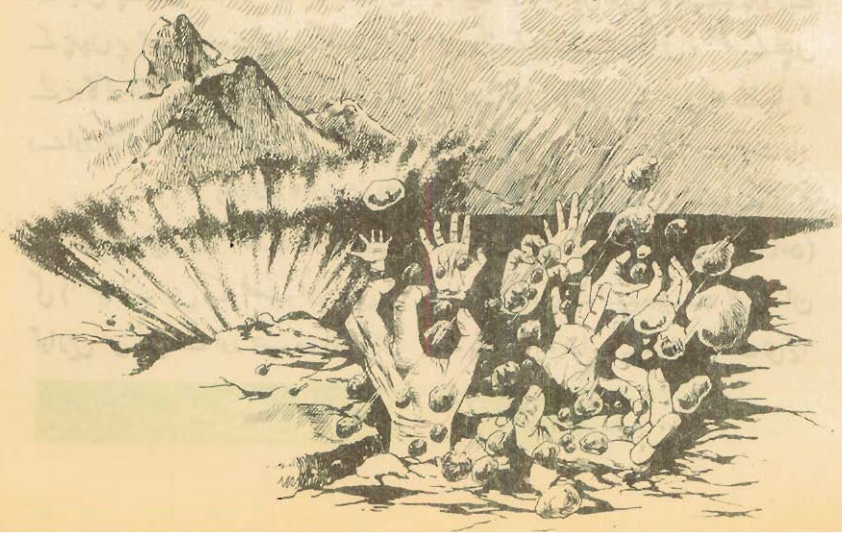

گئے ہیں؟

آیئے جہنم کے تفصیلی مناظر دیکھتے ہیں۔

یہ جہنم جس کی وعید شیطان کے پیروکاروں کے لئے ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کردیا گیا ہے۔ (الحجر آیت ۴۳۔۴۴)

اور اس دن ہر دشمنِ حق ظالم و متکبر منہ کی کھائے گا۔ پھر اس کے بعد اس کے لئے جہنم ہے وہاں اسے کچے لہو جیسا پانی پینے کو دیا جائے گا۔ جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کرے گا۔ اور وہ مشکل ہی سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور مزید ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا۔ (ابراہیم آیت ۱۶۔۱۷)

اس دن تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ تار کول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جارہے ہوں گے۔ یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ دے اور اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ (ابراہیم ۴۹۔۵۰۔۵۱)

اور جب قیامت کو جھٹلانے والوں کو دیکھے گی (جہنم) تو یہ اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے اور جب وہ ہاتھ پاؤں بندھے تنگ جگہوں میں ٹھونسے جائیں گے تو اس وقت وہ موت کو پکاریں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا۔ آج ایک موت نہیں بہت سی موتوں کو پکارو۔ (فرقان۔ آیت ۱۱۔۱۴)

بولو یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لئے فتنہ بنا دیا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے نکلتا ہے۔ اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔ پھر اس پر پینے کے لئے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑ چلے۔ (الصافات ۶۲ تا ۷۰)

زقوم کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا۔ تیل کی تلچھٹ جیسا' پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ پکڑو اسے اور رگڑتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب' چکھ اس کا مزا' بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔ (الدخان ۴۳ تا ۵۰)

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا۔ ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔ اور وہ بہت ہی بُرا

ٹھکانہ ہے۔ جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دھاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے اور وہ جوش کھا رہی ہوگی۔ شدت غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا۔ اس کے کارندے ان لوگوں سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا وہ جواب دیں گے ہاں خبردار کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اس کو جھٹلادیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا۔ تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو اور وہ کہیں گے "کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔

(الملک ۶ تا ۱۰)

درحقیقت جہنم ایک گھات ہے۔ سرکشوں کا ٹھکانہ، جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے اس کے اندر کسی ٹھنڈک اور پینے کے قابل کسی چیز کا مزہ وہ نہ چکھیں گے، کچھ ملے گا تو بس گرم پانی اور زخموں کا دھوون، ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ۔

(النبا ۲۰۔۲۶)

کچھ چہرے اس روز خوفزدہ ہونگے، سخت مشقت کررہے ہوں گے، تھکے ہوں گے۔ شدید آگ میں جھلس رہے ہوں گے۔ کھولتے ہوئے چشمے کا پانی انہیں پینے کو دیا جائے گا۔ خار دار سوکھی گھاس کے سوا کوئی کھانا ان کے لئے نہ ہوگا جو نہ موٹا کرے، نہ بھوک مٹائے۔

(الغاشیہ ۳ تا ۷)

جہنم کی ہولناکیوں کے یہ چند مناظر تھے جو ہم نے قرآن حکیم سے منتخب کئے۔ جہنم کی یہ سزا نہ ختم ہونے والی سزا ہے۔ جیساکہ سورہ نساء میں ہے کہ جب جہنمیوں کی کھالیں پک کر گل جائیں گی تو انہیں دوسری کھالیں دے دی جائیں گی تاکہ عذاب کا تسلسل جاری رہے..... جہنم کی یہ اتنی سخت سزا ان لوگوں کے لئے ہے جو دنیا کی زندگی میں ظلم و معصیت میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ رہے چھوٹے موٹے گناہ اور لغزشیں تو وہ اللہ معاف فرمانے والے ہیں کیوں کہ وہ غفور رحیم ہیں۔ اس طرح جو لوگ اطاعت کی سختیاں جھیلتے ہیں اور اللہ پر ایمان کے ساتھ نیکی کے راستہ پر قائم رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ جنت کا منظر قرآن حکیم میں اتنا ہی حسین و جمیل ہے جتنا کہ جہنم کا منظر ہولناک ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے عمل کی توفیق دے کہ ہم اس کی جنت کے اہل ٹھہریں اور ایسے کاموں سے بچنے کی توفیق دے جس سے ہم جہنم کا ایندھن بنیں، آمین۔

ظُلم اور دہشت کے خلاف ایک احتجاج

آنکھ مچولی کا

خصُوصی شمارہ

مقتول بچّے نمبر

ایک خصُوصی دستاویز

فروری ۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

وہ پھول سے کومل بچّے
جو گلی کوچوں میں بے گناہ قتل کر دیے گئے
اسکول جانے والے بچّے
جو اسکول سے لوٹ کر گھر نہیں آئے
تاوان وصول کرنے کے لیے اغوا کئے جانے والے بچّے
جن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا
اور وہ تمام بچّے
جو کسی نہ کسی ظلم اور دہشت کا شکار ہو گئے
ان بچّوں کے بارے میں آنکھ مچولی میں
جیتے جاگتے فیچر، جیتی جاگتی تصویریں، الم ناک کہانیاں، اداس کر دینے والی نظمیں، مظلوم والدین کے انٹرویوز

آپ بھی لکھئے

اگر آپ کے شہر یا محلّے میں ایسے کسی بچّے کا اغوا یا قتل ہوا ہو تو معلومات جمع کیجئے اور مضمون یا فیچر تحریر کیجئے۔
یہ ایک قومی خدمت بھی ہوگی اور تحریر کار معاوضہ بھی ملے گا۔

مضامین بھیجنے کا پتہ: مدیرِ اعزازی ماہ نامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

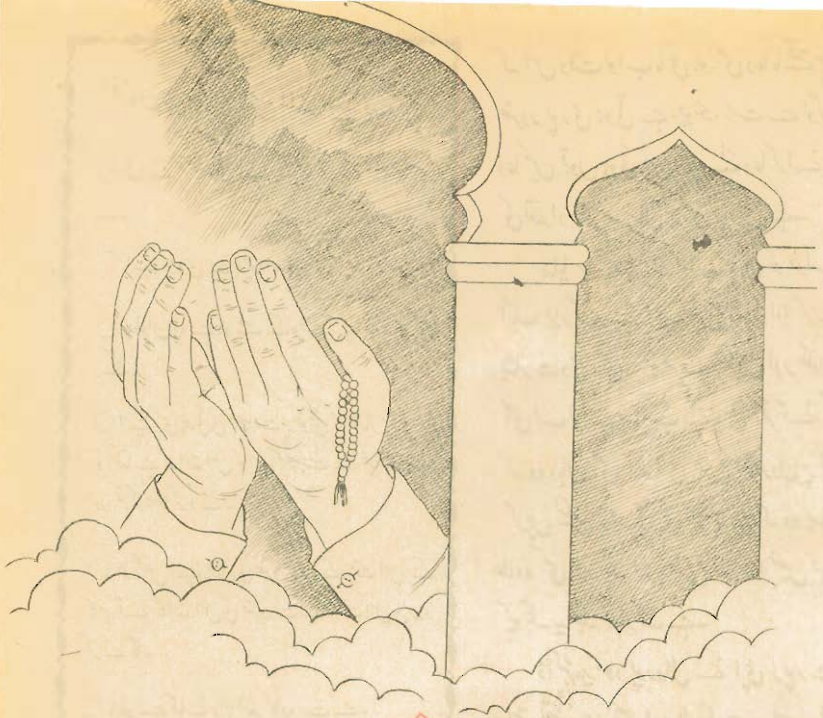

انگاروں پر نماز

رسد: ڈاکٹر پرمود پوروال

لکھنؤ کی مالکی اسٹریٹ کے نزدیک ایک درگاہ ہے۔ ہر سال اس درگاہ پر ہزاروں افراد کا مجمع لگتا ہے..... ایک عجیب وغریب واقعہ دیکھنے کے لئے .....ایک صاحب ہیں نواب سید زین جو نواب مالکی کے نام سے مشہور ہیں' اس درگاہ پر دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں پر جاء نماز بچھا کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں' اس واقعہ کی تفصیلات رسالہ آنکھ مچولی کو لکھنؤ سے ڈاکٹر پرمود پوروال نے ارسال کی ہیں۔ ڈاکٹر پرمود لکھتے ہیں کہ انگاروں پر نماز کی ادائیگی کا منظر دیکھنے کے لئے سابق وزراءٔ اعلیٰ پولیس افسران' سیاست داں حضرات اور اسمبلی کے نمائندے بھی موجود تھے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ٹھیک دس بجے شب اکیاون سالہ نواب مالکی سیاہ لباس پہنے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

○ خدا نے تم پر ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی حرام کی ہے۔

○ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرو۔

○ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔

○ اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو اس مصیبت سے نجات دے اور تم کو مبتلا کر دے۔

○ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کے وقت اس کے کام آئے گا اللہ اس کی ضرورت کے وقت اس کی مدد کرے گا۔

○ ہاتھ سے کمانے والا اللہ کا دوست ہے۔

○ جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔ یہ بات تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لئے برکت کے باعث ہوگی۔

مرسلہ: حفیظ اللہ طارق، کمالیہ

کھجور کا مصلا (جاء نماز) لئے ننگے پاؤں درگاہ کے حجرے سے باہر نکلے۔ زائرین نے نعرہ تکبیر کہا اور پھر نواب مالکی نے انگاروں پر مصلا بچھا کر بڑے سکون سے نماز ادا کرنی شروع کر دی۔ انہوں نے پورے سات منٹ ۶ سیکنڈ تک نماز پڑھی اور پھر سب کے لئے انہوں نے دعا کی۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ اس وقت نواب مالکی جو بھی دعا مانگتے ہیں، وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ چونکہ بہت سے لوگوں کی دعائیں قبول ہوئی ہیں اسی لئے دعا کرانے والوں کی تعداد سال بہ سال بڑھتی جا رہی ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ نواب مالکی کو خواب میں ایک بزرگ نے اس طرح نماز ادا کرنے کی بشارت دی تھی۔ دوسرے شہروں اور ملکوں سے بھی اب نواب صاحب کے پاس آفر آنے لگی ہے کہ وہ وہاں بھی آکر اسی طرح انگاروں پر نماز ادا کریں لیکن نواب مالکی کا کہنا ہے کہ وہ یہاں کے علاوہ کسی اور جگہ اس طرح نماز ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ جگہ مبارک ہے۔

ڈاکٹر پرمود پوروال نے اپنی رپورٹ کے ساتھ تصویریں بھی ارسال کی ہیں۔ اس لئے اس رپورٹ پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا میں اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں نماز اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ اسے انگاروں پر ادا کیا جائے یا مسجد کے صحن میں..... اصل میں دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ نماز کتنے خلوص سے پڑھی گئی ہے۔ اس قسم کے کرتب سے آدمی کو گمراہ نہیں ہونا چاہئے اور نماز کو کھیل تماشا بنانا تو ویسے بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

LASER DOT

THINNER

BLACK

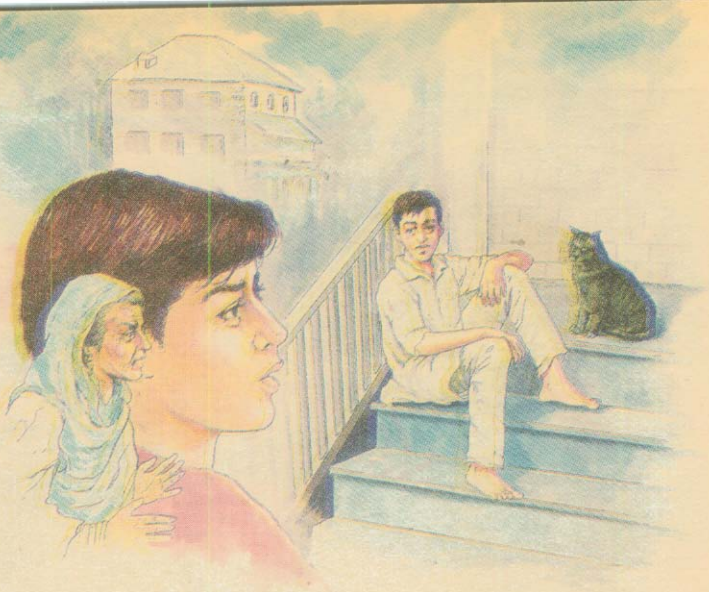

حویلی

فصیح باری خان

جب ہوائیں دف بجاتی اتراتی گزرتی ہیں تب میں کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا ہوں

رات کا کاجل گہرا ہوتا جاتا ہے۔ تب دھیرے دھیرے کسی کے قدموں کی آہٹ اس قدیم حویلی میں گونجنے لگتی ہے۔ اب مجھے بالکل بھی ڈر نہیں لگتا۔ پہلے لگا کرتا تھا کسی زمانے میں..... اب تو وہ زمانے بھی گزر گئے ہیں۔ میرے پُرکھوں کی بنائی ہوئی یہ حویلی چار صدیاں گزار چکی ہے۔ اس کا جسم شکستہ ہو گیا ہے لیکن اس کا رعب و دبدبہ اب بھی قائم ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ اپنے پاس آنے والوں کو اپنے جاہ و جلال سے ڈرانا چاہتی ہے۔ آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ میں بھی کتنا پاگل ہوں، عمارتوں کو انسانوں کی طرح پرکھ رہا ہوں مگر آپ جب کبھی تنہا ہوں تو ان بڑے بڑے مکانوں کے بھید جاننے کی کوشش کیجیے گا۔ سچ کہتا ہوں آپ ڈر جائیں گے۔

بہت ڈر جائیں گے۔

میں آج تک وہ ہاتھ نہیں دیکھ پایا جو یہ خوبصورت دھن چھیڑتے ہیں اور یہ سیاہ بلی جو آپ کو پوری حویلی میں چکر کاٹتی نظر آتی ہے یہ عماد کی بلی ہے۔ عماد میرا دوست ہے.....

"تم سو کیوں نہیں جاتے بدبخت لڑکے ....." میری دادی وقار النساء اپنے اندھیرے کمرے سے نکل کر ٹیرس کی طرف آجاتی ہیں۔

"تمہارے چہرے پر داڑھی مونچھ آرہی ہے مگر تم ابھی تک بچے بنے پھرتے ہو۔ ہر وہ کام کرتے ہو جس سے میں تمہیں منع کرتی ہوں....." دادی کا جھریوں میں ڈوبا ہوا چہرہ پورے چاند کی روشنی میں کتنا پر اسرار نظر آتا ہے۔

"میں نے کہا ہے تم سے .....سنتے نہیں ہو..... مجھے زیادہ تنگ کیا تو میں تمہیں حویلی کے آخری کمرے میں پھینک دوں گی۔"

میں جو بڑا بہادر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اس دھمکی پر سیدھا اپنے کمرے کی طرف دوڑ جاتا ہوں اور پلنگ پر اوندھے منہ گر کر زور زور سے ہانپنے لگتا ہوں۔

"آخری کمرہ ....." میں خوف سے آنکھیں میچ لیتا ہوں

کچھ دیر کے لئے اگر میری آنکھ لگ جائے تو کوئی میرے دماغ پر ٹھوکریں مار مار کر مجھے جگا دیتا ہے.... گھڑی دو بجنے کا اشارہ کرتی ہے اور اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے مجھے اپنی دادی وقار النساء پوری حویلی میں ٹہلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی سفید ساڑھی کا رنگ شمعدان کی روشنی میں نیلا محسوس ہوتا ہے وہ ایک ایک قدم ہوشیاری سے چلتی ہوئی آخری کمرے تک جاتی ہیں اور دروازہ بند کرلیتی ہیں۔

میں جب خوف سے نیلا پڑنے لگتا ہوں تب مجھ سے کچھ پرے عماد آکر بیٹھ جاتا ہے اس کی گود میں وہی سیاہ بلی ہوتی ہے جو ساری رات بلا سبب حویلی میں گھومتی رہتی ہے۔ میں عماد کے ساتھ کھیلنے لگتا ہوں ہم زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ ہنستے ہیں' روتے ہیں' لڑتے ہیں گاتے ہیں اور جب میں ہنس ہنس کر بے حال ہو رہا ہوتا ہوں تب دادی کی غصے سے گھورتی ہوئی قہر زدہ آنکھیں مجھے واپس ہوش میں لے آتی ہیں۔

"تم دیوانے ہوگئے ہو لڑکے .... کس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اکیلے .... تمہارا باپ بھی ایسی ہی حرکتیں کیا کرتا تھا۔ اسے بھی رات کے اندھیرے سے پیار تھا۔ اس کا بھی ایک دوست تھا عماد جس کی سیاہ بلی کے منہ کو میں نے اینٹ سے کچل دیا تھا۔ اس کا چہرہ مسخ ہوگیا تھا مگر اس کی وہ لال انگارہ گھورتی ہوئی آنکھیں زندہ تھیں..... وہ

آنکھیں اب بھی مجھے گھورتی ہیں ... تمہارے پاس بھی عماد آتا ہے ناں..... بولو.....بتاؤ؟"

دادی وحشت سے میری طرف دیکھتی ہیں۔

میں اثبات میں سرہلا دیتا ہوں

دادی تھوڑی دیر سانس لینے کے لئے ٹھہرتی ہیں۔ پھر کہتی ہیں۔ "وہ بہت اچھا پیانو بجاتا تھا....

"کون.... میں چونکتا ہوں۔

"عماد....."

"میرا دوست....؟"

دادی مجھے جھڑک کر کہتی ہیں۔ "بے وقوف لڑکے عماد تمہارا نہیں تمہارے باپ کا دوست ہے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں کل عماد نے کہا تھا کہ وہ میرا دوست ہے۔"

"وہ کسی کا دوست نہیں وہ تو ایک بددعا ہے....."

ہمارے درمیان ایک خاموش وقفہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ تب پیانو پر خود بخود وہ پیاری سی دھن بجنے لگتی ہے .... دادی فوراً" پیانو کی طرف لپکتی ہیں ادھر اُدھر اوپر نیچے جھانک کر دیکھتی ہیں۔ پھر مایوسی سے صوفے پر گر جاتی ہیں ..... ان کی آنکھیں خلاؤں میں کچھ ٹٹولنے لگتی ہیں۔

میں دادی کے قدموں میں بیٹھ جاتا ہوں پھر بڑی راز داری سے کہتا ہوں "عماد کہتا ہے آپ نے اسے آخری کمرے میں پھینک دیا تھا اور....."

"چپ ہو جاؤ اور دفع ہو جاؤ ...." دادی مجھے پوری طاقت سے دھکا دیتی ہیں۔ میں دور جا کر گرتا ہوں پھر دھیرے دھیرے سسکنے لگتا ہوں۔

دادی چیختی ہیں "کون مرگیا ہے تمہارا.. کیوں ماتم کر رہے ہو....؟ اس گھر میں کبھی روشنی نہیں ہوتی جہاں رات گئے رونا پیٹنا مچایا جاتا ہے"۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس جاتی ہیں اور گراموفون پر جانے کن وقتوں کا پرانا سا گیت لگا دیتی ہیں۔ گیت کی لے پر وہ دھیرے دھیرے پُرسکون ہو جاتی ہیں اور پھر ان کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔

میں اپنے کمرے کی طرف بھاگتا ہوں جہاں عماد میرا منتظر ہوتا ہے۔ میں اس کی پالتو بلی کو اپنی گود میں بٹھا کر خوب پیار کرتا ہوں۔

اور پھر عماد اور میں ڈھیر ساری باتیں کرنے لگتے ہیں۔

"عماد کچھ نیا بتاؤ.... دادی کہتی ہیں تم میرے نہیں بلکہ میرے باپ کے دوست ہو ... عماد دھیرے سے مسکراتا ہے "تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ دوست تو بس دوست ہوتا ہے .... ویسے تمہارا باپ ہو بہو تمہارے ہی جیسا تھا۔ اتنا ہی سادہ مزاج اتنا ہی کم گو اور...."

"تم بابا کے دوست کیسے ہو سکتے ہو....؟ تم تو

میرے ہم عمر ہو..... مذاق مت کرو عماد....."

"یہ مذاق نہیں ہے..... تم یہ سمجھ لو کہ میں وقت کے لمحوں کا قیدی ہوں....."

"کیا مطلب.....؟"

"میں ایک پل میں قید ہوں.....؟"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں .... بچے ہو بچوں جیسی ہی باتیں کیا کرو۔"

وہ اداسی سے مسکراتا ہے "کبھی فرصت سے بتاؤں گا..... ارے یہ ریشم کی بچی کہاں گئی..... بڑی ہی نٹ کھٹ ہے جہاں موقع ملا نظر سے اوجھل .... وہ اپنی چہیتی بلی کو آوازیں دیتا ہوا میرے کمرے کی طرف آتی ہوئی دادی کے پاس سے گزر جاتا ہے مگر دادی کو شاید احساس بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔

"تم سوئے نہیں..... ساری ساری رات تم جاگتے رہتے ہو..... ذرا اپنی شکل کی طرف دیکھو جاگ جاگ کر کیسی پھٹکار برسنے لگی ہے تمہاری شکل پر....."

"عماد کہتا ہے وہ مجھے سب کچھ بتادے گا....."

"تمہارا دماغ تو درست ہے.....؟" دادی بڑی حیرت سے میری طرف دیکھتی ہیں۔ پھر میرے نزدیک آکر آہستگی سے کہتی ہیں "کیا عماد واقعی تم سے ملنے آتا ہے.....؟"

"ملنے آتا ہے؟..... وہ تو یہیں رہتا ہے دادی۔"

دادی ایک بڑی سی ٹھنڈی سانس بھرتی ہیں "اس خاندان میں پاگل پن ورثے میں چلا آرہا ہے۔ تمہارے دادا اور باپ نے بھی اس پاگل پن کے ہاتھوں جان دی تھی اور اب تم....."

"میں پاگل نہیں ہوں....." میں خوفزدہ ہو کر دادی کی طرف دیکھتا ہوں۔

"تم پاگل ہو چکے ہو .... تمہیں عماد کے بارے میں کس نے بتایا تھا... سچ سچ بتاؤ.... کہیں اس بڈھے مکروہ شکل ماشکی نے تو نہیں.....؟"

"نہیں....."

"خادماؤں میں سے کسی نے.....؟"

"نہیں....."

"تو پھر کس نے بتایا ہے تمہیں عماد کا...؟" وہ مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتی ہیں۔

"کسی نے نہیں.... کسی نے نہیں..... کسی نے نہیں....." میں زور زور سے سسکنے لگتا ہوں دادی بلند آواز میں چیختی ہیں "تم پر خدا کی مار... مرجاؤ .... کچھ کھا کر سو رہو پر میری جان تو چھوڑو....."

پیانو کی آواز ابھرتی ہے۔

دادی پھٹی ہوئی آواز میں اپنے پھیپھڑوں کی تمام زور لگا کر چیختی ہیں "سامنے آؤ.... ہمت ہے تو سامنے آؤ ڈرپوک چوہے.... میں وقار النسا

بیگم ہوں جس کے رعب و دبدبے سے ایک عالم کانپتا تھا ....." وہ "تھا" پر آکر رک سی جاتی ہیں۔ ان کا چہرہ افسردہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ میری طرف مڑتی ہیں "اس حویلی میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا.... اور اب تم ہو جو مجھ سے جی بھر کر گستاخی کرتے ہو۔ مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش رہتے ہو اور جی ہی جی میں سوچتے ہو کہ یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تمہارا کیا بگاڑے گا .... بولو یہی سوچتے ہو ناں .. جواب دو .... میں تمہیں بھی آخری کمرے میں پھینک آؤں گی اور پھر تم بھی ایک مردہ وجود بن جاؤ گے ....." وہ سفاکی سے میری طرف دیکھتی ہیں اور پھر اندر چلی جاتی ہیں۔

"تم رو رہے ہو ....." دادی کے جانے کے بعد عماد بڑے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔

"میں تھک چکا ہوں عماد .... ایک ہی منظر دیکھتے ہوئے..... کتنے سالوں سے میری زندگی اسی ترتیب سے گزر رہی ہے .... میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ بابا کی موت کے بعد سے میں نے ان کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ دادی مجھے ان سے ملنے بھی نہیں دیتیں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں عماد مجھے ماں کے پیار کا ذائقہ چکھے بغیر....."

عماد گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔

"تم کون ہو عماد آج سچ سچ بتا دو....."

عماد چونک کر میری طرف دیکھتا ہے۔ "تم کیوں جاننا چاہتے ہو.....؟"

"آج میں ساری گتھیاں سلجھانا چاہتا ہوں....."

"سنو گے .... سن سکو گے .... ہمت ہے تم میں....؟ مجھے مرے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں..... اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں میرا بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں تھوک نگلتے ہوئے بولا" میں جانتا ہوں....."

"تو پھر اتنا گھبرا کیوں رہے ہو.....؟"

"آج تمہارے اپنے منہ سے جو سن رہا ہوں میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو پتھر بنی ہوئی تھیں۔

"سب اگر بہت اچھا نہیں تھا تو اتنا برا بھی نہیں تھا..... تم سن رہے ہو ناں.....؟"

"ہاں....."

"دیکھو ڈرنا مت... موت کا زہر چکھنے والے تو یوں بھی بڑے بے چارے ہوتے ہیں.... ادھر اس بڑے کمرے میں وہ پیانو تھا' جسے اب بڑی بیگم نے اس چھوٹے کمرے میں ڈال دیا ہے... ارے میں بھول ہی گیا پہلے اپنا تعارف تو کروا دوں

..... میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا تھا۔ میرا باپ جب چلنے پھرنے سے مکمل معذور ہو گیا تو میری ماں مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی آ گئی۔ اب تو یہ حویلی کچھ بھی نہیں رہی۔ تم اسے پہلے دیکھتے اس کے گلابی پتھروں کی روشنی راتیں منور کر دیتی تھی..... تم ذرا میرے ساتھ آؤ....." میں اس کے ساتھ چلتا ہوا بڑے کمرے تک آ گیا ... وہ میرا حویلی میں پہلا دن تھا.....

--- ○ ---

"تمہارا نام کیا ہے..... جھولے پر بیٹھی ہوئی وہ خوبصورت عورت کبوتر کے پروں کو چوم کر بولی۔

"جی عماد....."

"بڑی بیگم میرا بیٹا بہت محنتی ہے ..... دس آدمیوں کا کام یہ اکیلے کر لیتا ہے اور بیگم نہ تو آپ اس کی زبان سے سنیں گی ہی نہیں..... میری ماں بڑھ چڑھ کر میری صفات گنوا رہی تھی۔

"کیا اس کی صحت اسے کام کرنے کی اجازت دے گی.....؟" وہ تمسخر سے بولی۔

"بڑی بیگم میرا بیٹا کمزور نظر آتا ہے مگر ہے بہت پھرتیلا....."

وقار النساء بات کاٹ کر بولی "کتنا بولتی ہو تم ..... لڑکے اس غلیظ بلی کو آئندہ حویلی کے اندر مت لانا..... میں نے جھٹ اپنی ریشم کو سینے سے لگا لیا۔ "تو آپ اسے رکھ رہی ہیں بڑی بیگم.....؟"

میری ماں نے کریدا۔

"ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... تم دونوں باہر بیٹھو....."

صبح سے شام تک ہم حویلی کے بڑے دروازے پر بیٹھے رہے۔ رات کو بلاوا آیا اور پھر ہم دونوں اس چھوٹی سی کوٹھری میں چلے گئے کہ جو ہمیں رہنے کے لئے دی گئی تھی۔

ماں مجھے ڈانٹ کر بولی "تمہیں بیگم کے سامنے سر جھکا کر بات کرنی چاہئے تھی....."

"کیوں.....؟"

"کیوں ..... آئندہ کوئی سوال کیا تو تیرا منہ کچل دوں گی ..... مالک کے قدموں میں سر جھکانا ہی خادموں کا فرض ہے....."

"اماں کیا ہم اتنے حقیر ہیں.....؟"

"مت کیا کر ایسی الٹی سیدھی باتیں ..... گھوش بابو نے تجھے جانے کیا کیا الٹی سیدھی کتابیں پڑھا دی ہیں۔ سارا وقت بکواس کرتا رہتا ہے....."

"اماں تم گھوش بابو کو کچھ مت کہا کرو....."

اماں چمک کر بولی "کیوں نہ کہوں اس نے ہی تیرا دماغ خراب کیا ہے ..... اور ہاں کل گندی بلی کو باہر چھوڑ آنا۔ بیگم ناحق غصہ ہوں گی۔"

اماں تو تھوڑی دیر بعد سو گئی مگر میں گھوش بابو کو یاد کرتا رہا۔ گھوش بابو ہمارے گاؤں کا سب سے

بڈھا شخص تھا اس کے باوجود وہ سب سے زیادہ تن کر چلتا تھا۔ روزانہ صبح وہ پورے گاؤں کا چکر لگاتا تھا۔ اس کا اپنا کوئی بال بچہ نہیں تھا اس لئے وہ گاؤں کے سارے بچوں پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک دن شروع شروع میں تو میں بھی گھوش بابو کے پاس مٹھائیوں اور ٹافی کے لالچ میں ہی جاتا تھا مگر پھر جب ایک دن میں نے گھوش بابو کو پیانو بجاتے دیکھا تو میں اس کے پیانو کا اسیر ہو کر رہ گیا.... گھوش بابو بڑی محنت سے مجھے پیانو سکھاتا۔ چار چھ مہینے میں اس نے مجھے پیانو بجانے کا ماہر بنادیا۔ اب کوئی بھی ایسی مشکل دھن نہیں تھی کہ جو میں پیانو پر نہیں بجاسکتا تھا۔ اس فن کے علاوہ گھوش بابو کے جس دوسرے فن کا میں معترف ہوا وہ اس کی بڑی بڑی اور گہری گہری باتیں تھیں۔ابتدا میں اس کی باتوں کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگتا تھا مگر پھر مجھے سب کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ گھوش بابو کا مذہب انسانیت تھا کہ جس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب کا کوئی فرق نہیں تھا۔ انہیں باتوں نے مجھے جتا دیا تھا کہ ایک بار جھکنے والے کا سر ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔

صبح پانچ بجے ہی اماں نے مجھے جگادیا۔ حویلی کے ملازموں کی بھیڑ ایک جگہ جمع ہو کر مجھے میرے کام سے آگاہ کرنے لگی۔ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے کہ جو اپنا کام بھی میرے ذمے لگا رہے تھے۔ حویلی کا کام بھگتاتے بھگتاتے رات ہوگئی۔ میں تھک ہار کر اپنی کوٹھری کی طرف جارہا تھا کہ پیانو کی آواز نے میرے قدم روک لیئے کوئی نہایت اناڑی پن سے اسے بجانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں سحر زدہ حالت میں چلتا ہوا بڑے کمرے تک آگیا۔ پیانو کو میری ہی عمر کا ایک لڑکا بجارہا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ بڑی بیگم کا بیٹا ہے۔ میں بھی جانے کس دھن میں تھا کہ اس کے مرتبے اور حیثیت کا لحاظ کئے بغیر اس کے سامنے کھڑا ہوگیا اور پھر اس کے ہاتھ پیانو سے ہٹا کر آنکھیں بند کئے اپنی دھن میں پیانو بجانے لگا۔ جانے میں کتنی دیر پیانو بجاتا رہا اور جب میں رکا تو وہ لڑکا زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔

وہ میرے ہاتھ پکڑ کر بولا "تمہاری انگلیوں میں تو جادو ہے.... کیا نام ہے تمہارا.....؟"

"عماد.... اور آپ.....؟"

"یوسف..... حویلی میں کب آئے.....؟"

"چلو اچھا وقت گزرے گا ..... میں بھی چھٹیوں میں آیا ہوں....."

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہیں.....؟"

"میٹرک کا امتحان دوں گا اس سال ..... میرا اسکول دوسرے شہر میں ہے..... میرے ساتھ آؤ میں تمہیں اپنا کمرہ دکھاتا ہوں.... تم روز میرے پاس آنا میں تم سے پیانو بجانا سیکھوں گا۔"

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آگیا۔ اتنا خوبصورت سجا ہوا کمرہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں..... شمعدان کی روشنی میں ہر شے کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔

"کیسا ہے میرا کمرہ.....؟"

"اچھا..... بلکہ بہت اچھا....." میں رک رک کر لفظوں کو کھینچ کر بولا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو....." وہ افسردگی سے بولا

"کیا.....؟"

"یہی کہ خوشی قیمتی چیزوں سے بھرے کمرے کا نام ہے....." مجھے پہلی بار اس کے لہجے میں گھوش بابو والی گہرائی نظر آئی۔

"آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو اتنی خوبصورت زندگی حاصل ہے....."

"اور اگر میں کہوں کہ یہ زندگی بدصورت ہے تو.....؟"

"میں سمجھوں گا کہ آپ ناشکرا پن کر رہے ہیں....."

"سنو! اس کمرے میں روزانہ رات کو آفندی بھی آتا ہے....." اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"آفندی..... کون آفندی...؟"

وہ میرے باپ کا دوست تھا مگر اب میرا بن گیا ہے.....۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں.....؟" میں اس کی باتوں میں الجھ سا گیا تھا۔

"کسی دن تمہیں رات کو ملواؤں گا اس سے ..... اس کا سیاہ کتا تو پوری رات حویلی میں گھومتا رہتا ہے..... وہ کتا مر چکا تھا مگر اب زندہ ہے..... سنو تم نے کبھی کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہو.....؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پر میں نے دیکھا ہے۔..... میں روز آفندی کو دیکھتا ہوں مگر میں ڈرتا نہیں ہوں..... مجھے ذرہ برابر بھی ڈر نہیں لگتا..... میری دادی نے آفندی کی گردن مروڑ کر اسے آخری کمرے میں پھینک دیا تھا۔ آفندی نے مجھے خود بتایا ہے .... میری دادی بڑی ظالم عورت تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میرے بابا ایک ادنیٰ ملازم سے اپنے راہ و رسم بڑھائیں ..... شروع میں انہوں نے سختی سے روکا۔ مگر بابا نہیں مانے..... پھر دادی نے آفندی کے چہیتے کتے کو بھاری پتھر مار کر کچل دیا۔ وہ انتقام میں اندھی ہو گئی تھیں ان کا خیال تھا کہ ملازم تو گلی کے آوارہ کتے ہوتے ہیں کہ جن کو لات بھی مارو تو چیاؤں چیاؤں کر کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ ایسی بے غیرت مخلوق کو دوستی کے لائق سمجھنا ناقابلِ معافی جرم ہے کہ جس کی کوئی تلافی نہیں

..... " وہ سانس لینے کے لئے رکتا ہے اس کا چہرہ جذبات سے دہک کے لال انگارہ ہو رہا تھا۔

"سب سمجھتے ہیں کہ میرا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ میں دن بدن پاگل ہوتا جا رہا ہوں میری ماں کا بھی یہی خیال ہے۔ مگر عماد میں پاگل نہیں ہوں..... میں پاگل نہیں ہوں....." وہ رو رہا تھا۔ میں اس کو دھیرے دھیرے سمجھاتا رہا اور پھر وہ میری باتوں سے پُرسکون سا ہو گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور سو گیا۔

اس کے سونے کے بعد میں بڑی آہستگی سے اٹھا اور چپکے سے کمرے سے نکل گیا مبادا کہ اس کی نیند ٹوٹ جائے۔ اس کے کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا بڑے کمرے میں وقار النساء کھڑی ہوئی اس طرف دیکھ رہی تھی کہ جہاں سے نکل کر میں اس کی سمت آ رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو.....؟" وہ کرختگی سے بولی۔

"یوسف صاحب کے ساتھ تھا....." میں اعتماد سے بولا۔

اس نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا پھر زمین پر تھوک کر نفرت سے بولی "اس گندے لباس اور پھٹے ہوئے جوتوں سمیت تم اس کمرے میں گئے .... میرے بیٹے کے کمرے میں .... اس نے تمہیں اپنے بستر پر بٹھایا ہو گا ہے ناں.....؟

"جی....." میری پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"اس کو گھن نہیں آئی تم سے .... تمہارے وجود سے.....؟" وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی یوسف کے کمرے میں گئی۔ پھر بستر کی چادر تکیوں کو اٹھا اٹھا کر جنونی طاقت سے نیچے پھینکنے لگی۔ یوسف آنکھیں ملتا ہوا حیرانی سے باہر آ کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے چیخ کر کسی ملازم کو بلایا اور حقارت سے بولی "ان چیزوں کو جلا کر راکھ کر دو .... اس لئے .... کہ ان پر ایک ناپاک جانور کا وجود بیٹھا تھا....."

"اماں....." یہ آواز یوسف کی تھی "آپ کیا سمجھتی ہیں خود کو .... ایک انسان سے اتنی نفرت اس کی اتنی بڑی بے عزتی.....؟"

"تم خاموش رہو پاگل لڑکے .... نہیں تو میں تمہیں کسی پاگل خانے بھیج دوں گی....."

"تم لے جاؤ یہ سب....." وقار النساء نے ملازم کو ڈانٹا اور وہ تکیے اور چادریں سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ ملازم کے جانے کے بعد وہ میری طرف مڑی "دفع ہو جاؤ۔ ابھی اسی وقت یہاں سے....."

"چلا جاؤں گا....."

"بھوکے ننگے ... غلیظ کتے ...." وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔

"میں بھی آپ کی ہی طرح کا ایک انسان ہوں....."

"ہونہہ انسان..... تم انسان نہیں ہو میں نے کہا ناں کہ تم کتے ہو....."

"کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو..... کیا فرق ہے آپ میں اور مجھ میں.....؟"

"وہی جو ایک کتے اور انسان میں ہوتا ہے....."

"دوسروں کو غلام بناتے بناتے آپ خود غلام بن گئی ہیں..... اپنے غلط رویوں اور گھٹیا برتاؤ کی غلام....."

"تم ایک حقیر انسان.... تم وقار النساء کے منہ لگتے ہو.....!!" وہ نفرت سے ایک ایک قدم چلتی ہوئی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مگر میں ڈر نہیں رہا تھا اس کا سارا رعب و دبدبہ میرے لئے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ لہولہان کر ڈالا۔ میں نے دیکھا یوسف بری طرح چیخ رہا تھا اسے دو تین خدمت گار بڑی سختی سے پکڑے ہوئے تھے۔

"تجھے آج میں بتاتی ہوں....." وہ مجھے گھسیٹتی ہوئی آخری کمرے تک لے آئی..... اور تب جانے کہاں سے ریشم آگئی اور اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کے پیر کو لہولہان کر ڈالا۔ وقار النساء غصے اور درد سے بلبلاتی ہوئی کمرے میں گھسی اور ایک موٹی سی اینٹ نکال کر اسے ریشم کے بدن پر دے مارا۔ ریشم نے بڑی بے چارگی سے میری طرف اک نظر دیکھا اور ٹھنڈی ہوگئی۔

وقار النساء نے مجھے آخری کمرے میں دھکا دیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ جانتے ہو سسک سسک کر مرا ہوں میں..... لیکن مجھے خوشی تھی کہ میں نے اس کے آگے سر نہیں سر جھکایا۔ میں آج تک خوش ہوں....."

وہ خاموش ہوگیا۔

رات شاید بیتنے والی تھی۔ صبح کا قطرہ گرنے ہی والا تھا۔

"تمہارے ساتھ بہت بُرا ہوا عماد....."

"یہ کون سی نئی بات ہے..... کبھی آفندی کبھی عماد..... نام بدل جاتے ہیں مگر ہم.... ہم ہی رہتے ہیں اتنے ہی سستے اور اتنے ہی بکاؤ کہ جس کا جب دل چاہے ہمیں اپنے قدموں تلے روند دے۔ ایسے اَن گنت کردار تم سے ٹکراتے ہی رہیں گے..... تمہارے اپنے آس پاس۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی میرا دل مسل رہا ہو۔ میں زور زور سے رونے لگا۔ مگر آج عماد نے مجھے چپ نہیں کرایا۔ اور جب میرے رونے کی آواز پر دادی حسب عادت چڑچڑاہٹ سے اٹھ کر آئیں تو دروازے پر ہی ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

"عماد..... عماد" ان کا پورا بدن لرزنے لگا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گئیں

"دادی..... دادی..... میں نے انہیں جھنجوڑا مگر ان کے بدن میں ذرہ برابر بھی حرکت نہیں ہوئی وہ مر چکی تھیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا..... عماد کہیں نہیں تھا۔

اور پوری حویلی میں ڈھونڈنے کے بعد بھی مجھے ریشم نہیں ملی۔

حویلی کا سارا طلسم ٹوٹ چکا تھا

اور کچھ ہی دن بعد میں اپنی ماں کے ساتھ اس حویلی سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑ کے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

- دیدہ زیب شادی کارڈز
- بزنس وزیٹنگ کارڈز
- کیلنڈرز
- عید کارڈز
- پروفیشنل پرنٹنگ

ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری پرنٹنگ کے لیے

شاداب پرنٹرز

دھرم داس بلڈنگ (نزد ایس ایم لا کالج) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ کراچی فون نمبر: ۲۱۳۸۴۱

مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

محمد جاوید خالد

تنہائی کے لمحوں میں اکثر
مجھے لگتا تھا کچھ ایسے ڈر
خود اپنے سائے سے ڈر ڈر کر
رہ رہ کے بدک میں جاتا تھا
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

اندھیرا کہیں گر ہوتا تھا
میں خوف کے مارے روتا تھا
اور روشنی ہی میں سوتا تھا
ہر شخص مجھے سمجھاتا تھا
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

کبھی دیکھا خواب ڈراؤنا کہیں
چلّا کے میں اٹھ جاتا تھا وہیں
نیند آئے دوبارہ، نہیں نہیں
خود جاگتا، سب کو جگاتا تھا
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

کشتی میں جو بیٹھا میں اک دن
لہریں تھیں کہ گویا بھوت اور جن
کب ہوش میں رہنا تھا ممکن
بے ہوش میں ہو ہو جاتا تھا
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

اس ڈر اور خوف کے ہاتھوں ہی
اپنا لی جھوٹ کی عادت بھی
اب سوچتا ہوں، کم بختی کی
حد یہ تھی کہ سچ کو چھپاتا تھا
مجھے خوف بہت ہی آتا تھا

امی نے مجھے جو یوں پایا
اک روز بٹھا کر سمجھایا
کیوں تم پر خوف کا ہے سایہ
تم مسلم ہو، کچھ شرم کرو
ایسے تو نہ ہر اک شے سے ڈرو

اللہ پہ جو رکھتے ہیں یقیں
اللہ کو وہ پاتے ہیں قریں
کسی اور سے وہ ڈرتے ہی نہیں
یہ ہے کہ ڈرو نادانی سے
اور رب کی نافرمانی سے

ان باتوں کا ایسا تھا اثر
مرا خوف سبھی، مرا سارا ڈر
سمجھو کہ گئے میرے لئے مر
ہے رب سے مرا اب یوں ناتا
مجھے خوف بالکل نہیں آتا

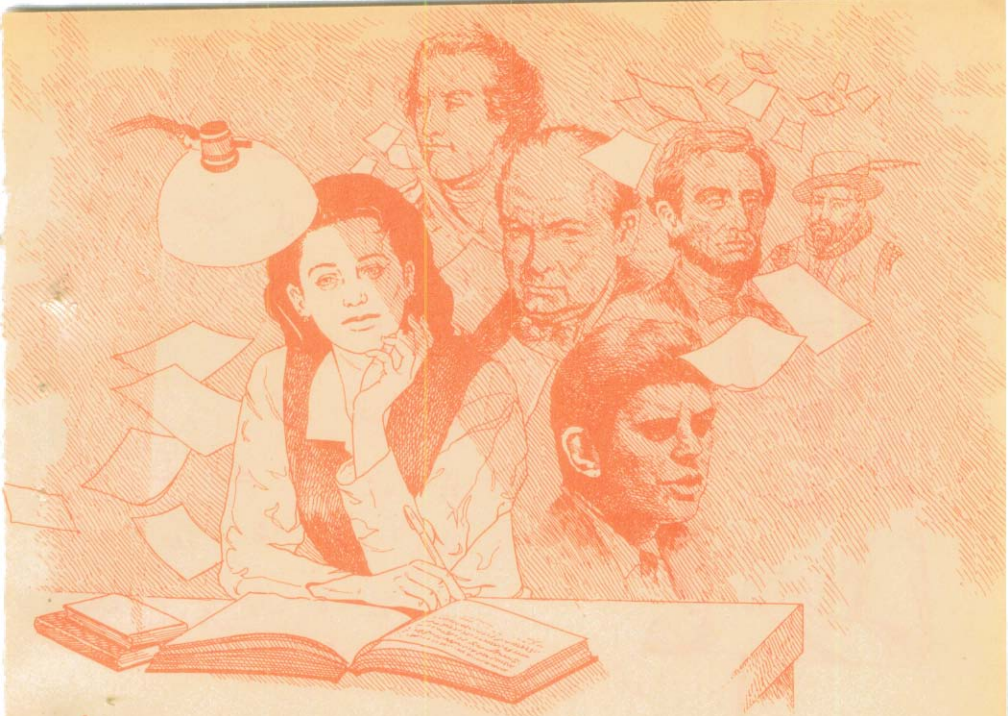

عامر اعجاز

روحوں کی سیکرٹری

وہ مردوں کی تحریریں لکھتی ہے

انگلینڈ کی اسٹیلا ہارکس کا دعویٰ ہے کہ روحیں اس سے رابطہ کرتی ہیں۔ اور یہ روحیں بھی کوئی عام نہیں بلکہ اپنے وقت کے ان مشہور ادیبوں اور شاعروں کی ہیں جو کئی سال قبل اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں اور اب اس کا دعویٰ ہے کہ وہ آنجہانی ادیب اور شاعر اس کے ذریعے اپنی تازہ تخلیقات صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔

اسٹیلا ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہے۔ وہ ہر روز ایک عجیب و غریب شغل کرتی ہے۔ گھنٹوں ایک کرسی پر کاغذ قلم لئے بیٹھی رہتی ہے۔ اس انتظار میں کہ کب کوئی روح اس سے رابطہ کرتی

ہے اور پھر اچانک ہی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کا قلم والا ہاتھ خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے اور قلم کی نوک سے کاغذ پر الفاظ اجاگر ہونے لگتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ اتنی تیز رفتاری سے ہوتا ہے کہ اسٹیلا کے لکھنے کی رفتار ایک منٹ میں دو سو الفاظ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

جو مصنفین اور شعراء حضرات اسٹیلا ہارکس سے رابطہ کرتے ہیں وہ بلاشبہ اپنے دور کی مشہور ترین شخصیات ہیں۔

اسٹیلا کے کہنے کے مطابق ان میں تھامس ہارڈی، ورجینیا وولف، چارلس ڈکنز اور جین آسٹن شامل ہیں۔ مرحوم امریکی صدر جان ایف کینیڈی، فلم اداکار ڈیوو نیون اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان کے علاوہ ہیں۔ ان شخصیات کی تحریریں وہ اپنے قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل کر چکی ہے۔

روحوں کی اس سیکرٹری کے ہاتھ سے لکھی گئی یہ تحریریں حیران کن ہیں۔ ان میں تقریریں بھی ہیں اور ڈائریاں بھی، یادداشتیں بھی ہیں اور کہانیاں بھی، ڈرامے بھی اور ناول بھی۔ اور حیرت انگیز طور پر ہر تحریر ایک الگ ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔ اور یہ تحریریں یقیناً" ایک ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ان کا تعلق ان شخصیات سے ہے جو اب دنیا میں نہیں۔

لیکن اسٹیلا کی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی پبلشر بھی انہیں شائع کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اس بات سے بہت دلبرداشتہ ہے اور کہتی ہے کہ میرا مقصد روپیہ کمانا نہیں میں تو صرف ان مصنفین کی تحریریں ان کے شائقین تک پہنچانا چاہتی ہوں۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ روحوں سے رابطہ کیسے کرتی ہے تو اس نے بتایا کہ اس کا طریقہ سادہ ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ میں روحوں سے رابطہ نہیں کرتی بلکہ وہ مجھ سے رابطہ کرتی ہیں۔ اس کے لئے مجھے اپنے ذہن کو خالی رکھنا پڑتا ہے تاکہ انہیں محسوس کر سکوں۔

وہ کہتی ہے کہ جب کوئی روح اس سے رابطہ کرتی ہے تو وہ اسے پہچان جاتی ہے کیونکہ ہر ادیب کے لکھنے کا انداز جدا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق جین آسٹن کا لکھنے کا انداز، چارلس ڈکنز کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے جبکہ کئی ادیب ایسے بھی ہیں جو بہت دبا کر لکھتے ہیں۔

اسٹیلا یہ بھی اعتراف کرتی ہے کہ ان ادیبوں کی تحریریں لکھنا اتنا آسان بھی نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات وہ مسلسل تین تین گھنٹے تک لکھتے رہتے ہیں ایک دفعہ ڈکنز نے دو دن کے اندر دو سو سے زائد صفحات لکھوائے۔ لیکن کچھ سست رفتار ادیب بھی ہیں مثلاً" جین آسٹن نے اپنا ایک ناول چھ ہفتے میں لکھوایا۔ ان کے علاوہ بھی

اسٹیلا کے پاس ان کے کئی ڈرامے، ناول اور کہانیوں کے ریکارڈ موجود ہیں۔

اسٹیلا ہارکس کے دعویٰ کی تردید اور ان تحریروں کو جھٹلانا ممکن نہیں۔

یہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ موت انسان کا رشتہ اس دنیا سے مکمل طور پر ختم نہیں کرتی اور موت کے بعد بھی انسان کسی نہ کسی ذریعے سے اس دنیا میں موجود رہتا ہے۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انہوں نے اسٹیلا کی لکھی ہوئی تحریروں کا موازنہ، ان ادیبوں کی زندگی کی تحریروں سے کیا ہے اور کہتے ہیں کہ ان کے معیار میں بلاشبہ فرق ہے۔

حقیقت کچھ بھی ہو لیکن ابھی تک اس بات کی وضاحت نہیں کی جا سکی کہ کیسے اسٹیلا کا قلم خود بخود چلنے لگتا ہے اور صفحات بھرنا شروع کر دیتا ہے۔

فیروز خان نون — اور فوجی پتھراؤ

۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ فیروز خان نون ڈیفنس آف انڈیا (DEFENCE OF INDIA) کونسل میں کسی اونچے عہدے پر تھے۔ وہ انگریز بادشاہ کی ہندوستانی مسلح افواج کے دورے پر شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے کی دور افتادہ چھاؤنی رزمک میں گئے جو صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ فیروز خان کے اعزاز میں رزمک کے ٹروپس نے جو کھیل تماشے دکھائے ان میں ایک کھیل یہ تھا کہ دو سپاہی خچروں پر سوار ہو کر ایک دوسرے کو خچروں سے گرانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ کھیل چلتا رہا حتیٰ کہ ایک سکھ اور ایک مسلمان سپاہی مقابلے کے لئے آئے۔ مسلمان نے سکھ سوار کو خچر سے گرا دیا۔ تماشائی سب فوجی تھے۔ میدان کے ارد گرد پہاڑیاں تھیں۔ سکھ سوار گرا تو سکھ رجمنٹ کی طرف سے ایک پتھر آیا جو پنجاب رجمنٹ کے جوانوں میں گرا۔ جیتنے والا مسلمان سپاہی اسی رجمنٹ کا تھا۔ اس رجمنٹ نے پتھر کا جواب تین پتھروں سے دیا۔ سکھ رجمنٹ نے پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ پنجاب رجمنٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ پتھروں کا علاقہ تھا۔ ہوا میں پتھر اولوں کی طرح اڑنے لگے۔ انگریز افسروں کے احکام اور دھمکیاں کسی نے نہ سنیں۔ فیروز خان نون کو بڑی مشکل سے پتھروں کے مینہ میں سے خیریت سے نکال کر لے گئے۔ سکھ رجمنٹ اور پنجاب رجمنٹ میں سنگ باری ہوتی رہی کئی سپاہی زخمی ہوئے۔ دوسرے دن فیروز خان نون رخصت ہو گئے۔ توقع تھی کہ دونوں رجمنٹوں کو اجتماعی سزا ملے گی۔

فوج میں ایسا مظاہرہ سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رجمنٹوں کو دوسرے دن فیروز خان نون کا یہ پیغام سنایا گیا۔ "یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے کہ فوج میں لڑنے کا جذبہ موجود ہے۔ آپ کے اس جذبے کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دشمن کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، آپ اسے شکست دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

PRIZES	QTY.	PRIZES	QTY.
Vacuum Cleaners	02	Philips Sandwich Makers	10
Philips Automatic Irons	10	Philips Electric Shavers (For Men)	05
Philips Toasters	10		
Philips Juicers	05	Philips Hairdryers	10
Philips Citrus Sets	10	Cross Pens	15
Wall Clocks	75	(Ladies) Wrist Watches	25

May 31, 1885
1st Grade
I can run.
See Kitty
See Rover

BATH'S

بھوت نگر

عروبہ منیر

پیارے دوستو!

آپ نے بچپن میں ایسے مکانوں کی داستانیں تو بہت پڑھی ہوں گی جن میں بھوت بسیرا کر لیتے ہیں لیکن آج ہم آپ کو ایک ایسے قصبے کی کہانی سنا رہے ہیں جس کو بھوتوں کا قصبہ کہا جاتا ہے۔

شمالی امریکہ کی ریاست ورجینا میں نوریا نامی شہر کے قریب واقع یہ قصبہ بھوتوں کا قصبہ کیوں مشہور ہو گیا؟ اس بارے میں جس سے پوچھئے وہ نئی داستان سنانے پر تیار نظر آتا ہے۔

قصبے میں گھسیئے تو ہر طرف خوف کا راج نظر آتا ہے۔ گلی کوچے ویران، مکان سنسنان، بازار بے رونق اور مکین سہمے سہمے، جیسے ابھی کوئی بلا شہر پر نازل ہونے والی ہو۔

ہم نے اس اچھے بھلے قصبے کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئے۔ "واقعی یہ تو بھوتوں ہی کا قصبہ ہے!" ہم نے سوچا "لیکن آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ہمیں خیال آیا۔

"کسی سے پوچھنا چاہیئے۔" ہم نے فیصلہ کیا۔ "لیکن کس سے پوچھیں۔ کوئی بتانے والا ہو تب نا۔"

ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک نظر ایک بچی پر پڑی۔ سرخ چمکدار شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس یہ بچی قصبے کے باقی لوگوں سے کم خوفزدہ نظر آتی تھی۔ اس کی نظروں میں تجسس تھا جیسے وہ بھی قصبے کی پراسراریت پر ہماری طرح حیران ہو۔

ہم نے اسے روک ہی لیا۔ "آپ یہیں رہتی ہیں نا اسی بھوتوں کے قصبے میں؟" ہم نے سوال کیا۔ "ہاں۔" وہ ہنسی ..."میں اسی بھوتوں کے قصبے میں پیدا ہوئی ہوں۔" اس نے کہا۔ "پھر تو آپ جانتی ہوں گی کہ اسے بھوتوں کا قصبہ کیوں کہا جاتا ہے؟" ہم نے اگلا سوال داغ دیا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ پھر دوبارہ ہنس پڑی۔ "تو ہمیں بتایئے نا! ہم پاکستان جا کر اپنے دوستوں کو بتائیں گے۔ آپ کے اس قصبے کے بارے میں۔" ہم نے کہا۔

"اچھا یہ بات ہے پھر تو سچ ہی بولنا پڑے گا۔" وہ ذرا سنجیدہ ہو گئی۔

"سچ! کیا مطلب؟" ہمارا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ "یہ کہ اس قصبے کا بھوتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ بس یہ اس نام سے مشہور ہے۔" اس نے بڑے مزے سے کہا۔ "لیکن کیوں؟" ہم نے تیزی سے اگلا سوال کیا۔

"اس کی وجہ ہے۔" اس نے کہا۔ اب ہم

دونوں قصبے کی ویران سڑک کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئے تھے اور وہ قصبے کی کہانی سنا رہی تھی۔

"ہمارا قصبہ بہت چھوٹا سا ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی۔ شروع شروع میں جب میں بہت چھوٹی تھی تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بھوتوں کا قصبہ ہے۔ ذرا بڑی ہوئی تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ڈر بھی لگا۔ میں نے قصبے کا سچ جاننے کے لئے سارا سارا دن ادھر ادھر گھومنا شروع کردیا۔ پرانی پرانی خالی عمارتوں میں، اجڑے ہوئے باغوں میں، پھر میں سوچتی شاید کہیں کوئی بھوت مل جائے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔" وہ ذرا رکی۔

"پھر آپ نے کیا کیا؟" ہم نے پوچھا۔ "پھر میں نے کتابوں کا سہارا لیا اور اپنے قصبے کی تاریخ پڑھی۔" اس نے کہا، "تب میں نے جانا کہ یہ بھوتوں کا قصبہ کیوں مشہور ہوا۔" "کیوں؟" ہمارے پاس تو ایک ہی سوال تھا۔ "بات دراصل یہ تھی کہ بہت عرصے پہلے یہاں سونا دریافت ہوا تھا اور بہت سارے لوگ سونے کی تلاش میں یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ انہوں نے عمارتیں تعمیر کیں۔ دکانیں کھولیں اور باغات بنائے۔ ان کا ارادہ یہاں گھر آباد کرنے کا تھا۔ ہوا یہ کہ سونا جلد ہی ختم ہوگیا۔ قصبے میں روزگار کا، کھانے پینے کا کوئی اور ذریعہ تو تھا نہیں۔ اس لئے لوگ مجبوراً یہاں سے جانے لگے۔ پہلے ایک گیا" پھر دوسرا۔ پھر تو مکانات خالی ہوتے چلے گئے۔ عمارتیں ویران ہونے لگیں، اور اب آپ دیکھ لیں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہاں چند ہی لوگ رہتے ہیں۔ ہماری طرح۔" اس نے اپنا ہیٹ اتار کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"اچھا اب سمجھ میں آیا۔" ہم نے کہا۔ "تو پھر تمہیں یہاں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟" ہم نے ایک سوال اور کردیا۔ "بالکل نہیں۔" اس نے بے پرواہی سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ یہاں کوئی بھوت نہیں۔ پھر بھلا مجھے ڈر کیوں لگے گا؟" اس نے بڑی سمجھ داری سے کہا۔ پھر ہماری طرف دیکھا۔

"آپ میری طرف سے پاکستان کے بچوں کو پیغام دے دیجئے کہ ڈر صرف اسی سے چیز سے لگتا ہے جس کی حقیقت نامعلوم ہو۔ جب حقیقت پتہ چل گئی تو پھر کیا ڈرنا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"کہیں آپ کے ملک میں کوئی ایسا شہر یا قصبہ تو نہیں؟" اس نے سوال کیا۔ "ہمارے ملک میں۔" ہم گھبرا گئے۔ "نہیں وہاں ایسا کوئی قصبہ نہیں۔" ہم نے سوچ سوچ کر کہا۔ شاید اس لئے کہ ہمیں اپنی بات پر یقین نہیں تھا۔ آپ کو تو ہماری بات پر یقین ہے نا....

ایک سچا خوفناک واقعہ

موت کا کھیل

شیخ عاکف حمید

سب میلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ فورٹ ریس اسٹیڈیم میں ہزاروں لوگ میلہ مویشیاں دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران لاؤڈ اسپیکر پر فری فال (موت کا کھیل) کے مظاہرے کے بارے میں اعلان کیا گیا۔ سب لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف جم گئیں اور پھر بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ہیلی کاپٹر اڑتا نظر آیا اور پھر یک لخت آسمان پر ۱۹ نقطے نمودار ہوئے۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے اور ہر لحہ یہ نقطے بڑے ہوتے رہے اور پھر ان نقطوں سے دھواں نکلا۔ یہ نقطے پاک فوج کے کمانڈوز تھے۔ جنہوں نے فری فال کے لئے ہیلی کاپٹر سے چھلانگ لگائی تھی اور آہستہ آہستہ ان کمانڈوز نے باری باری اپنے پیراشوٹ کھولنے شروع کئے۔ اٹھارہ پیراشوٹ کھل چکے تھے۔

انیسویں کا انتظار تھا مگر انیسواں پیرا شوٹ غائب ہوچکا تھا اور باری باری سب پیرا شوٹ زمین کے قریب آتے گئے اور اس دوران انیسویں پیرا شوٹر کے غائب ہوجانے کے بارے میں اعلان کیا گیا۔ اسٹیڈیم میں موجود ہر شخص پر سکتہ طاری ہوچکا تھا اور پھر دوسرے اعلان کے ساتھ کہ ۱۹ ویں پیرا شوٹر کا پیرا شوٹ نہیں کھل سکا اور وہ زمین پر آگرا ہے تو وہاں موجود ہر شخص کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہر کوئی خوف زدہ ہوگیا اور چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ سب دعائیں مانگنے لگے اور پھر اس پیراشوٹر کی تلاش شروع ہوگئی۔ پولیس اور انتظامیہ کی گاڑیاں ہوٹر بجاتی ہوئی گلبرگ اور کینٹ کے علاقہ میں پھرنے لگیں دوسری کینال پارک گلبرگ کی گلی نمبر ۱۹ میں لوگ معمول کے مطابق پھر رہے تھے کہ آسمان کی طرف سے ایک انسان کودتا ہوا نظر آیا جو مسلسل ہاتھ پاؤں چلا کر اپنی قوت سے لڑ رہا تھا اسی دوران وہ بجلی کی تاروں پر گرا اور اس کا پیٹ پھٹ گیا جس کے بعد وہ ایک مکان کے ساتھ ٹکراتا ہوا سڑک پر آگرا۔ لوگ اس طرف کو بھاگے گرنے والے شخص نے دو تین مرتبہ بازو ہلائے اور پھر موت کی آغوش میں سوگیا۔ یہ پاک کمانڈوز کا شہید لیاقت علی تھا۔ جس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور اس کے جسم سے نکلنے والے تازہ لہو کی خوشبو پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور اس کے خون سے سڑک کا رنگ بھی لال ہوتا نظر آرہا تھا۔ کچھ ہی لمحے بعد پولیس کی ہوٹر بجاتی ہوئی گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں جو اس انیسویں پیرا شوٹر کو ڈھونڈ رہی تھیں اور اس دوران ایک پولیس کی ہوٹر بجاتی ہوئی جیپ اس کی لاش کے قریب آکر رکی۔ سب سے پہلے ایک باوردی میجر جس نے کمانڈو ونگ لگا رکھی تھی اچھل کر جیپ سے باہر نکلا اور آتے ہی شہید کی لاش کے ساتھ لپٹ کر رونے لگا اور پھر آہستہ آہستہ سب پہنچتے گئے۔ شہید لیاقت علی کو سی ایم ایچ پہنچایا گیا۔ شہید کے جسم کی ہڈیاں متعدد جگہ سے ٹوٹ چکی تھی اس کی "کالی ڈانگری" (وہ وردی جو فری فال کے لئے کمانڈوز پہنتے ہیں) خون میں بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک اس کے دوسرے فری فالر ساتھی وہاں پہنچ چکے تھے اور ہسپتال میں ایسا منظر تھا کہ جیسے شہید ان تمام کمانڈوز کا سگا بھائی ہو۔ ہر کوئی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ان کے شہید بھائی کی لاش اسٹریچر پر پڑی تھی اور اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ کے آثار تھے۔ خون میں بھیگ جانے اور جسم کی ہڈیوں کے چور ہوجانے کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی اٹھ جائے گا۔

لیاقت علی کے شہید ہونے کی خبر جب

فورٹریس اسٹیڈیم میں سنائی گئی تو دعائیں مانگنے والے افراد جن کے چہروں کے رنگ زرد ہو چکے تھے اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے لیاقت علی کے بچ جانے کی جو آس دل میں لگا رکھی تھی اس کے بارے میں انہیں پتا تھا کہ یہ نہ پوری ہونے والی امید ہے مگر پھر بھی وہ "معجزہ" کا انتظار کر رہے تھے کہ شاید وہ بچ جائے۔

اس فری فال میں شہید ہونے والے لیاقت علی کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھلوال کے گاؤں نیلسن کا رہائشی تھا اس کی تین بچیاں اور ایک لڑکا تھا جو اس کے واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے وہ معمول کی طرح اس کی واپسی کی توقع رکھتے تھے مگر لیاقت کی واپسی ان پر ایک قیامت بن کر ٹوٹی۔ وہ اپنے دیئے ہوئے وقت پر گھر تو پہنچ چکا تھا مگر اس بار وہ نہ بول سکتا تھا نہ ہل سکتا تھا اور نہ ہی کسی بچے کو پیار کر سکتا تھا بعد ازاں لیاقت علی کو فوجی اعزاز کے ساتھ اس کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جس کا ہر مسلمان سپاہی کو انتظار ہوتا تھا۔ آج تک وہ اپنے افسران کو سلیوٹ کرتا رہا تھا مگر اب اس نے یہ اعزاز حاصل کر لیا تھا کہ اس کے افسر اسے سلیوٹ کرنے پر مجبور تھے۔

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں

پہلی پوزیشن

دوسری پوزیشن

یا

تیسری پوزیشن

حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں بھجوا دیجئے!

ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ

آنکھ مچولی

1- بی آئی بی کالونی، کراچی ۵

یہ سن کر توجہ نہ کچھ ہم نے کی
نہ کچھ اہمیت بات کو ہم نے دی

سکوں چین کی سانس لینے لگے
مشاغل میں مصروف رہنے لگے

بہت دیر تک روز پڑھتا تھا میں
بہت امتحانوں سے ڈرتا تھا میں

بہت حبس کمرے میں اک رات تھا
یہ ہے ذکر اس رات کی بات کا

مجھے خوف تھا ہوں اکیلا بہت
ہے کمرے سے باہر اندھیرا بہت

یکایک ہوا تیز چلنے لگی
بڑی تیز بارش برسنے لگی

نظر دفعتاً اس طرف جو اٹھی
تھی کمرے کی میرے جو کھڑکی کھلی

جو کھڑکی سے دیکھا تو اک سرکٹا
میری سمت دوڑا اچھلتا ہوا

قریب آکے کھڑکی بجانے لگا
لہو کی وہ چھینٹیں اڑانے لگا

کٹے حلق سے خر خراہٹ کا شور
عجب طرح کی بڑ بڑاہٹ کا شور

مرا ڈر کے مارے بُرا حال تھا
کھڑا میرے سر کا ہر اک بال تھا

میں سر تا قدم تھر تھرانے لگا
اڑے ہوش اور میں ٹھکانے لگا

مرے ہوش جب کچھ ٹھکانے لگے
جو گھر کے تھے افراد آنے لگے

سنی جب حکایت تو سب ہنس دیے
مجھے بزدلی کے بھی طعنے دیے

میں سمجھا تھا مرگھٹ کا مُردہ جسے
تخیل کا تھا وہ کرشمہ مرے

تھا کھڑکی کی چوکھٹ سے اب تک ٹکا
نہ مرگھٹ کا مردہ نہ تھا سرکٹا

گیا تھا جو ہوش وخرد لوٹ کر
گرا تھا وہ دھڑ سے شجر ٹوٹ کر

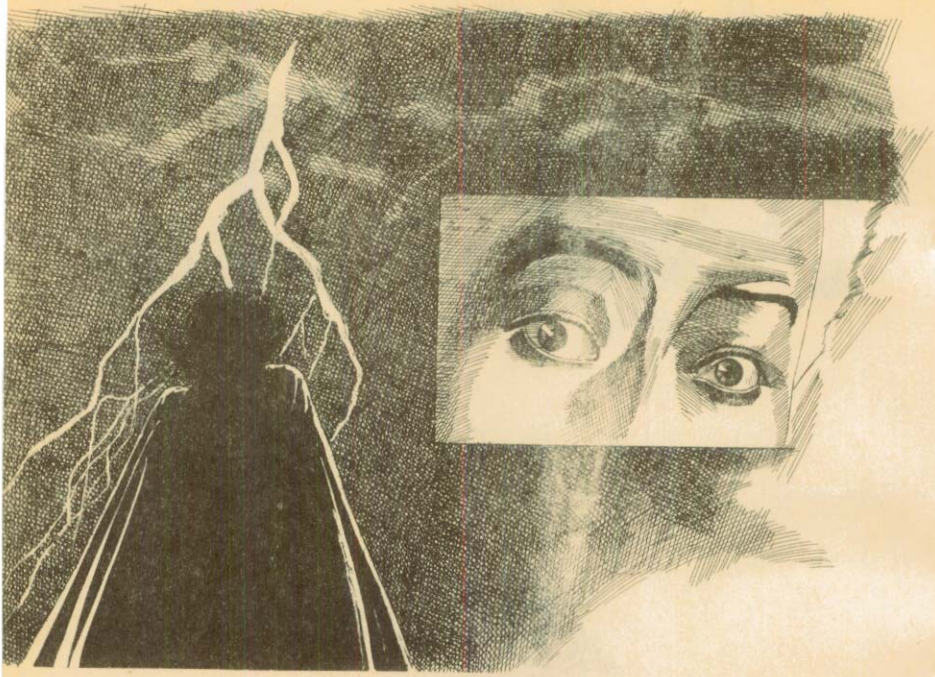

سرکٹا

فیروز خسرو

نئی اک جگہ جب ہمیں گھر ملا
محلے کے لوگوں نے آکر کہا
جہاں آپ کا گھر بنا ہے وہاں
جلاتے تھے مُردوں کو ہندو یہاں
یہاں ایک مرگھٹ تھا، شمشان تھا
علاقہ یہ پُر ہول و سنسان تھا
کہیں کھوپڑی تھی کہیں ہڈیاں
جلی اَدھ جلی تھیں کہیں پسلیاں

دہشت زدہ

اظہر علی خان

جولائی کی ایک گھپ اندھیری رات، چاروں طرف سناٹا، کبھی کبھار فضا میں گولیوں کی تڑتڑ کی آواز دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ آخر کس طرح جلد از جلد گھر پہنچے۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مصیبت تو یہ تھی کہ بیوی بھی ساتھ تھی۔ موسلا دھار بارش اور گھپ اندھیرے میں بچوں کی یاد روشنی کی ایک کرن محسوس ہو رہی تھی۔

باہر نکل کر دیکھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اوّل تو کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی اور اگر ٹیکسی یا رکشہ نظر بھی آتا تو گھپ اندھیرے میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ڈرائیور اس کا اشارہ سمجھ پاتا۔ ابھی وہ ان الجھنوں کا شکار تھا کہ ایک گاڑی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی اور وہ ہاتھ مسل کر رہ گیا۔ فرسٹ فلور سے اس کے بھائی نے اشارے سے آواز

دی کہ اوپر آجائیں لیکن جلدی جانے کی عجلت میں اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ مجبوراً" بھائی اتر کر نیچے آیا اور شانے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر کہا "یہ سفید گاڑی "خطرناک مجرموں کا ٹولہ" تھی اور آپ کو اس عالم میں یہاں نہیں کھڑے ہونا چاہئے۔ دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔" بھائی کی بات سن کر اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اگر وہ گھر نہیں پہنچ سکا تو؟..... گھر پر کسی بڑے کو لازماً" ہونا چاہئے تھا۔ لائٹ جانے' محاصرے اور گھر گھر تلاشی کے دوران' بچوں کے ساتھ نامعلوم کیا صورت حال پیش آئے؟ وہ اس گھڑی کو کوس رہا تھا' جس گھڑی وہ گھر سے نکل رہا تھا۔ تو بیوی نے کہا کہ "اچھی گھڑی کو بند ہوتے اور بری گھڑی کو آتے دیر نہیں لگتی۔ اس وقت نہ جائیں۔" بیوی کے ان الفاظ پر اس نے اس وقت کیوں دھیان نہیں دیا تھا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا۔

موسلادھار بارش کی سیلابی کیفیت' گھپ اندھیرا' دہشت زدہ ماحول' گھر پہنچنے کی عجلت' بچوں کی فکر اس کو پریشان اور خوفزدہ کئے ہوئے تھی۔ اچانک کڑاکا ہوا' دونوں سہم گئے۔ بیوی نے کہا : "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بجلی گری ہے۔" اس نے ٹوکتے ہوئے کہا : "بجلی کا نام نہیں لیتے بلکہ "کوندا" کہتے ہیں۔ ورنہ بجلی ناراض ہو کر گر جاتی ہے۔" اس کے خیال میں جادو صفت الفاظ گہرا اثر رکھتے ہیں۔ ابھی وہ الفاظ کے ان گورکھ دھندوں میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ایک ٹیکسی اس کے برابر سے پانی کے شرارے اڑاتی ہوئی گزر گئی۔ بجلی دوبارہ چمکی' گویا اس کی قسمت چمک اٹھی۔ روشنی میں اسی ٹیکسی کو واپس آتے دیکھ کر اسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ بیوی نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر قدم رکھا' ٹھٹھک کر رہ گئی۔ جسم ساکت ہو گیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر ایک شخص ڈھاٹا باندھے ایک کلاشنکوف لئے بیٹھا تھا اور ساتھ ہی نیچے ایک بند بوری میں سے سر کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ بیوی کا ایک قدم اندر اور قدم باہر۔ وہ اس صورتحال کو بھانپ نہیں پایا اور زور دیتے ہوئے کہا "جلدی کرو بارش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔" بیٹھتے ہی اس کی نظر بھی کلاشنکوف اور بوری پر پڑی۔ اب وہ بیوی کے سہمے جانے کی اصل وجہ سمجھ چکا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور : "کہاں جانا ہے؟" "کریم آباد" اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی! اس نے پوچھنا چاہا کہ یہ دوسرا آدمی تمہارے ساتھ کون ہے اور کیوں بیٹھا ہے؟ لیکن آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے ہمت سے کام لیتے ہوئے بیوی کا ہاتھ پکڑا تو ایسا محسوس ہوا گویا اس

نے برف کی سل کو تھام لیا ہے۔ بیوی کا دمکتا چہرہ لمحہ بھر میں یرقان زدہ ہوگیا۔ دونوں دل ہی دل میں عافیت کی دعا مانگنے لگے۔ دوسرا مسافر ڈرائیور سے نوکدار مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہنے لگا: "کریم آباد سے پہلے راستے میں الکرم کارنر پر گاڑی روک لینا۔"

"کیوں بھئی مسئلہ کیا ہے؟ آخر آپ درمیان میں ٹیکسی کیوں روک رہے ہیں۔" اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"بھئی کچھ کرنا ہے۔" ڈرائیور کے ساتھی نے جواب دیا اس کے بعد ہی اس کے ذہن میں خبریں ناچنے لگیں۔ ایسی خبریں جن میں بوریوں میں بند لاشوں کے ملنے کی اطلاع ہوتی تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے دل میں سوچا' کہیں وہ دہشت گردوں کے چنگل میں تو نہیں پھنس گئے؟ "یا اللہ خیر۔" اس نے دل ہی دل میں عافیت کی دعا مانگی اور ساتھ ہی یہ عزم کیا کہ بزدلی سے مرنے کے بجائے مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔

اس نے بیوی کی طرف دیکھا جو ابھی تک سکتے کے عالم میں تھی۔ لیکن صورتحال ایسی تھی کہ "نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن۔" اس نے صورتحال سے سمجھوتہ کرتے ہوئے عارضی طور پر کوئی مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا کہ اچانک ٹیکسی الکرم پر رک گئی۔ ڈرائیور کے ساتھی نے ان سے باہر نکلنے کو کہا۔ انہوں نے پوری زندگی' خود کو اس قدر بے بس کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ دونوں سہمے ہوئے باہر نکل کر کھڑے ہوگئے۔ سڑک پر ہُو کا عالم' بارش کا پانی کھلے گٹروں کی طرف تیزی سے بہہ رہا تھا۔ نوکدار مونچھوں والے آدمی نے اندر سے بوری کھینچی اور فٹ پاتھ پر بنے کھوکھے کے نیچے رکھ دی۔ بوری میں موجود لاش کا سر اندھیرے میں ایسا نظر آرہا تھا جیسے بڑے بالوں والی وگ۔ اس کے بعد وہ آدمی جیسے ہی ٹیکسی میں دوبارہ داخل ہوا' لمحہ بھر کے لئے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ بھاگ لیا جائے لیکن قدم جم چکے تھے۔ وہ نوکدار مونچھوں والا آدمی پھرتی سے واپس آیا اور اندھیرے میں کلاشنکوف کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا: "ارے یہ کیا؟" ایک دم یک زبان ہو کر وہ بولے۔

"ارے! یہ تو چھتری ہے!!" مونچھوں والے آدمی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے معصومیت سے کہا "معاف کیجئے! آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ آپ گھر جائیے۔ یہ بوری والی ٹوپیاں ساتھ والی دکان میں رکھ لوں گا۔"

انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔' سچ ہے خوف ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے۔

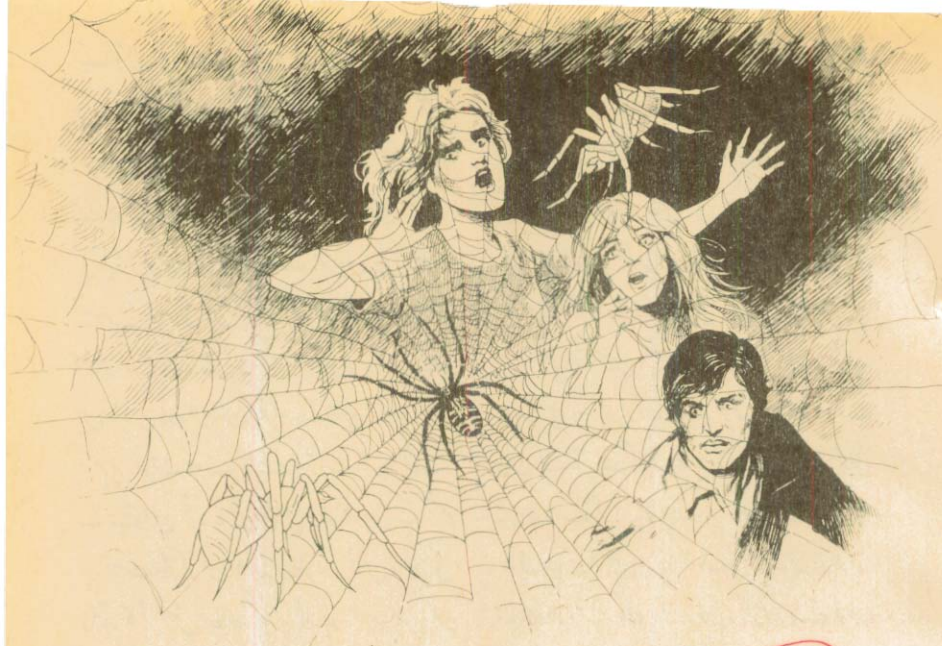

مکڑی خوف کا علاج

نادرہ انصاری

جدید تحقیق کے مطابق انسان اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ خوف میں بسر کرتا ہے۔ ہر لمحے وہ کسی نہ کسی خوف کا شکار رہتا ہے۔ اس لحاظ سے خوف کو کئی اقسام میں تقسیم کردیا گیا ہے اور مجموعی طور پر ہر خوف کو خولیا کا نام دیا گیا ہے۔ بعض افراد مجمع سے گھبراتے ہیں تو بعض تنہائی سے اور بعض تو رنگوں تک سے خوف کھاتے ہیں لیکن جانوروں کا خوف انسان میں اپنی ابتدا سے ہی موجود ہے۔ خوفناک درندے تو ایک طرف لیکن گھروں میں پائے جانے والے حشرات الارض کو دیکھ کر ہر شخص ایک ایسے خوف کا اظہار کرتا ہے جسے وہ کراہیت کا نام دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ خوف ہی ہے۔ زیادہ تر لوگ مکڑیوں سے خائف رہتے ہیں۔ مکڑیوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ بہت سی چھوٹی اور کئی بڑی اور خوفناک شکل وصورت والی ان میں سے کئی اقسام زہریلی بھی ہوتی ہیں۔ جن سے سائنسدان کئی امراض کے لئے دوائیں بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سانپ، بچھو، مکڑی اور دیگر حشرات الارض سے خوف کی بنیادی وجہ

ایک تو ان کی ظاہری شکل و صورت اور دوسرے لوگ حیران بھی ہوتے ہیں اور محظوظ بھی۔ لیکن اب انہی مکڑیوں کے ذریعے خوف کا علاج کیا جارہا ہے جو کہ خود خوف کا باعث بنتی ہیں۔ شمالی انگلینڈ کی لیڈز یونیورسٹی نے مختلف مکڑیوں کی کمپیوٹر تصویریں تیار کی ہیں۔ جنہیں اس خوف میں مبتلا افراد اندھیرے میں بیٹھ کر اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس دوران ان افراد کے ذہن، قلب اور جسم پر مرتب ہونے والے اثرات کا پتہ لگانے کے لئے اس تجربے میں شامل رضاکاروں کے جسم پر آلات لگا کر ان کا بلڈ پریشر اور نبض وغیرہ کی رفتار کا مسلسل مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی تشویش اور خوف کی سطح کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسکرین پر مکڑیوں کو مختلف زاویوں سے مختلف منظر میں حرکت کرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ انہیں ابتدا میں کم خوفناک مکڑیاں دکھائی جاتی ہیں اور پھر ان کی حالت خوف اور پریشانی کی سطح کے مطابق زیادہ خوفناک مکڑیوں کی تصاویر اسکرین پر دکھائی جاتی ہیں۔ اس تجربے کا مقصد مکڑیوں کے خوف میں مبتلا افراد کو ان کے خوف و ہراس کی سطح سے آگاہ کرکے اس پر قابو پانے میں ان کی مدد کرنا ہے۔ یہ مناظر اگر ناقابل برداشت ہوں تو ایسے افراد ایک بٹن دبا کر یہ سلسلہ بند بھی کرسکتے ہیں۔ بہت زیادہ خائف ہونے کی صورت میں وہ ایک اور بٹن دبا کر اس خوف کو کم کرنے کے سلسلے میں مشورہ بھی کرسکتے ہیں۔ اسکرین پر انہیں اس سے نجات پانے کے لئے ہدایات کے علاوہ خوش گوار مناظر اور موسیقی بھی سننے کو ملتی ہے جن سے اعصاب پرسکون ہوجاتے ہیں۔ اس تحقیق کے نگراں ڈاکٹر وارڈ کے مطابق کمپیوٹر کی اسکرین پر اس قسم کی فلمیں دیکھنے کے اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جو لوگ اپنے خوف دوسروں سے بیان کرنے سے کتراتے ہیں، کمپیوٹر سے تنہائی میں مدد لے کر اپنے خوف پر قابو پالیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ انہیں اپنے خوف کی حقیقت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ وہ مکڑیوں کے خوف سے مکمل طور پر نجات پاتے ہیں۔ اس اصلاحی مرحلے سے گزرنے کے بعد یہ افراد حقیقت میں ان جاندار مکڑیوں کو دیکھتے اور چھوتے ہیں جو اس مقصد کے لئے لیڈز یونیورسٹی میں جمع کی گئی ہیں اس مہم اور تحقیق کے روح رواں ڈاکٹر وارڈ کی رائے میں اس قسم کے طریقۂ علاج کے ذریعے سے اسی قسم کے دوسرے بہت سے خوف بھی ختم کئے جاسکتے ہیں ان میں کھلے میدانوں کا خوف اور بلندی کا خوف خاص طور پر قابل ذکر ہے اور اس کے لئے بہت سے بلند مقامات سے زمینی تصویریں تیار کی جارہی ہیں۔ جن سے بلندی کے خوف کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

ہٹلر کی روح

حنا زہرا

ہم ایک بک اسٹال پر کھڑے یوں ہی سرسری نظر دوڑا رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر ایک کتاب کے عنوان پر پڑی : "روحیں بلانا سیکھیے۔" ہماری تو سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ روحوں سے ہماری دل چسپی بڑی پرانی تھی، اس لئے مہنگی ہونے کے باوجود ہم نے وہ کتاب خریدلی۔ خیر جناب گھر پہنچ کر سب سے چھپ چھپا کر رات کے وقت ہم نے وہ کتاب پڑھنے کا ارادہ کیا اور ایک ہی نشست میں پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ چونکہ کتاب بہت غور سے پڑھی تھی اس لئے اس کی موٹی موٹی ساری ہدایات ہمیں ازبر ہوچکی تھیں۔ روح کو بلانے کا طریقہ اس کتاب میں یہ لکھا تھا کہ جو روح بلانا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بالغ ہو بلکہ اگر اس کا ذہن یکسوئی اختیار کرسکتا ہے اور وہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے تو پھر وہ روحوں کو بلا سکتا ہے

اور اس کے لئے ایک ایسا چارٹ بنانا ضروری ہے۔

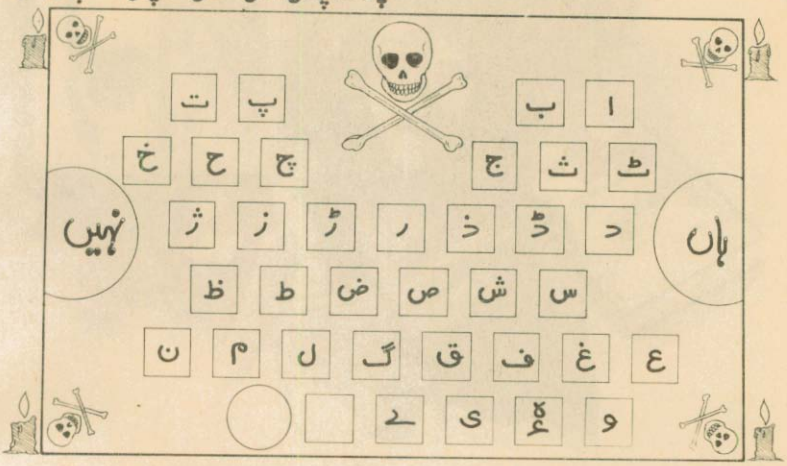

کتاب میں لکھا تھا کہ چارٹ بنانے کے بعد ایک پچاس پیسہ کا سکہ اس پر رکھ دیں اور پھر چارٹ کے چاروں طرف کونوں پر ایک ایک شمع روشن کرنا ضروری ہے۔ لیکن ان سب باتوں سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ روح بلائی جائے اور اندھیرے کمرے میں رات گئے بیٹھ کر یہ عمل کیا جائے اور یہ کہ روح اس وقت ہر صورت میں آجاتی ہے جب رات انتہائی تاریک ہو' بجلی کڑک رہی ہو' کالے کالے بادل ہر طرف چھائے ہوں اور دھواں دھار بارش ہو رہی ہو۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی ہو' ایسی رات کو کمرے کے تمام دروازے کھڑکیاں بند کر کے موم بتیاں جلا کر چارٹ سامنے رکھ کر اس شخص کا تصور کریں جس کی روح بلانی ہو۔ جب سکہ اپنی جگہ سے ہل کر چارٹ پر بنی ہوئی انسانی کھوپڑی کے پاس پہنچ جائے تو سمجھ جائیں کہ روح آگئی۔ اب آپ سوال و جواب شروع کر سکتے ہیں۔ روح آنے کی ایک نشانی یہ بھی بتائی گئی تھی کہ روح کے آتے ہی تین موم بتیاں بھی بجھ جائیں گی۔ اس جان لیوا اور روح فرسا کتاب کو پڑھنے کے بعد ہم انتظار کرنے لگے کہ گھر والے کسی تقریب میں شرکت کے لئے جائیں تو ہم اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنائیں۔ کیونکہ گھر والوں کی موجودگی میں یہ سب کچھ کرنا ناممکن تھا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ ان ہی دنوں اسلام آباد سے ایک قریبی رشتہ دار کی شادی کا کارڈ آگیا۔ ہمارے تو امتحانات ہونے والے تھے اس لئے تقریب میں ہمارے جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

آخر امی ابو ہمیں ڈھیر ساری ہدایات کے ساتھ چھوڑ کر خود اسلام آباد کے لئے روانہ ہوگئے۔

جناب اب ہم تین دن کے لئے اکیلے تھے۔

امی ابو کے جانے کے فوراً" بعد ہم نے دعائیں مانگنی شروع کردیں۔۔جی نہیں' آپ غلط سمجھے اپنے امتحانات میں کامیابی کے لئے نہیں بلکہ روح بلانے کے عمل میں کامیابی کے لئے اور ایک ڈراؤنی سی کالی رات کی جلد آمد کے لئے۔ روح بلانے میں حالات بھی ہمارا ساتھ دے رہے تھے۔ کیونکہ تیسرے ہی دن بجلی بڑی زور سے کڑکی اور بادل گرجنے لگے اور.... پھر زوردار قسم کی بارش شروع ہوگئی۔ہم چلائے "ہپ ہپ ہرے" ہماری دعا قبول ہوگئی تھی۔ کاش کہ کچھ اور مانگتے۔ خیر ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پہلی فرصت میں اپنی ملازمہ کو اس کے کمرے میں سوجانے کے لئے کہا۔ جب ہمیں اطمینان ہوگیا کہ وہ سوچکی ہے تو ہم چھت پر موجود اکلوتے کمرے کی جانب بڑھے اور تمام سامان جس کی روح بلانے کے لئے ضرورت پڑسکتی تھی' لے کر اوپر پہنچ گئے۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی ہم نے ہمت کر کے تمام کھڑکی دروازے بند کردیئے اور لائٹس آف کرکے چاروں موم بتیاں روشن کیں اور پھر ان کو اس چارٹ کے چاروں کونوں پر رکھ کردیا۔واضح رہے کہ یہ چارٹ ہم نے بڑی مشقتوں سے بنایا تھا۔

اب منظر کچھ اس قسم کا تھا کہ بجلی کڑک رہی تھی۔ بارش موسلادھار بلکہ دھواں دار ہورہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں چارٹ موم بتیوں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ ہم نے کھڑکیوں پر سے پردے ہٹادیئے اور بارہ بجنے کا انتظار کرنے لگے تاکہ عمل فوراً" شروع کردیں۔ اچانک ہمیں اپنے گھڑیال کی آواز آئی ٹن! ٹن! ٹن.....یعنی بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے چارٹ سیدھا کیا اور ہٹلر کی روح بلانے کے لئے کتاب کی ہدایات کے مطابق عمل شروع کیا۔ہم نے ابھی عمل مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ یکایک بجلی زور سے کڑکی اور چاروں موم بتیاں ایک ساتھ بجھ گئیں۔ہماری تو سٹی گم ہوگئی۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ہمارا اندیشہ تھا کہ شاید یہ بھی روح کی کارستانی ہے۔ کیونکہ بجلی کے کڑکتے ہی کمرے کے علاوہ ہمارا ذہن بھی تاریکی میں ڈوب چکا تھا اور پھر اچانک کڑکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں کفن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں اڑتے نظر آئے اور پھر اچانک جو ہماری نظر سامنے کھڑکی پر پڑی تو ہمارا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ چھت پر ٹنکی کے پاس ایک چھل پائی

سرخ جوڑے میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کے دوپٹے کا ہرا پلو لہرا لہرا کر اس کی ہیبت میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ ابھی اسی کو دیکھ کر ہماری گھگھی بندھی ہوئی تھی کہ ہمیں عجب بے ہنگم سا شور سنائی دیا۔ ہم جونہی اس طرف مڑے، ہمیں یوں لگا جیسے کوئی ہمارا دل شکنجے میں لے کر جکڑ رہا ہے۔ کیونکہ اس کھڑکی سے ایک کالا بھجنگ بلّا اندر داخل ہونے کے لئے پنجے مار رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ شیشہ توڑ کر اندر آتا، ہم چیخ مار کر بے ہوش ہوگئے۔ پھر کیا ہوا ہمیں کچھ علم نہیں۔

جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم حیران رہ گئے۔ کیونکہ منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ روح، عمل، چھل پائی، کفن کے ٹکڑے اور کالا بلّا سب غائب ہو چکے تھے۔ اور ہمارے سامنے ابا جان کھڑے تھے ان کے تیور دیکھتے ہی ہم ایک بار پھر بے ہوش ہوگئے لیکن ہماری بدقسمتی کہ جلد ہی ڈاکٹروں نے ہمیں ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا۔

ہماری آنکھیں کھلتے ہی ہم پر بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ شیطانی چیلوں کی نہیں بلکہ ہمارے رشتہ داروں اور گھر والوں کے سوالات کی (ویسے وہ بھی شیطانی چیلوں کے حملوں سے کم نہیں تھی) اتنے مشکل اور ثقیل زبان میں سوالات تو اردو کے پرچے میں بھی نہیں تھے جو ہم سے یہاں پوچھے جا رہے تھے۔ خیر ہم نے بھی الف انار سے لے کر یے یکہ تک ساری کہانی سناڈالی، جس کو سن کر سوائے ہمارے سب گھر والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ آخر ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ موم بتیوں کا بجھ جانا روح کے آنے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ ساری کارستانی ہوا کی تھی جو کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے آرہی تھی جس کی طرف ہمارا دھیان نہیں گیا تھا۔ رہی بات چھل پائی کی تو ہمارے بھائی جان نے انکشاف کیا کہ انہوں نے پانی کی ٹنکی پر یوم آزادی کی خوشی میں جھنڈا لگا دیا تھا اور اس کے چاند تارے کو روشن رکھنے کے لئے ایک خوبصورت سا سرخ بلب لگا دیا تھا جو ہمیں تاریک رات میں ایک ہیبت ناک چھل پائی دکھائی دیا اور جہاں تک معاملہ کالے بلے کا تھا جسے ہم ہٹلر کی روح کا بھوت سمجھ رہے تھے تو معلوم ہوا کہ وہ پڑوسی کا "لاڈلا بلّا" تھا اور بارش سے بچنے کے لئے اندر آنا چاہ رہا تھا۔ سفید کفن کے ٹکڑوں کے بارے میں کھلا کہ وہ ہماری ردی کی ٹوکری کی عنایت تھی۔ یہ سب سن کر ہمیں کھسیانی بلی کی طرح کھمبا تو نہ ملا البتہ ہم تکیہ نوچنے لگے اور جب ہم پر یہ حقیقت کھلی کہ ہمیں پورے چوبیس گھنٹے بعد ہوش آیا ہے تو ہماری رہی سہی دلیری بھی "فشوں" ہوگئی۔

چمک بھی ڈبل - مہک بھی ڈبل

ڈبل منٹ

اسپارکل پلس

پہلے اسپئرمنٹ بُو کو مارے - پھر پیپرمنٹ سانسوں کو مہکا دے

- مہکتے سانسوں اور صحت مند دانتوں کے لیئے اسپارکل پلس سے برش کیجیے۔
- دانتوں کو کیڑا لگنے سے بچانے کیلئے فلورائیڈ کا زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔
- پلاک سے بچاتا ہے اور مسوڑھوں کی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔
- منہ کو صاف رکھتا ہے، سانسوں کو تازگی بخشتا ہے اور دانتوں کو نئی چمک عطا کرتا ہے۔

مُسکرائیے آپ کی فیس ویلیو بڑھے گی...

Crescent Communications International (Pvt) Ltd.

خوفناک بونا

سلمان غزالی

اس کے بڑے بڑے زرد رنگ کے دانت بہت بدہیت تھے اور سرخ مسوڑھے ایسے تھے جیسے تازہ گوشت کے لوتھڑے ہوں جن سے خون ٹپکتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ کا دہانہ بلاشبہ ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور سمیر کو اپنی سانس حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم بہت چھوٹا سا مگر سر بہت بڑا تھا۔ اس کی حلقوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سبز آنکھیں سمیر کو اپنے جسم میں چھید کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی بھدی اور لمبی ناک کسی طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی اور آگے کو بڑھی ہوئی ٹھوڑی کے بیچ میں نمایاں گڑھا تھا جس کے اردگرد اِکّا دُکّا بال نظر آ رہے تھے۔ اس کے سمیر کی طرف بڑھتے پھیلے ہوئے ہاتھ گو کہ ہڈیوں پر مڑھی کھال کے علاوہ کچھ نہ تھے مگر اس کے جسم کی

مناسبت سے بہت بڑے تھے۔ سمیر کا حلق خشک تھا اور حواس گم ہو چکے تھے۔ اس کا وجود بہت مختصر تھا۔ اس کا قد تین فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کا چہرہ بہت مکروہ اور سراپا بہت ہیبت ناک تھا۔ وہ مختصر سا وجود آہستہ آہستہ سمیر کے اوپر چھاتا جا رہا تھا اور پھر جیسے ہی اس کی ہڈیوں کی طرح سخت اور برف کی مانند ٹھنڈی انگلیاں سمیر کی گردن سے مس ہوئیں تو ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔

سمیر کا سارا جسم پسینے میں تربتر تھا اور ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو رہی تھیں۔ اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا مگر وہ ابھی تک سپنے کے سحر سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر کار اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائیڈ سوئچ دبا کر ٹیوب لائٹ آن کی۔ اس کی سانسیں ابھی تک تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں روشنی پھیلنے سے وہ جلد ہی نارمل ہو گیا۔ سمیر نے گھڑی دیکھی تو صبح کی نماز کا وقت ہو چکا تھا یعنی اس کے اٹھنے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ سمیر پابندی سے نماز پڑھتا تھا اور روز صبح فجر کے وقت اٹھ جایا کرتا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی پر سے پردے ہٹائے تو باہر اجالا پھیل رہا تھا۔ گو کہ اس خوفناک خواب کا منظر اب بھی سمیر کے ذہن میں موجود تھا مگر اب خوف ختم ہو چکا تھا۔ سمیر نے ایک زور دار انگڑائی لی اور صبح کے اجالے کے پھیلنے کا خوبصورت منظر دیکھنے لگا۔ "اب میں ڈراؤنی کہانیاں نہیں پڑھوں گا۔" سمیر نے سوچا "یہ یقیناً" کہانی کا اثر تھا جس کا ترجمہ اس کی امی نے اسے سنایا تھا جو دراصل اس کے بڑے بھائی کی کتاب تھی جس میں امریکہ کی روایتی کہانیاں تھیں۔ ان ہی میں یہ ایک بونے کی کہانی تھی جو سمیر ہی کے اصرار پر اس کی امی نے اسے سنائی تھی۔ جس میں ایک خوفناک بونے کا کردار تھا جو باہر "لیپریکون" (Leprichon) کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے پاس ایک سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی ہانڈی تھی جس کی وہ جان سے زیادہ حفاظت کرتا تھا۔ اس کا قد بمشکل تین فٹ تھا۔ اس کے ہاتھ اور سر بہت بڑے تھے۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور شکل اور حلیے سے وہ بہت ڈراؤنا تھا۔ اسے بہت سے جادو آتے تھے۔ اور وہ ظالم اور سفاک تھا۔ وہ بچوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ جنگل میں لے جاتا تھا اور انہیں مار ڈالتا تھا۔ سمیر کی امی نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ جو بچے بدتمیز ہوتے ہیں اور بڑوں کا کہنا نہیں مانتے انہیں خاص طور پر وہ خوفناک بونا پکڑ کر لے جاتا ہے۔ سمیر کے دل میں اس بونے کا خوف واقعی بیٹھ گیا تھا اور

یہی وجہ تھی کہ آج خواب میں بھی اسے وہی نظر آیا تھا۔

سمیر چھٹی کلاس کا طالب علم تھا۔ بہت ذہین اور سمجھدار۔ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ باہمت اور بہادر مگر اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس پراسرار ہونے کا خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ گو کہ وقتی طور پر سمیر نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا اور اپنے خواب کا کسی کو علم بھی نہیں ہونے دیا۔

شام کو ٹی وی لاؤنج میں سب گھر والے بیٹھے ہوئے تھے۔ سمیر اپنی امی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا "امی کیا واقعی وہ خوفناک بونا بچوں کو پکڑ کر لے جاتا ہے؟" سمیر نے امی سے پوچھا۔"

"ہاں مگر صرف بُرے بچوں کو" امی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اور انہیں کھا بھی جاتا ہے۔" بھائی جان نے بھاری آواز میں لقمہ دیا تو ایک لمحے کو سمیر کے جسم میں سنسنی سی لہر دوڑ گئی اور وہ کافی دیر اسی بارے میں سوچتا رہا۔

اس دفعہ ویک اینڈ گزارنے کے لئے سمیر کی فیملی نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ بہت پُر فضا مقام تھا۔ آبادی سے ہٹ کر پہاڑوں کے دامن میں یہ ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ اس سے تھوڑا سا ہٹ کر ہرے بھرے گنجان درختوں کا سلسلہ تھا جو نرم پہاڑوں تک چلا گیا تھا اور یوں یہاں پہاڑ بھی سرسبز نظر آتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ یہ جنگل محفوظ تھا خطرناک جانوروں سے پاک۔ سمیر کو خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے بہت سے کزن اس کے ساتھ تھے۔ وہ بہت سے خاندان مل کر آئے تھے۔ اور ایک پرانے طرز کا بنا ہوا مگر بڑا سا ریسٹ ہاؤس انہوں نے کرائے پر لیا تھا۔ گو بہت پہلے جب وہ گھر بنا ہوگا تو اس مقصد کے لئے نہیں ہوگا مگر اب وہ ریسٹ ہاؤس کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا۔ اس کے عقب میں بہت بڑا لان تھا۔ سامان وغیرہ اندر رکھنے کے بعد اس وقت سب لوگ اسی لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بڑے تو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے مگر بچے نیچے گھاس پر تھے۔ دوپہر کا وقت تھا مگر موسم شہر کی ایک خوبصورت شام سے بھی کہیں بہتر تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بڑی دلکش ہوا چل رہی تھی۔ چائے کے بعد سب نے تھوڑی دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ سفر کر کے کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تمام بڑے آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے مگر ایک گھر سے نکلنے کے بعد بچے کہاں آرام کرنے والے تھے۔ چنانچہ بڑوں کے لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی تمام بچے باہر نکل آئے اور درختوں کے جھنڈ کے سائے میں کھیلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد رمیض

چیخا "تم نے بے ایمانی کی ہے۔" اس کا اشارہ سمیر کی طرف تھا۔ سمیر کو بہت بُرا لگا کیونکہ اس کے خیال میں اس نے کوئی بے ایمانی نہیں کی تھی جب کہ رمیض سمیر کا چچا زاد اپنی بات پر بضد تھا چنانچہ نتیجتاً سمیر ناراض ہو گیا۔

"میں نہیں کھیلتا۔" اس نے گیند زمین پر پھینک دی اور درختوں کے ساتھ ساتھ یونہی اندر کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر تو بچے اسے دیکھتے رہے کہ شاید واپس آجائے۔ نائلہ نے اسے پکارا بھی مگر وہ بچہ ہی کیا جو روٹھ کر فوراً مان جائے۔ سمیر چلتا رہا۔

"رہنے دو اسے خود ہی واپس آجائے گا" رمیض نے کہا۔

"مگر یہ جا کہاں رہا ہے؟" ثانیہ بولی۔

"جانا کہاں ہے!" ثاقب نے کہا "وہ دیکھو وہ اس بڑے درخت کی دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا ہے۔"

"وہ چاہتا تھا کہ ہم اسے جا کر منائیں۔" نائلہ نے کہا۔

"ہاں مگر ہم کیوں جائیں ہماری غلطی تو نہیں ہے۔" ثانیہ بولی۔

"کوئی نہیں تھوڑی دیر میں خود ہی واپس آجائے گا، ہم کیوں اپنا کھیل خراب کریں۔" ثاقب کے کہنے پر کھیل دوبارہ شروع ہو گیا کیونکہ سب ہی کھیلنے کے لئے سخت بے چین تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ سب کچھ بھول کر کھیل میں پوری طرح مصروف ہو چکے تھے۔

سمیر اس گھنے درخت کے چوڑے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کھیل چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اب چونکہ وہ آگیا تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے بلانے ضرور آئے گا۔ تھوڑی دیر کوئی نہ آیا تو اس نے گردن گھما کر ادھر دیکھا جدھر سب کھیل رہے تھے۔ تمام بچے بڑے مزے سے اپنے کھیل میں مصروف تھے۔ سمیر کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ سامنے ایک جھاڑی میں آہٹ ہوئی۔ سمیر چونک اٹھا۔ ایک لمحے کو اسے خوف محسوس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ جھاڑی میں سے ایک بہت ہی خوبصورت چھوٹی سی گلہری باہر نکلی۔ سمیر کو گلہریاں ویسے ہی بہت پسند تھیں اور پھر اس قدر خوبصورت گلہری تو اس نے صرف کتابوں میں دیکھی تھی۔ وہ بڑی محویت سے اس کی حرکات دیکھنے لگا۔ گلہری نے پہلے ایک درخت پر چڑھنے کی کوشش کی مگر نہیں چڑھ سکی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ایک سمت میں چل دی۔ سمیر کو بہت عجیب سا لگا، گلہریاں تو تیزی سے درخت پر چڑھنے اور اپنی پھرتی کے لئے مشہور ہوتی ہیں پھر یہ کیا..... سمیر

بدستور گلہری کو آہستہ آہستہ جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ گلہری کا پچھلا ایک پاؤں ٹھیک نہیں تھا۔ ہاں تو اسے کوئی کانٹا چبھ گیا تھا یا پھر چوٹ لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ دھیرے دھیرے اور تھوڑا پاؤں ترچھا کر کے چل رہی تھی۔

"اگر کوشش کی جائے تو اسے پکڑا جاسکتا ہے۔" سمیر نے سوچا۔ "اگر میں اسے پکڑلوں تو میں اسے ریسٹ ہاؤس میں لے جاؤں گا۔ وہاں پر اس کی چوٹ پر دوائی بھی لگ جائے گی اور ہوسکتا ہے اس طرح میں کچھ دن اسے اپنے پاس بھی رکھ سکوں۔" یہ خیال آتے ہی سمیر دبے پاؤں درختوں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا گلہری کے پیچھے چل دیا۔ گلہری اپنے تعاقب سے بے خبر تھی چنانچہ آہستہ آہستہ سمیر اس کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ پھر جیسے ہی سمیر اس کے زیادہ قریب پہنچا گلہری کو احساس ہوگیا اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی، سمیر بھی فوراً اس کے پیچھے بھاگا زخمی ہونے کی وجہ سے وہ فوری طور پر تو سمیر کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوسکی مگر اس کے باوجود گلہری میں ابھی اتنی پھرتی تھی کہ سمیر اسے باوجود کوشش کے نہیں پکڑ سکا۔ سمیر کافی دیر تک اور کافی دور تک اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ گلہری کبھی کسی جھاڑی میں گھس جاتی تھی اور کبھی کسی درخت کی کھوہ میں۔ سمیر تھک ہار کے ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گلہری اب غائب ہوچکی تھی اور سمیر تھک چکا تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ سمیر کی سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے اپنے اردگرد دیکھا اور اگلا احساس ہی انتہائی خوفناک تھا۔ اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور خوف کی ایک لہر اس کے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور سناٹا ہی سناٹا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب وہ جنگل کے کنارے کھیل رہا تھا تو ہر طرف اجالا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور بڑی روشن اور چمکیلی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسے اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہوئے ابھی مشکل سے آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا اور اس وقت ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سمیر نے اپنی کلائی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی دو بجے تھے مگر دوسرے ہی لمحے اس کے تمام جسم میں سنسنی سی لہر دوڑ گئی۔ گھڑی کی سوئیاں ساکت تھیں یعنی گھڑی کام نہیں کررہی تھی۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرا ابھی اتنا تاریک نہیں تھا کہ بینائی کام نہ کرے اس کے اردگرد پھیلے ہوئے بڑے بڑے تن آور درختوں کی گھنی اور بے ربط شاخوں نے اس کے اوپر سے آسمان کو تقریباً غائب کردیا تھا۔ یعنی وہ

اس وقت جنگل کے اسے گھنے حصے میں تھا جہاں سورج کی کرنیں بمشکل پہنچ پا رہی تھیں۔اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو سب کچھ غیر مانوس تھا۔ بڑے بڑے درخت اس کے چاروں طرف بدمست دیوؤں کی طرح جھوم رہے تھے۔ خودرو پودوں کی بہتات تھی اور جنگلی جھاڑیاں یوں سرسرا رہی تھیں جیسے ان میں سے ابھی کوئی ذی روح باہر نکل آئے گا۔ سمیر کو رستے کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ چاروں طرف ایک جیسا ہی جنگل تھا۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جائے۔ سکوت ایسا تھا کہ اسے اپنی تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایسے میں کوئی سرسراہٹ بھی ہوتی تو اس کا بے چین دل چھاتی توڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔سمیر کے اعصاب پر چھا جانے کے لئے یہ ماحول بہت تھا اور اب خوف پوری طرح اس پر غالب آچکا تھا۔

اچانک سمیر کو یوں لگا جیسے اس کے دائیں پاؤں میں کوئی چیز چبھی ہو اور ساتھ ہی شدید جلن کا احساس ہوا۔ سمیر اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر سوچے سمجھے دل میں دعائیں پڑھتا ہوا ایک سمت میں اندازے سے چل دیا۔اس حقیقت سے قطعی بے خبر کہ وہ بالکل غلط سمت میں چل پڑا تھا۔اب جلن کے ساتھ ساتھ درد بھی ہونے لگا تھا جو آہستہ آہستہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے نظر اپنے پاؤں پر ڈالی تو پنڈلی کا وہ حصہ جہاں جلن ہو رہی تھی لال ہو چکا تھا اور سوجتا جا رہا تھا سمیر کے حواس آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ خوف اس کی رگ رگ میں اترتا جا رہا تھا اور اسے اپنا سارا جسم لرزتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے نہ صرف اسے اپنے جسم میں چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے بلکہ ہر طرف پھیلی ہوئی خاموشی میں سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا جھاڑیوں اور درختوں کے پتوں میں سے گزرتی تو سمیر کا سارا وجود کانپ کر رہ جاتا۔ ہر لمحے ہر لحظے ہر سرسراہٹ پر ایسے لگتا جیسے ابھی کسی جھاڑی کے پیچھے سے، کسی درخت کی اوٹ سے کوئی نکل کر اسے پکڑ لے گا اور پھر اچانک اسے اپنی پشت پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ کوئی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بڑی عجیب و غریب سی چاپ تھی وہ کم از کم انسانی قدموں کی آواز نہیں تھی۔ سمیر کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اور ہاتھوں پاؤں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔اسے اپنا سانس حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا اور وہ سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا، اس کے پیچھے آنے والی آوازیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور شاید کسی نے اسے مبہم سی آواز میں پکارا تھا مگر اس وقت وہ کچھ بھی سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی ٹانگیں

اس کا ساتھ نہیں دے رہیں اور جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جسم تپنے لگا تھا اور پھر جیسے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے ٹھوکر لگی تھی وہ بری طرح لڑکھڑایا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ قدموں کی آواز اس کے پاس آکر رک گئی تھی اور کوئی اس پر جھک رہا تھا۔

سمیر کا سارا جسم شل ہوچکا تھا اور پاؤں میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جسم تپ رہا تھا اور وہ بری طرح پسینے میں تربتر تھا۔ سمیر نے ہمت کر کے آخر کار سر اٹھا کر اپنے اوپر جھکتے ہوئے وجود پر ایک نظر ڈالی اور ایک گھٹی گھٹی سے چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل اس کا سینہ پھاڑ کر باہر نکل جائے گا۔ وہی چھوٹی چھوٹی گہرے حلقوں میں دھنسی ہوئی سبز آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ مڑی ہوئی ناک اور ٹھوڑی والے مکروہ چہرے اور بڑے سے سر والے ہیبت ناک بونے کا مختصر وجود اس پر جھک رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بڑے خوفناک انداز میں ہل رہے تھے مگر سمیر کے منتشر حواس ان الفاظ کی تشریح کرنے سے قاصر تھے۔ اس کی باریک انگلیوں والے بڑے بڑے ہاتھ سمیر کی طرف بڑھ رہے تھے سمیر جانتا تھا کہ اس دفعہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ ایک زور دار چیخ مارنے کی آخری خواہش سمیر کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی اور اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اس کی نگاہوں کے آگے مکمل اندھیرا چھا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بچوں کو کافی عرصے بعد اس طرح باہر مل کر آزادانہ کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اپنے کھیل میں اتنے مگن تھے کہ انہیں وقت کا احساس ہی نہیں تھا اور شاید سمیر کا خیال بھی ان کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ کوئی تین بجے کا وقت ہوگا جب نائلہ اچانک کھیلتے کھیلتے رک گئی۔

"سمیر ابھی تک واپس نہیں آیا؟" اس نے کہا۔ اس کی بات سن کر سب ہی چونک کر رک گئے۔

"واقعی اب تو کافی دیر ہوگئی ہے؟" ثاقب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"کہیں درخت کے ساتھ بیٹھے بیٹھے سو ہی نہ گیا ہو۔" ثانیہ نے کہا۔

"بہرحال کافی دیر ہوگئی ہے اب ہمیں اسے منا کر لے آنا چاہئے" رمیض نے کہا۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا چنانچہ تمام بچے اس درخت کی طرف چل دیئے جس کے پیچھے سمیر جا کر بیٹھا تھا' مگر اب سمیر وہاں نہیں تھا۔

"ضرور کہیں گھومنے پھرنے نکل گیا ہوگا۔" ثاقب بولا۔ "چلو اسے ڈھونڈیں۔" تقریباً ایک گھنٹے تک سب مل کر سمیر کو ڈھونڈتے رہے'

اسے آوازیں دیتے رہے مگر بے سود۔ وہاں پر جاکر وہ رک گئے تھے جہاں سے جنگل گھنا ہونا شروع ہوجاتا تھا اور جہاں روشنی بھی کم ہوتی جاتی تھی۔ "اب کیا کریں؟" ثانیہ نے تھک کر کہا' اب سب ہی پریشان نظر آرہے تھے۔

"ہمیں واپس چل کر ریسٹ ہاؤس میں سب کو بتانا چاہئے۔" ثاقب کی بات سے سب نے اتفاق کیا اور واپس چل دیئے۔

سمیر کے گم ہونے کی خبر سن کر پہلے تو سب ہی بہت پریشان ہوگئے مگر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے تسلی دی۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں' بچہ کہیں جنگل میں بھٹک گیا ہوگا مگر وہاں پر کوئی ایسی خطرے والی بات نہیں' جلدی ہی وہ مل جائے گا"

چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں چوکیدار کی رہنمائی میں سمیر کے ابو اور انکل اسے ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

☆.....☆.....☆

سمیر نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہورہا تھا وہ کھردرے فرش پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر کے نیچے شاید پتوں کا تکیہ تھا۔ اسے اپنے ارد گرد پتھریلی زمین اور دیواریں نظر آرہی تھیں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیسے یہاں آیا کہ اسے اپنے سرہانے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے سر گھما کر ادھر دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہی خوفناک بونا اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ سمیر کو ایک دم سب کچھ یاد آگیا تھا۔ وہ خوف کے مارے اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا مگر بونے نے اسے شانے سے پکڑلیا' پھر ایک باریک سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی 'ڈرو نہیں' میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس کے اشارے پر سمیر کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بونے نے کچھ کیلے سمیر کی طرف بڑھائے "یہ کھالو" سمیر نے ڈرتے ڈرتے کیلے لے لئے۔

"تم لیپریکون ہو" سمیر نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ اس کے سوال پر وہ بونا حیرت سے سمیر کا منہ تکنے لگا۔

"وہ خوفناک بونا جو بچوں کو پکڑلیتا ہے اور کھا جاتا ہے۔" سمیر نے ہمت کرکے کہا۔ سمیر کی بات پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بونے کے چہرے پر ابھر آئی۔ "بونا تو میں ہوں کیونکہ میرا قد بہت چھوٹا ہے اور شاید دیکھنے میں بہت بدصورت اور خوفناک بھی مگر نہ تو میں بچوں کو مارتا ہوں اور نہ ہی انہیں کھاتا ہوں۔" اس کے آواز بڑی باریک اور عجیب سی تھی۔

"تو....." سمیر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تو یہ کہ میں کوئی بھوت یا عفریت نہیں

ہوں جو تمہیں نقصان پہنچاؤں، تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں مگر قدرت کی مرضی کہ اس نے مجھے بہت چھوٹا اور بدصورت بنادیا ہے۔" بونے نے پتھریلی چھت کی طرف ایسے دیکھا جیسے شکوہ کررہا ہو۔

سمیر نے اب غور سے اس کے سراپے کا جائزہ لیا، وہ واقعی ایک عام انسان کی طرح تھا، بس قد بہت چھوٹا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ جسم کی مناسبت سے سر اور ہاتھ پاؤں بہت بڑے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی ناک اور ہونٹ بہت بھدے تھے اور داڑھی کی جگہ صرف چند بال تھے اور پہلی دفعہ دیکھنے میں وہ بہت عجیب سا لگتا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ سمیر کے ذہن میں پہلے سے جو خوفناک بونے کا تصور تھا وہ پہلی نظر میں بالکل ویسا ہی لگتا تھا۔

سمیر کا خوف اب کافی کم ہوگیا تھا، اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو کوئی غار نما جگہ تھی جہاں فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں اور ادھر ادھر کچھ معمولی سا ضرورت کا سامان پڑا تھا۔

"تم یہاں رہتے ہو؟" سمیر نے پوچھا

"ہاں؟ یہ میرا گھر ہے۔"

"کیوں؟" سمیر نے پوچھا۔

"بس مجھے اکیلے رہنا اچھا لگتا ہے، دراصل پہلے میں یہاں سے کافی دور ایک قصبے میں رہتا تھا مگر وہاں لوگ مجھے تنگ کرتے تھے، مذاق اڑاتے تھے اور بچے مجھ سے ڈرتے تھے چنانچہ میں سب کچھ چھوڑ کر ادھر آگیا۔ یہاں پر میں نے سبزیاں اگائی ہیں۔ پھلوں کے درخت بھی ہیں اور کبھی کبھی میں درختوں کی کھال اور سخت پتوں سے چٹائیاں بھی بناتا ہوں اور سب کچھ پہاڑ کے دوسری طرف کے قصبے میں جاکر بیچ دیتا ہوں اور اپنی ضرورت کی کوئی چیز خرید لاتا ہوں۔"

پھر یکایک سمیر کو جیسے کوئی خیال آیا "تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔"

"تمہارے پاؤں میں زہریلا کانٹا چبھ گیا تھا اور تم بے ہوش ہوگئے تھے۔" اس نے کہا۔

سمیر نے فوراً اپنی پنڈلی کی طرف دیکھا، وہاں ہلکی سی سوجن اور سرخی تھی مگر درد اور جلن ختم ہوچکی تھی۔

"تم فکر نہ کرو، میں نے مرہم لگادیا تھا، اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"میں کتنی دیر سوتا رہا ہوں؟" سمیر نے پوچھا۔

"گھڑی تو میرے پاس نہیں ہے مگر تقریباً ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔" بونے نے جواب دیا۔ اچانک سمیر کو اپنے گھر والوں کا خیال آیا۔ "میرے گھر والے پریشان ہورہے ہوں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "آؤ میں تمہیں جنگل سے باہر کا رستہ دکھادوں۔" بونے نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل آئے تھوڑی

دور آنے کے بعد ہی سمیر کو اپنے ابو کی آواز سنائی دی' وہ اسے پکار رہے تھے

"میرے ابو مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔" سمیر نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔" بونے نے کہا "مگر میرا کسی سے ذکر مت کرنا۔"

"اچھا" سمیر بولا۔

"اور ہاں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بتانا کہ ضروری نہیں کہ ہر بدصورت اور خوفناک دکھائی دینے والی چیز خطرناک اور نقصان دہ بھی ہو۔"

جاتے ہوئے بونے نے سمیر سے ہاتھ ملایا تو سمیر کو احساس ہوا کہ وہ بڑے بڑے بھدے ہاتھ بڑے نرم اور گرمی کا احساس لئے ہوئے تھے۔

دوبارہ سمیر کے ابو کی آواز آئی تو سمیر نے بھی جواب میں انہیں پکارا اور وہ جلد ہی اپنے والد اور انکل کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔

رات کو سمیر سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو امی نے پیار سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"میرا بیٹا جنگل میں گم ہو گیا تھا' ڈر تو نہیں لگا۔"

"نہیں امی وہ جس خوفناک بونے کی کہانی آپ نے سنائی تھی نا وہ تو بہت اچھا آدمی ہے۔"

امی نے پہلے تو حیرت سے سمیر کی طرف دیکھا اور پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں "سو جاؤ بیٹا تم تھک گئے ہو۔" سمیر نے آنکھیں بند کر لیں' وہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا البتہ ایک بات کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ بچپن میں سنی ہوئی ہر کہانی سچی نہیں ہوتی۔

الوداع میرے پیارے سگریٹ! میں تمہارے لئے بہت کچھ قربان کر سکتا ہوں سوائے صحت اور زندگی کے۔

تعلیم یافتہ بیوقوف بے علم بیوقوف سے بہتر ہوتا ہے۔

نوجوان بوڑھوں کو احمق سمجھتے ہیں اور بوڑھے جانتے ہیں کہ نوجوان احمق ہیں۔

جاگیر دار وسیع و عریض زمین پر قابض نہیں ہوتا بلکہ زمین اس پر قابض ہوتی ہے۔

دستر خوان کے دوست بدلنے کے لائق ہوتے ہیں۔

امید کہتی ہے بڑھے چلو، بڑھے چلو اور انسان امید کی راہنمائی میں قبر تک پہنچ جاتا ہے۔

سیاسی پارٹیاں اپنے وعدوں کو نگل نگل کر مر جاتی ہیں۔

دانشمند کی تعریف اس کی غیر حاضری میں کرنی چاہئے۔

ظالم اور خود غرض حکمران کے خلاف بغاوت اللہ کی وفاداری ہے۔

تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمہیں یاد کیا کروں گا۔ اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔

(القرآن، سورۃ بقرہ۔ آیت: ۱۵۲)

ہر گدھا دیوار پھاندنے سے پہلے خود کو ہرن تصور کرتا ہے۔

مرسلہ:۔ عبدالستار خان طاہر، بورے والا۔

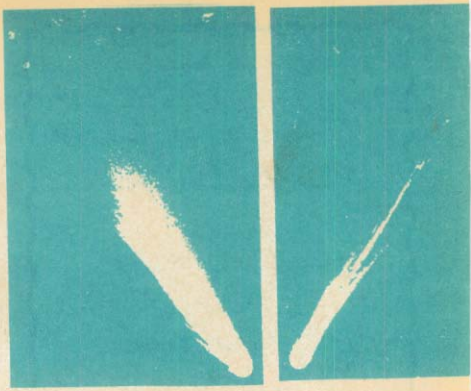

خوفناک تارہ

ابنِ سلام

بچو! ابھی زیادہ دن نہیں گزرے، جولائی ۹۴ء کی بات ہے۔ ایک خبر بڑے خوفناک انداز میں مشہور ہوگئی تھی۔ خبر یہ تھی کہ ایک دُم دار تارا سب سے بڑے سیارے مشتری سے ٹکرانے والا ہے۔ لوگ یوں ڈرا دیئے گئے تھے کہ گویا اس خوفناک دھماکے سے ہماری اپنی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ پھر آپ نے خود دیکھا کہ نہ دنیا کا کچھ بگڑا نہ سیارہ مشتری کا کچھ بگڑا۔ یہ خوبصورت سفید سیارہ آج بھی ہنستا مسکراتا ہمارے آسمان کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہا ہے۔ (جی ہاں صرف محاورے میں نہیں بلکہ واقعی سیارہ مشتری کے چار عدد چاند بہت مشہور ہیں، ان کا ذکر آئندہ کسی مضمون کے لئے اٹھا رکھئے)

یقیناً" ڈیڑھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے یہ دُم دار ستارا مشتری سے جا ٹکرایا تھا۔ مگر یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ فٹ بال سے رائی کا دانہ جا ٹکرائے۔ ابھی اس وحشت ناک خبر کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ دوبارہ اگست ۹۵ء کے شروع میں ایک اور دُم دار تارے کی خوفناک خبر اخباروں میں آگئی کہ صاحب یہ تارا ہماری اپنی دنیا سے ٹکرائے گا اور دنیا کو فنا کر دے گا۔

دُم دار تاروں کے بارے میں ایسی دل دہلانے والی کہانیاں مشہور ہوتی رہی ہیں۔ جب کبھی دُم دار تارا نظر آیا لوگوں نے اس سے ڈرنا کانپنا شروع کر دیا۔ اس کی آمد سے جنگوں، وبائی بیماریوں، قحط، اور سیلابوں کی خبریں بنائیں۔ میں آپ کو سمجھاؤں گا کہ آپ اس طرح کے وہم اپنے دل میں نہ پالیے بلکہ معلوم کیجئے کہ یہ دم دار تارے کیا ہوتے ہیں، کیسے نظر آتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں، کدھر چلے جاتے ہیں۔ دم دار تارا یا جھاڑو تارا کبھی کبھار ستاروں کے بیچ آسمان پر نظر آتا ہے۔ جیسے دیگر نو سیارے (عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو) سورج کے چاروں طرف چکر لگا رہے ہیں۔ اسی طرح نہایت ننھے منے، مگر بہت سارے،

برفیلے ٹکڑے بھی سورج کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اپنے رستے پر چلتے چلتے جب سورج کے قریب سے گزرتے ہیں تو سورج کی روشنی میں خوب چمکنے لگتے ہیں۔ سورج کی تیز گرمی سے ان کا مادہ گیس کی شکل میں ابلنے لگتا ہے۔ جس طرح گرمی میں بھانپ بن جاتی ہے۔ یوں یہ برفیلے ٹکڑے بہت سی گیس خارج کرنے لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی کا دباؤ ان کی گیس کو دور دور تک پھیلا دیتا ہے۔ کچھ حصہ ٹھوس رہ جاتا ہے کچھ گیس کی ایک لمبی دُم کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ تب ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے اس کے سر سے دم نکل کر پھیل گئی ہے کچھ لوگ اس شکل کو جھاڑو کی مثال سے سمجھاتے ہیں۔ اسی لئے کوئی اسے دم دار تارا کوئی جھاڑو تارا کہتا ہے۔ آسمان پر یہ بڑا خوبصورت منظر ہوتا ہے۔

اس کی لمبی، چمکیلی، دم کے پار زیادہ چمکدار تارے جھانکتے ہوئے بہت حسین نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بنانے والے کی قدرت کا ایک مظاہرہ ہے۔ دیکھنے والوں کے لئے خوبصورت اور سوچنے والوں کے لئے کار آمد۔ لوگوں نے دُم دار تاروں کی معلومات اور تحقیق میں عمریں گزار دی ہیں۔ ان کی خوفناکی اور دہشت کے سحر سے انسان کے ذہن کو آزاد کرایا ہے۔ مختلف زمانوں میں نظر آنے والے دم دار تاروں کے بارے میں حساب لگا کر ثابت کیا ہے کہ کئی بار ایک ہی دم دار تارا (Comet) اپنے مختلف چکروں میں نظر آتا رہا ہے۔

جب سورج کے گرد چکر لگا کر دم دار تارا سورج سے دور چلا جاتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کی گیس دوبارہ جم کر ٹھوس شکل میں سمٹتی چلی جاتی ہے۔ چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور یہ سورج سے دور تاریکی میں ایک کالے نقطے کی طرح غائب ہوجاتا ہے۔ اگلے چکر میں برسوں، صدیوں کے بعد پھر واپس آتا ہے۔ بعض دم دار تارے ایک صدی سے بھی کم میں اپنا چکر پورا کرلیتے ہیں، بعض کو لاکھوں سال لگتے ہیں۔ نہ جانے کتنے دم دار تارے اپنی سج دھج لاکھوں سال سے دکھاتے رہے ہیں۔ مگر اس وقت اس زمین پر ان کی خوبصورتی کی داد دینے کے لئے، ان پر غور کرنے کے لئے، کوئی انسان موجود نہ تھا۔

ایسے نہ جانے کتنے دم دار تارے قدرت نے بنائے ہیں۔ ان کی باتیں اور معلومات بہت ساری ہیں، مگر ابھی آپ بہت چھوٹے ہیں، اس لئے دم دار تاروں کی آنکھ مچولی کا اتنا ہی ذکر کافی ہے۔ اگر بڑے ہوکر آپ کی دلچسپی بڑھی تو اور پڑھ لیجئے گا۔ میری دعا ہے آپ اپنے وطن کے آسمان پر چمکیں اور اتنا چمکیں کہ چاند تارے آپ پر رشک کریں۔

بندروں کا مقام

قرۃ العین کلیم

میری ہیر ڈریسر کو بندروں سے شدید نفرت ہے۔ اس نے بندروں سے شدید نفرت کا سبب مجھے ایک دن بال بناتے ہوئے بتایا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب وہ "جزیرہ بالی" تفریح کے لئے گئی تھی۔ اس دور میں وہ سیاحوں کی دلچسپی کے ایک مقام "مقدس بندروں کے جنگل" بھی گئی۔ یہ جنگل در حقیقت جانوروں کی ایک پناہ گاہ تھا۔ وہاں یہ بات مشہور تھی کہ یہ بندر اس جنگل کے محافظ ہیں اور بد روحوں سے اس جنگل کی حفاظت کرتے ہیں۔ میری ہیر ڈریسر کا مقصد یہ تھا کہ وہاں جا کر اپنی خوشحالی اور کامیاب زندگی کے لئے دعا مانگے۔ لہٰذا وہ دعا مانگنے جنگل میں گئی۔ جونہی وہ ایک تناور درخت کے نیچے تعظیماً جھکی، شور مچاتا ہوا ایک بندر اس کی جانب دوڑا اور اس کے ہاتھ سے کھانے پینے کی اشیا کا تھیلا لے بھاگا۔ کھانے پینے کا یہ سامان اس نے سنگاپور میں اپنے ساتھیوں کی ضیافت کے لئے خریدا تھا۔ بندر کی یہ

حرکت دیکھ کر میری سہیلی قدرتاً" آپے سے باہر ہوگئی اور بندر کے پیچھے دوڑی۔ بندر بھاگ کر جنگل میں گھس گیا۔ پہلے تو وہ جنگل میں داخل ہونے سے ہچکچائی' لیکن غصہ اس پر غالب آگیا اور وہ جنگل میں داخل ہوگئی جیسے ہی وہ جنگل میں داخل ہوئی' اس نے اپنے آپ کو بڑے بڑے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے درمیان گھرا پایا۔ بندر اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر میری ہیرڈریسر غصے سے پھٹ پڑی اور تمام بندروں کو بُرا بھلا کہنا اور کوسنا شروع کردیا اور اس نے یہ بھی کہا کہ بندر دنیا کا غلیظ ترین جانور ہے۔ دل کی بھڑاس نکال کر جب وہ اپنے حواس میں آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ بندروں میں گھر چکی ہے۔ بندر اس کے گرد ساکت و صامت بیٹھ گئے اور اس پر نظریں گاڑ دیں یہ دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے فرار ہونا چاہا' لیکن فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک ڈراؤنی چیخ ماری۔ اس کے چیختے ہی بندروں نے اس پر حملہ کردیا اور اسے بھنبھوڑنا شروع کردیا۔ اسے محسوس ہوا کہ بندر اس کے تمام جسم کو چیرے ڈال رہے ہیں۔ بقول اس کے ایسی جسمانی اذیت تو شاید جہنم میں بھی نہ دی جاتی ہوگی۔ آخر کار جب لوگوں نے اسے بندروں سے بچایا تو اس کا پورا جسم لہولہان تھا۔ زخم اتنے گہرے تھے کہ اسے تین ماہ اسپتال میں رہنا پڑا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی اِس سے بڑی مصیبت تو ابھی آنے والی تھی۔ صحت یابی کے چند ماہ بعد اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر بال اگنا شروع ہوگئے اس سے پہلے اس کے چہرے پر ایک بھی بال نہ تھا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ ان بالوں کی رنگت اور بناوٹ بھی بالکل مختلف تھی۔ عام انسانی بالوں کے برعکس یہ بال انتہائی سخت اور کھردرے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بال گھنے اور موٹے ہوتے چلے گئے۔ یہ تکلیف دہ جسمانی تبدیلی دیکھ کر وہ پاگل ہوگئی۔ اسے وہم ہوگیا کہ وہ ایک بندر بنتی جارہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے کیلوں اور مونگ پھلی سے بھی رغبت ہوگئی' جو بندروں کی مرغوب غذا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ یہ سب اِن مقدس بندروں کی توہین کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس ناگہانی آفت سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ بزرگوں' پادریوں' عاملوں وغیرہ کے پاس بھاگی پھری' لیکن افسوس وہ کچھ بھی نہ کرسکے۔ اس کا علاج کسی حد تک صرف موجودہ میڈیکل سائنس کے پاس تھا۔ یعنی الیکٹرولیسس (Electrolysis) مجھے اس بے چاری سے بے حد ہمدردی ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ حادثہ میرے ساتھ پیش آتا تو میں بھی بندروں سے شدید نفرت کرنے لگتی۔

آسیبی مکان

مدیحہ اظہر ڈار

یہ فروری ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے۔ میرے والدین پیٹر اور لینا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کو اس وقت مکان کے حصول میں کافی دشواری پیش آ رہی تھی۔ آخر کار انہوں نے دو نوبیاہتا جوڑوں کے تعاون سے ایک سات کمروں والا نہایت کم کرائے والا ایک گھر ڈھونڈا، جو کہ نہایت خوبصورت اور کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ اوپر والی منزل میں ایک جوڑے کلاڈ اور کیتھرائن نے اپنی جگہ بنائی اور دوسری جگہ سامان رکھا۔ ڈک اور نورا چیپ مین نے دوسری منزل پر ایک وسیع وعریض کمرا چنا اور ہمارے والدین کے حصے میں ایک بڑا ہال آیا۔ گھر پہلے سے ہی سجا ہوا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ابھی انہیں آئے ہوئے دو دن گزرے تھے کہ ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ میری والدہ اور کیتھرائن اور نورا سیڑھیوں کے دروازے پر رنگ کر رہی تھیں ایک دم انہیں سیڑھیوں پر دوڑنے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر مردوں سے کیا لیکن وہ صرف مسکرا دیئے اور معاملہ ختم کردیا۔ اس بات کے کچھ دنوں بعد رات کو کیتھرائن کے کمرے سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ تمام لوگ اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔ انہوں نے دیکھا کہ کیتھرائن بستر پر لیٹی کسی نادیدہ قوت سے بری طرح لڑ رہی ہے اور وحشیانہ انداز میں ہاتھوں کو ہوا میں لہرا رہی ہے۔ کلاڈ اس کو بستر سے اٹھانے کی کوششیں کرنے لگا تو ایک دم کسی نادیدہ قوت نے کیتھرائن کو نیچے گرا دیا اور اس کا سر دیوار سے پٹخ دیا۔ جب وہ ٹھیک ہوئی تو انہوں

نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن ہمارے اصرار سے وہ ٹھہر گئے۔ کیتھرائن کے علاج کے لئے جس ڈاکٹر کو بلایا گیا وہ اس علاقے کا پرانا باشندہ تھا۔ اور مکان کے مالکوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب اس رات کے واقعہ کا ذکر کیا تو وہ بڑبڑایا کہ عجیب بات ہے یہ مکان تو..... پھر وہ رک گیا۔

ہمارے بہت اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہ بتایا۔ چند دن بعد پھر سیڑھیوں پر کسی کے اوپر جانے کی آواز سنائی دی۔ جو سیڑھیوں کے سرے پر چند لمحوں کے لئے ختم ہوگئی۔ پھر دوبارہ سنائی دی اور زور سے غسل خانے کا دروازہ بند ہوا۔ اور پانی بالٹی میں گرنے لگا۔ ابّا جلدی سے اس طرف بھاگے۔ غسل خانے کا دروازہ کھولا وہاں کوئی نہ تھا لیکن پانی گر رہا تھا۔ ابا نے پانی بند کیا پھر نیچے آگئے۔ ایک دم دوبارہ کسی کے اوپر جانے کی آواز سنائی دی۔ ابا اس کے تعاقب میں پیچھے دوڑے۔ آواز بند ہوگئی پھر غسل خانے کی طرف کسی کے جانے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے ساتھ دوبارہ پانی گرنے کی آواز آئی۔ حالانکہ پانی بالکل بند تھا۔ شام کو کھانے کے وقت سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ہال کی طرف دوڑے۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل گیا۔ حالانکہ کلاڈ نے اس دروازے پر تالہ لگایا ہوا تھا کلاڈ کو شک ہوا کہ کوئی اوپر آیا ہے۔ وہ سیڑھیوں کی طرف گیا تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قریب سے گزرا ہے اور ٹھنڈے سانس کی ہوا کلاڈ سے ٹکرائی اس کے بعد سیڑھیوں پر برف پھیل گئی جو کئی دنوں تک پھیلی رہی۔ ان واقعات کے بعد ہم گھر چھوڑ سکتے تھے۔ مگر ہم نے ان کو وہم سمجھا اور کرایہ بھی کم تھا اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ اب اگر دوبارہ کوئی واقعہ رونما ہوا تو وہ مکان چھوڑ دیں گے۔ ایک رات جب سب سوئے ہوئے تھے تو گھوڑوں کے بھاگنے کی آوازیں سنیں جو مکان کے عقب میں جاکر ختم ہوگئیں۔ پھر ایک نیا شور پیدا ہوا۔ اس کے بعد ہفتے میں دوبار ایسا ہونے لگا۔ کئی ہفتے بعد اچانک ایک نئی افتاد آن پڑی۔ مکان کے عقب میں زنگ آلود چکی زور زور سے چلنے لگی۔ پھر پانی میں غڑاپ کی آواز کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ ابا نے جب اس واقعہ کا ذکر شہر میں کیا تو کسی نے بتایا کہ کئی سال پہلے ایک مزدور پن چکی سے گر کر مرگیا تھا اس وقت تیز تیز جھکڑ چل رہا تھا۔

ایک دن بعد دوپہر کو امی، کیتھرائن اور نورا تیسری منزل پر چلی گئیں۔ اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہوگیا وہ اپنی کوششوں کے باوجود اسے نہ کھول سکیں۔ پھر رات کو جب ان کے

خاوند گھر لوٹے تو انہوں نے دروازہ کھولا۔ دیکھ بھال کرنے پر معلوم ہوا کہ دروازہ کسی نے بند کیا تھا اور چٹخنی لگا دی تھی۔ کچھ روز بعد امی کے دادا دادی ملنے آئے۔ دادی ٹھگنے قد کی عورت تھیں۔ ان کا ایسے خاندان سے تعلق تھا جو کہ روحانیت کے عامل تھے۔ ایک دن سب ہال میں بیٹھے ہوئے تھے تو دادی اماں نے کہا اس کمرے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی اور ہے۔ دادا ابا ایک دم چونکے اور دادی کو خاموش رہنے کو کہا۔ اگلے دن امی باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں۔ دادی اماں ہال میں گئیں ایک دم وہاں سے دادی اماں کی چیخوں کی آواز سنائی دی۔ گھر میں صرف امی اور دادا ابا موجود تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے ہال میں گئے تو دیکھا کہ دادی اماں لیٹی کسی نادیدہ دشمن سے لڑ رہی تھیں اِن کا چہرہ زرد تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی ان کا گلہ دبا رہا ہے۔ ایک دم کسی نے دادی اماں کو زور سے زمین پر دے مارا۔ دادا تیزی سے آگے بڑھے اور دادی اماں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ دادی اماں اور دادا ابا اگلے ہی دن جانے لگے دادی اماں نے امی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ تم اس منحوس گھر کو چھوڑ دو۔ میں جب ہال میں گئی تو میں نے ایک عجیب مخلوق کو دیکھا جس کے بال نارنجی تھے اور سوئیوں کی طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس نے میرا گلا دبانا شروع کر دیا۔ تم اس گھر کو چھوڑ دو کیونکہ یہ مکان بہت جلد نذر آتش ہو جائے گا۔ ہم نے کچھ دنوں بعد مکان چھوڑ دیا اور الگ الگ ہو گئے۔ اس کے کچھ دن بعد مکان میں آگ لگ گئی۔ اس کے بعد ہم یہ واقعہ بھول گئے کہ اچانک ایک دفعہ جم چچا آئے وہ کانپ رہے تھے اور ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس دروازے سے ایک مخلوق مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے بال نارنجی اور سوئیوں کی طرح کھڑے تھے اور پھر ایک دم اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اسی طرح میری امی نے رات کو بستر کے پاس ایک سایہ دیکھا اس سائے نے اچانک کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی امی نے دیکھا تو اس کا حلیہ بیان کیا کہ اس نے ایک تنگ چوغہ پہنا ہوا تھا۔ ننگے بازوؤں پر لمبے بال تھے۔ سر کے بال نارنجی اور سوئیوں کی طرح کھڑے تھے۔ اس کے بعد وہ راستے میں چلتے چلتے غائب ہو گئی۔ اس حادثے کے بعد ابا کے سوا کسی کو اس کمرے میں سونے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ اس پُراسرار مخلوق کے منتظر تھے لیکن وہ کبھی نہ آئی۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے یہ مکان بیچ دیا۔ لیکن آج تک میں اس واقعے پر حیران ہوں کے کیا انجانی قوتیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتی ہیں؟ کیا ان کی روشنی نسل در نسل چلتی ہے؟ (ماخوذ)

اویس خان

کباڑی یا فنکار

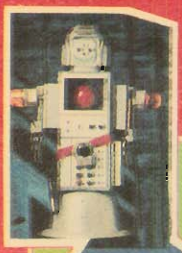

اندھیری رات ہے۔ سڑک سنسان۔ دور دور تک آدم نہ آدم زاد۔ اچانک اندھیرے میں جگنو سے ناچنے لگے۔ تصویر واضح ہوئی تو پتا چلا کہ انسان نما کوئی مخلوق ہے۔ جس کا سر بہت بڑا ہے اور بیسیوں آنکھیں ہیں۔ مختلف رنگ کے قمقموں جیسی آنکھیں۔ جو بار بار جل بجھ رہی ہیں۔ کیا یہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے؟ دیکھنے والے نے سوچا۔ اور اکثر دیکھنے والے یہی سوچتے ہیں۔ مگر نہیں! یہ خلائی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ میری لینڈ کے ہاروے سکینز ہیں۔ انہیں نت نئی چیزیں تخلیق کرنے کا شوق ہے۔ پرانے کاٹھ کباڑ کو اپنی تخلیقی قوت کے سہارے اپنے تخیل کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔ کبھی خلائی کتا بنا دیا تو کبھی اسلحہ بردار روبوٹ۔ کسی چیز کو اسٹار شپ میں ڈھال دیا کسی کو کسی اور روپ میں۔ ایک پورا میوزیم ہے جو ان کی تخلیقات سے بھرا پڑا ہے۔ ہاروے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ انہیں بہت شوق سے اپنا میوزیم دکھاتے ہیں اور نئی نئی چیزیں بنانے میں ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔

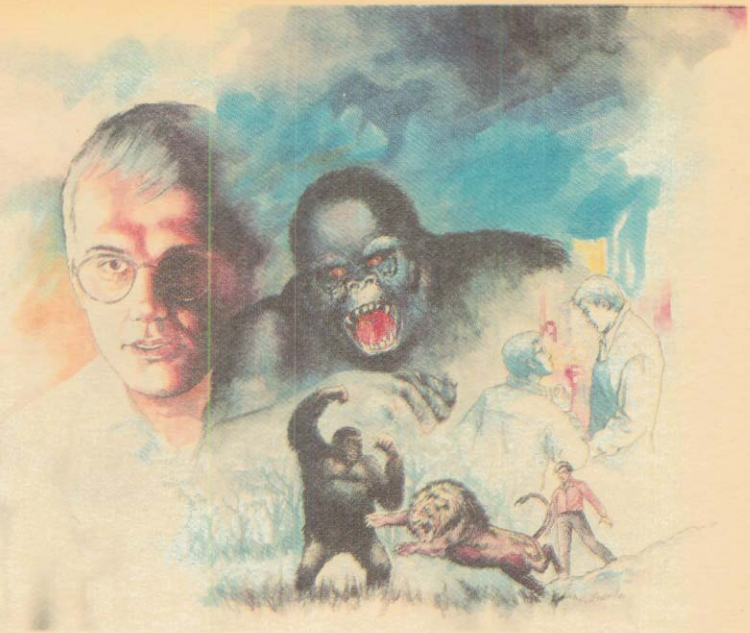

رات کا ہنگامہ

محمد عادل منہاج

حالیہ بارشوں کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور اس زخم خوردہ سڑک پر نیلے رنگ کی ایک پرانی کار آہستہ آہستہ ڈگمگاتی ہوئی اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ شہر کہیں پیچھے رہ گیا تھا اور دور جنگل کے آثار نظر آرہے تھے۔ ”نہ جانے ڈاکٹر کو اس ویرانے میں رہنے کا شوق کیوں ہے؟ خواہ مخواہ کے تجربوں میں الجھا رہتا ہے، حاصل نہ کچھ حصول۔“ کار کا ڈرائیور بڑبڑایا۔

یہاں تک پہنچ کر سڑک بھی ختم ہوگئی تھی اور سامنے ایک کھلا میدان تھا جس کے ایک سرے پر ایک بڑی سی عمارت تھی۔ عمارت کے پیچھے گھنا جنگل تھا۔ جہاں سے کبھی کبھی کسی جانور کے بولنے کی آواز آجاتی۔ بعض اوقات تو شیر کی دھاڑ بھی سنائی دے جاتی تھی۔

کار اب عمارت کے سامنے بنی مخصوص جگہ پر رک چکی تھی۔ ڈرائیور باہر نکلا اور مین گیٹ پر

پہنچ کر گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کے نیچے لگی تختی پر "ڈاکٹر کمال" کا نام اور نیچے ڈگریوں کی تفصیل لکھی تھی۔

"کون ہے؟" گھنٹی کے اوپر لگے اسپیکر سے آواز ابھری۔

"میں ہوں ریاض! اور یہاں کون آسکتا ہے؟" وہ منہ بنا کر بولا۔

"ہا۔ ہا..... بڑے دنوں بعد آئے ڈاکٹر ریاض۔ میں ابھی دروازہ کھلواتا ہوں۔" آواز ابھری۔ پھر چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ریاض زور سے اچھلا۔ دروازہ کھولنے والا کمال نہیں تھا بلکہ وہ ایک بن مانس تھا جو اسے گھور رہا تھا۔

"یہ سب کیا چیز ہے کمال؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"ڈرو نہیں بھئی۔ بلا خوف چلے آؤ۔" اسپیکر سے ہنستی ہوئی آواز ابھری۔

ڈاکٹر ریاض ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ بن مانس نے اسے اشارہ کیا اور آگے آگے چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچا۔ بن مانس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ ریاض اندر داخل ہوا تو وہ دروازہ بند کر کے آگے چلا گیا۔

ڈاکٹر کمال اسے دیکھتے ہی اٹھا اور اس سے بغلگیر ہوا۔

"بڑے دنوں بعد شکل دکھائی یار۔ ایک تم ہی تو ہو جو اب تک دوستی نبھا رہے ہو اب تم نے بھی کترانا شروع کر دیا۔"

"نہیں بھائی بس ان دنوں مصروفیت ہی بہت رہی۔ شہر میں وبائی امراض پھیلے ہوئے تھے۔ صبح سے شام تک مریضوں میں گھرا رہتا ہوں۔ مگر پہلے تم اس بن مانس کے بارے میں بتاؤ۔"

"تم تو جانتے ہی ہو۔ مجھے جانوروں پر عجیب وغریب تجربات کرنے کا شوق ہے۔ بس ایک دن جنگل میں یہ بن مانس نظر آیا تو اسے بے ہوش کر کے لے آیا۔ اس کا تفصیلی چیک اپ اور معائنہ کرنے پر پتہ چلا کہ یہ بن مانس غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔" ڈاکٹر کمال نے بتایا۔

"کیا مطلب!" ڈاکٹر ریاض نے الجھن کے عالم میں پوچھا۔

"تمہیں تو پتہ ہے کہ بندر اور اس کی نسل کے جانور خاصے ذہین ہوتے ہیں۔ انسانوں جیسی حرکتیں کرنے کے ماہر ہوتے ہیں مگر یہ بن مانس عام جانور سے زیادہ ذہین ہے۔ ہر چیز کو فوراً (Follow) کرلیتا ہے! اسے میں نے چند دن میں اتنا سدھا لیا ہے کہ یہ عام آدمی کی طرح گھر کے سارے کام کرلیتا ہے۔"

"حیرت ہے' اتنے خطرناک جانور کو تم نے قابو میں کر رکھا ہے۔"

"اسے سدھانے اور قابو میں رکھنے کے لئے میں

نے ہپناٹزم سے بھی کام لیا ہے۔" ڈاکٹر کمال بولا "وہ ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم ہپناٹزم میں بھی ماہر ہو۔" ڈاکٹر ریاض نے کہا۔ "ہاں اور اب میں اس بن مانس پر ایک نیا تجربہ کروں گا اور اسے لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔"

"کیا!!" تمہارا دماغ کو نہیں چل گیا۔ بن مانس کو لکھنا پڑھنا سکھاؤ گے۔" ریاض نے اسے گھورا۔

"نہیں ریاض۔ تم جانتے ہو میں جو ٹھان لیتا ہوں اسے کر گزرتا ہوں۔ تم دیکھنا میں اس جنگلی جانور کو انسانوں کی طرح لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ میں اس کے دماغ میں مصنوعی ذہانت داخل کروں گا۔"

"مگر اتنی دردسری مول لینے کا فائدہ!" ریاض جھنجھلا کر بولا۔

"شوق کا کوئی مول نہیں۔" ڈاکٹر کمال مسکرایا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ ریاض نے دیکھا کہ بن مانس چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ریاض کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرائی تو نہ جانے کیوں خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ بن مانس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔

☆.....☆.....☆

ریاض کو ڈاکٹر کمال سے ملے قریباً" بیس روز گزر چکے تھے ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر کمال کے فون کی گھنٹی بجی۔ "ہیلو کمال! یہ میں ہوں ریاض۔"

"کیسے ہو ریاض۔ یار تم فون کیوں کر رہے ہو۔ ذرا یہاں آؤ تو میں تمہیں دکھاؤں کہ بن مانس نے پڑھنا سیکھ لیا ہے۔"

"کیا!! اتنی جلدی۔" ڈاکٹر ریاض حیران رہ گیا۔

"ہاں ایک تو وہ پہلے ہی بہت ذہین تھا پھر میں نے اس کے دماغ کے خلیوں میں تبدیلی کر ڈالی۔ اب تو وہ بالکل کمپیوٹر ہو گیا ہے۔ تم یقین نہیں کر سکتے وہ جو پڑھتا ہے فوراً" ذہن نشین کر لیتا ہے اور..... ٹوٹا پھوٹا بول بھی لیتا ہے۔" ڈاکٹر کمال کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔

"یہ ...یہ تو تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے کمال۔ تم بھی عجیب ہو بن مانس کو انسان بنا ڈالا۔"

"انسان تو ابھی میں اسے بناؤں گا۔" ڈاکٹر کمال نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"کیا مطلب!" ڈاکٹر ریاض نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ ڈاکٹر ریاض کہ میں اب اس بن مانس کا ڈی این اے (DNA) تبدیل کرنا چاہتا ہوں تم تو جانتے ہو کہ خلیے (Cell) کے مرکزے میں موجود ڈی این اے ہر جاندار کی شکل وصورت اور عادات کو کنٹرول کرتا ہے اگر اس میں تبدیلی کر دی جائے تو شکل و صورت بدلی جا سکتی ہے۔"

"تت.... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر ریاض نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

"میں اس کا ڈی این اے اس طرح تبدیل کروں گا کہ اس کے جسم کے بال ختم ہو جائیں اور اس کی شکل اور ہاتھ پیر انسانوں جیسے ہو جائیں۔ پھر پھر وہ بالکل انسان نظر آئے گا۔"

"کمال .... اس قسم کے خطرناک تجربے کو ذہن سے نکال دو۔ قانون قدرت میں تبدیلی مت کرو۔ جانور جانور ہے اور وہ جانور ہی رہے گا اسے سدھانا اور بات ہے مگر تم جو کچھ کر رہے ہو وہ کسی طرح ٹھیک نہیں اور پھر ان سب تجربات کا مقصد؟ ان سے کسی کو کیا فائدہ پہنچے گا..... میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کمال کہ اپنی ذہانت کو مفید کاموں میں لگاؤ۔ انسان کی بہتری کے لئے کام کرو۔ ان فضول قسم کے تجربوں سے باز آجاؤ کسی دن تم نقصان نہ اٹھا بیٹھو۔" ریاض پریشان ہو کر بولا۔

"یہ کیا تم نے نصیحتوں کا دفتر کھول دیا ہے۔ بھلا مجھے کیا نقصان پہنچے گا اور ذرا سوچو کہ اگر یہ بن مانس انسان بن گیا تو ساری دنیا میں میری دھوم مچ جائے گی۔"

"اف .... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ خیر میں تم سے پھر بات کروں گا فی الحال اس لئے فون کیا تھا کہ لندن میں ہونے والے سیمینار کا دعوت نامہ تمہیں ملا ہے یا نہیں۔"

"ہاں... اتفاق سے مجھے بھی ملا ہے۔"

"تو پھر تم بھی تیاری کرلو۔ ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔" ریاض نے کہا۔

"نہ بابا..... میں اپنا تجربہ درمیان میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ ویسے بھی مجھے ان سیمیناروں سے کوئی دلچسپی نہیں اور پھر یہ تو پورے پندرہ دن کا پروگرام ہے۔ اتنے عرصے میں نہ جانے کیا کچھ کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے کمال۔ تمہاری مرضی ..... میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔" ریاض تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"مم... مگر جانے سے پہلے ایک بار ضرور مل لو۔ جب تم بن مانس کو کتابیں پڑھتے اور بولتے دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

"ہاں.... کوشش کروں گا۔" ڈاکٹر ریاض بولا۔

مگر ڈاکٹر ریاض کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ یہ چار دن اس نے بہت مصروفیت کے عالم میں گزارے اور ٹھیک پانچویں روز وہ لندن روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

پندرہ روز مختلف سیمیناروں میں شرکت کرنے کے بعد ڈاکٹر ریاض نے چند دن اور لندن

میں مختلف کاموں میں گزارے اور بائیس روز کے بعد وطن واپس لوٹا۔ چند دن اس نے سیمیناروں سے متعلق مختلف رپورٹیں تیار کیں پھر جب فراغت کے چند لمحات ملے تو اسے ڈاکٹر کمال کا خیال آیا۔اس نے فوراً" ریسیور اٹھایا اور ڈاکٹر کمال کے نمبر ملانے لگا مگر کافی کوشش کے بعد بھی نمبر نہ ملا۔ آخر اس نے سوچا کہ خود ہی چلا جائے۔

"رات سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا۔" وہ کار میں بیٹھتا ہوا بڑبڑایا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ حبس ہو رہا تھا۔ یہ آثار کسی طوفان کی آمد کے تھے مگر ڈاکٹر ریاض کو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کس طوفان میں پھنسنے والا ہے۔ کار ایک بار پھر اسی شکستہ سڑک پر لڑکھڑاتی ہوئی جارہی تھی۔ جب وہ ڈاکٹر کمال کی رہائش گاہ پر پہنچا تو شام کا وقت تھا مگر بادل چھاجانے کی وجہ سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ وہ کار سے اترا تو پانی کا پہلا قطرہ کار کی ونڈ اسکرین پر گرا "کیا کمال اس بن مانس کو انسان بنانے میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔" اس نے گھنٹی بجاتے ہوئے سوچا۔

"کون .....؟" اسپیکر سے ایک بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

"میں ہوں ریاض..... تمہاری آواز کو کیا ہوا؟"

"میں ذرا نزلہ زکام کا شکار ہو گیا تھا۔ ابھی دروازہ کھلواتا ہوں۔" آواز ابھری اور ریاض کو پچھلی بار کا منظر یاد آگیا جب ایک بن مانس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ متجسس انداز میں دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اور پھر دروازہ کھلا اور .....ڈاکٹر ریاض نے حیرت سے دیکھا اس بار بھی دروازہ بن مانس نے ہی کھولا تھا مگر وہ کافی کمزور نظر آرہا تھا۔

تو کیا ڈاکٹر کمال کا تجربہ کامیاب نہیں ہو سکا اور بن مانس انسان نہیں بن سکا۔" اس نے حیرت سے سوچا اور اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کیوں اس خیال سے تسکین سی ہوئی۔

"آیئے۔" بن مانس کمزور سی آواز میں بولا۔ ڈاکٹر ریاض اسے بولتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی اور بن مانس کی نگاہیں ٹکرائیں مگر اس بار اسے بن مانس سے کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔

"آؤ ڈاکٹر ریاض ..... اور تم جاؤ اپنے کمرے میں خبردار جو باہر نکلے۔" ڈاکٹر کمال نے پیچھے کھڑے بن مانس سے کہا۔ بن مانس سہم سا گیا اور واپس مڑا۔ مڑتے مڑتے وہ لڑکھڑایا۔ اس نے ایک ہاتھ ریاض کے شانے پر رکھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"تم کیسے ہو کمال؟" ریاض صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ تم سناؤ۔" کمال کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ڈاکٹر ریاض نے اسے دیکھا۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کافی اچھی نظر آرہی تھی۔

"میں چند دن پہلے ہی لندن سے واپس آیا ہوں۔ یار تم تو بن مانس کو انسان بنانے کا تجربہ کررہے تھے۔"

"ہاں ..... مگر میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ یہ انسان بننے کے قابل نہیں اسے جانور ہی رہنا چاہئے۔" ڈاکٹر کمال نے ایک قہقہہ لگایا۔ ریاض نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ڈاکٹر کمال کی آنکھیں نہ جانے کس جذبے کے تحت چمک رہی تھیں۔ ریاض کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایک خوف کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔

"مم میں خوفزدہ کیوں ہوں؟" ریاض نے پریشان ہو کر سوچا۔

"کک ..... کمال ..... مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس تجربے کا خیال دل سے نکال دیا! آخر اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟"

"وجہ!! وجہ بڑی خوفناک ہے۔ تم ڈر جاؤ گے۔" ڈاکٹر کمال نے خوفناک انداز میں اسے گھورا اور ڈاکٹر ریاض کپکپا اٹھا۔ نہ جانے وہ کیا بات تھی جو اس کے ذہن میں آ آکر اسے پریشان کررہی تھی۔

"تم بیٹھو میں تمہارے لئے چائے لاتا ہوں۔" کمال اٹھ کھڑا ہوا۔

"مم ..... مگر یہ کام تو تم بن بانس سے کرواتے تھے۔"

"مجھے اس پر اعتبار نہیں۔" اس نے عجیب سی آواز میں کہا اور باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر ریاض سوچ میں گم ہوگیا۔ اسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"کہیں میں وہم کا شکار تو نہیں۔" اس نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کمال چائے لے کر آیا۔ دونوں نے خاموشی سے چائے پی۔

"مم ..... میرا خیال ہے میں اب چلتا ہوں۔ پھر ملیں گے۔" ریاض چائے پیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر آج تو تم نہیں جاسکتے۔" ڈاکٹر کمال بولا۔

"کیا مطلب!!" ڈاکٹر ریاض چونکا۔

"مطلب یہ کہ باہر تو دھواں دار بارش ہورہی ہے۔ اس موسم میں واپس جانا خطرناک ہے۔ سڑک تو پہلے ہی ٹوٹی ہوئی ہے اب تو زیر آب آچکی ہوگی۔ آج رات تم یہیں ٹھہر جاؤ۔"

"اوہ!" ریاض کے منہ سے نکلا۔ یہ سن کر وہ اور پریشان ہوگیا حالانکہ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار یہاں ٹھہر چکا تھا۔

"تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ رات کے

کھانے پر ملاقات ہوگی۔ مجھے ذرا کام ہے۔"
کمال یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر ریاض بھی الجھے ہوئے انداز میں اٹھا اور اس کمرے کی طرف چلا جہاں وہ ہمیشہ ٹھہرتا تھا۔ باہر واقعی زور دار انداز میں بارش ہو رہی تھی اور طوفانی جھکڑ بھی چل رہے تھے۔ آدھی رات کا سماں ہو رہا تھا۔ کمرے میں آکر وہ بستر پر نیم دراز ہو گیا اور غور کرنے لگا کہ گڑ بڑ کہاں پر ہے۔ وہ کمال کے رویے پر غور کرنے لگا۔ پھر اچانک اسے بن مانس کا خیال آیا۔ وہ کمال سے خوفزدہ کیوں تھا؟ بے خیالی میں اس کا ہاتھ جیب میں گیا تو چونکا اور اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر بڑا بڑا سا لکھا تھا۔ "میری مدد کرو۔" یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بہت جلدی میں لکھا ہے۔

"یہ .....یہ کاغذ کس نے میری جیب میں ڈالا۔ وہ حیرت سے بڑبڑایا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ کمرے سے نکلتے وقت بن مانس اس سے ٹکرایا تھا تو کیا یہ کاغذ اس نے جیب میں ڈالا تھا مگر کیوں؟ پھر ایک اور چیز اسے یاد آئی اور وہ چونک اٹھا اسے سمجھ آگیا کہ وہ خوفزدہ کیوں ہے۔ "یہ .....یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ وہ الجھن کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ دوسرے سرے پر بنی تجربہ گاہ سے اسے کمال نکلتا نظر آیا وہ فوراً" ایک طرف ہو گیا اور پھر کمال کا پیچھا کرنے لگا۔ کمال راہداری سے ہوتا ہوا ایک موڑ مڑا اور مڑتے ہی پہلے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ریاض تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ سوچا پھر دروازے سے ذرا فاصلے پر بنی کھڑکی تک آیا اور ڈرتے ڈرتے جھری میں سے اندر جھانکا۔

کمال کمرے کے درمیان میں کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی اور سامنے چارپائی پر کوئی بیٹھا تھا۔ ریاض کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا ..... وہ تو بن مانس تھا مگر اس کے جسم پر کوئی بال نہ تھا اور چہرہ بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔

"مجھ پر رحم کرو ..... آخر یہ سب کر کے تمہیں کیا مل رہا ہے؟ بن مانس روتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خوشی ..... اطمینان ..... تسکین ..... ہاہاہا ..... لو تیار ہو جاؤ۔" کمال آگے بڑھا اور بن مانس کا بازو پکڑ لیا۔ بن مانس کانپ رہا تھا۔ پھر کمال نے سرنج کی سوئی اس کے بازو میں داخل کر دی۔ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بن مانس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور ..... اور ..... ریاض نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ بن مانس کے سارے جسم پر بال نکل رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد اس کے پورے جسم پر پہلے کی طرح بال ہی بال تھے۔

ریاض کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔ یہ سب کیا تھا۔ کمال تو بن مانس کے بال صاف کر کے، اس کا ڈی این اے تبدیل کر کے اسے انسان بنانا چاہ رہا تھا مگر یہاں الٹا ہی معاملہ تھا۔ بن مانس کے بال جو نہ جانے کس طرح غائب ہو گئے تھے۔ کمال کے انجکشن کے ذریعے وہ دوبارہ اُگ آئے تھے۔

اسی وقت کمال مڑا اور ریاض تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا۔ اب اس کی پریشانی اور خوف میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ وہ خوفزدہ انداز میں مڑا۔ کمال اسے کھانے کے لئے بلانے آیا تھا۔

کھانے پر اِکا دُکا ہی بات ہوئی۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ پھر وہ سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ریاض کمرے کا دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔ اور ان تمام واقعات پر غور کرنے لگا۔ ان سب باتوں کا جو نتیجہ نکل رہا تھا وہ بہت خوفناک تھا۔ اور اس کا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ کوئی درمیانی کڑی غائب تھی۔ پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

بجلی زور دار انداز میں کڑکی تو ریاض کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے سرہانے کوئی کھڑا ہے۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا اور وہ شخص ایک ہیولے کی طرح نظر آرہا تھا۔ ریاض نے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔ اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ خوف کی ایک لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ اسی وقت ہیولا اس پر جھکا۔ قریب تھا کہ ریاض بستر سے چھلانگ لگا دیتا مگر اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ دونوں ہی چونکے۔

"اتنی رات کو اس موسم میں کون آگیا۔" کمرے میں ڈاکٹر کمال کی غراہٹ گونجی۔ اس نے سرنج میز پر رکھی اور باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی ریاض اٹھ بیٹھا اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اس نے سرنج اٹھا کر دیکھی اس میں بے رنگ مائع تھا۔ ریاض نے فوراً" اسے دبا کر سارا محلول گرا دیا اور میز پر رکھے گلاس میں سے سرنج میں پانی بھر کر اسے رکھ دیا۔ اسی وقت قدموں کی آواز آئی۔ اس نے فوراً" لیمپ بجھایا اور لیٹ گیا۔ دروازے کے قریب کسی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔

"میں کل سے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ جب موسم زیادہ ہی خراب ہو گیا تو مجھے نکلنا پڑا اور میں نے سوچا کہ رات اس عمارت میں گزار لوں۔" کوئی کہہ رہا تھا۔

"آپ نے اچھا کیا..... آپ اطمینان سے یہاں رات بسر کر سکتے ہیں۔" کمال کی دور ہوتی

ہوئی آواز آئی "تو گویا کوئی شکاری یہاں رات گزارنے آیا ہے۔" اس نے سوچا' تھوڑی ہی دیر بعد پھر کمرے کا دروازہ کھلا اور کمال اندر داخل ہوا اس نے سرنج اٹھائی اور تیزی سے ریاض کے بازو میں داخل کردی اس نے آستین اوپر کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ تکلیف سے ریاض کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ کمال کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور بولا۔

"مائی ڈیئر ریاض اب کل تک کے لئے بے ہوش ہوجاؤ۔ کل سے تم ایک نئی زندگی کا سفر شروع کرو گے۔" ریاض نے فوراً" بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی اور آنکھیں بند کرلیں۔

کمال کمرے سے نکلا تو وہ بھی اس کے پیچھے نکلا۔ کمال تین کمرے چھوڑ کر چوتھے کمرے میں داخل ہوا ریاض تیزی سے آگے بڑھا اور دروازے کو ذرا سا دھکیلا اور جھری میں سے اندر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کمال کے ہاتھ میں ایک اور سرنج تھی اور سامنے بستر پر کوئی سو رہا تھا۔

"شش ..... شاید وہ وہی شکاری ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت کمال جھکا اور سرنج شکاری کے بازو میں داخل کردی۔ شکاری کی آنکھیں کھل گئیں۔

"یہ ..... یہ ..... کیا کر ....." اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

"ہاہاہا ..... پہلے میں تمہارا ہی کام تمام کرتا ہوں۔ اس ریاض کے بچے کو بعد میں دیکھوں گا۔" کمال مڑا تو ریاض فوراً" پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ اس کا پیچھا کرنے لگا۔ کمال اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہوچکا تھا۔ جو کچھ کمال کرنا چاہتا تھا اس کا کچھ کچھ اندازہ اسے ہوچکا تھا۔ وہ فوراً" بن مانس والے کمرے کی طرف بڑھا اس نے دیکھا کہ بن مانس چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ ریاض نے اس کا کندھا ہلایا تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ ریاض نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ بن مانس لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ اس سے چلا نہیں جارہا تھا۔ ریاض اسے سہارا دے کر باہر نکلا۔ اسی وقت کمال تجربہ گاہ سے نکلتا نظر آیا۔ دونوں فوراً" دبک گئے۔ پھر سر باہر نکال کر دیکھا۔ ریاض بن مانس کو لے کر شکاری کے کمرے تک پہنچا اور دروازے کی جھری سے جھانکا۔ کمال شکاری کے بازو میں انجکشن لگا رہا تھا۔ ریاض نے حیرت اور خوف سے دیکھا کہ شکاری کے نقوش بدلتے جارہے تھے پھر کمال نے ایک انجکشن اور لگایا اور تھوڑی دیر بعد شکاری کے جسم پر بال نکلنے لگے۔ اسی وقت بن مانس نے اسے اشارہ کیا۔ دونوں پیچھے ہٹے۔ بن مانس نے اس کے کان میں کچھ

کہا۔ ریاض نے سرہلایا۔ اور بن مانس کو سہارا دے کر تجربہ گاہ کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ بن مانس تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"وہ رات کو مجھے کمزوری کے انجکشن لگا دیتا ہے۔ میں چلنے پھرنے کا قابل نہیں رہتا۔" بن مانس بولا۔ "ہوں۔" ریاض نے سرہلایا اور جلدی جلدی الماری میں موجود داووں کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے ایک انجکشن تیار کیا۔ "یہ طاقت کا انجکشن ہے۔" ریاض بولا اور اس کی طرف بڑھا۔

اسی وقت باہر سے آواز ابھری۔ "اندر کون ہے؟ دروازہ کس نے بند کیا ہے؟"

"اوہ .....وہ آگیا جلدی کرو۔" ریاض گھبرا کر بولا اور انجکشن اس کے بازو میں لگا دیا۔

"یہ ..... یہ تم ہو ریاض۔ تم ہوش میں ہو..... اوہ۔ دروازہ کھول دو.... ورنہ میں توڑ دوں گا۔ اور تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔ باہر سے کمال دھاڑا۔

"اب جو کرنا ہے تمہیں کرنا ہے۔" ریاض بن مانس سے بولا۔

"مصیبت یہ ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کچھ نہیں۔ اس نے ہپناٹزم کے ذریعے دواؤں کے فارمولے میرے ذہن سے صاف کر دیے ہیں..." بن مانس بولا۔

"اوہ ....." اسی وقت دروازے کو زور دار دھکا لگا۔

"اب ..... اب کیا ہوگا۔" ریاض گھبرا گیا۔ دروازے کو ایک دھکا اور لگا اور وہ ٹوٹ کر اندر آگرا دونوں خوفزدہ ہوگئے۔ کمال خونخوار انداز میں انہیں گھورتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔

"نن .... نہیں .... میری محنت کا تم مجھے یہ صلہ دے رہے ہو۔ میں نے تمہیں بن مانس سے انسان بنایا اور..... اور تم نے مجھے ہی....." بن مانس کی آواز بھرا گئی۔

"کمال کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر مجھے یہی شک ہوا تھا کہ پچھلی بار تو بن مانس کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھی۔ پھر مجھ پر یہ خوفناک راز کھل گیا کہ بن مانس دراصل ڈاکٹر کمال ہے اور اصل بن مانس نے ڈاکٹر کمال کا روپ دھار لیا ہے۔ مگر یہ ہوا کیسے؟" ریاض بولا "میں نے اس میں مصنوعی ذہانت داخل کی یہ کمپیوٹر کی طرح ذہین ہوگیا اور پھر میں نے اس کا ڈی این اے بدل کر اسے انسان بنایا تو اس نے مجھ ہی پر قابو پالیا۔" بن مانس یعنی ڈاکٹر کمال بولا۔

"مگر کیسے ہے؟"

دراصل یہ چوری چھپے لائبریری میں ہپناٹزم کی کتابیں پڑھنے لگا اور اس میں بہت ماہر ہوگیا

شاید جانوروں میں جبلی طور پر ہپناٹزم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں پھر اس نے ہپناٹزم کر کے مجھ سے ہی دوائیں تیار کروائیں جن کے ذریعے میرا ڈی این اے تبدیل کر کے مجھے بن مانس بنادیا۔"

ہاں جب تم جانوروں پر ظلم کرسکتے ہو عجیب عجیب تجربوں کے ذریعے تو پھر میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اب چونکہ تم میرا راز جان گئے ہو اس لئے مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔" کمال کے روپ میں بن مانس ان کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرنج باہر نکالی۔

"تمہیں بھی جانور بننا ہوگا۔ مسٹر ریاض۔" وہ بولا۔

"ایک بات مجھے سمجھ نہیں آئی کمال۔" ریاض پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا؟" کمال نے پریشان آواز میں پوچھا۔

"جب یہ بن مانس تمہیں بن مانس بنا چکا تھا تو پھر آج شام تمہارے بال کہاں غائب ہوگئے تھے جو ایک انجکشن لگانے سے پھر اگ آئے تھے۔"

"دراصل مجھے ڈی این اے تبدیل کرنے میں مکمل کامیابی نہیں ہوئی۔ اس انجکشن کا اثر صرف چوبیس گھنٹے رہتا ہے۔ پھر دوبارہ انجکشن لگانا پڑتا ہے۔" کمال نے بتایا۔

"اوہ ..... تو یہ بات ہے۔" ریاض کے منہ سے نکلا اور ساتھ ہی بن مانس نے اس پر چھلانگ لگادی۔ ریاض نے بچنے کی بھرپور کوشش کی مگر بن مانس ٹھیک اس پر آگرا اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا پھر اس نے تیزی سے انجکشن والا ہاتھ اس کے بازو کی طرف بڑھایا۔ ریاض نے بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو کلائی کے پاس سے پکڑلیا اور اسے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمال یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک گھونسا بن مانس کے سر پر رسید کیا مگر اس پر خاک بھی اثر نہ ہوا کمال نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بن مانس کے گلے میں ڈالیں اور اسے پیچھے کھینچنے لگا۔ بن مانس نے جھلا کر ایک گھونسا کمال کے پیٹ میں دے مارا۔ وہ دوہرا ہو کر گر پڑا مگر اس دوران ریاض کو موقع مل گیا اور اس نے بن مانس کو الٹ دیا اور تیزی سے اٹھ کر بڑی سی میز کے دوسری طرف ہوگیا۔ بن مانس خونخوار انداز میں اٹھا اور پہلے ایک زوردار ٹھوکر کمال کے سر پر رسید کی۔ وہ بے سدھ ہوگیا۔ اب وہ میز کی طرف بڑھا اور اس کے اوپر چڑھ گیا۔ کئی بوتلیں اور ٹیوبیں ٹوٹ گئیں۔ ریاض بوکھلا کر بھاگا اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ خوف کے عالم میں بھاگا جارہا تھا۔ بن مانس اس کے پیچھے تھا بھاگتا بھاگتا وہ عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ اس

طرح وہ بن مانس سے نہیں بچ سکے گا۔ اس نے جنگل کی طرف دوڑ لگادی۔

بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی مگر اس کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ گہری تاریکی میں دو سائے آگے پیچھے دوڑتے جا رہے تھے۔ ریاض جنگل میں گھستے ہی ایک بڑے سے درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ بن مانس بھی دوڑتا ہوا پہنچا۔ پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔ ریاض نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

"تم کب تک چھپے رہو گے ریاض.... اس جنگل کا ایک ایک درخت میرا دیکھا بھالا ہے۔ جلد ہی تم میرے قابو میں آجاؤ گے۔" بن مانس دھاڑا اور جنگل میں گھس گیا۔ ریاض درخت پر درخت بدلنے لگا۔

☆....☆.....☆

ڈاکٹر کمال آہستہ آہستہ اٹھا۔ اس کا سر بُری طرح دکھ رہا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ میز کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے میز پر رکھی دواؤں کی شیشیوں اور دوسرے آلات کو دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ بن مانس نے ہپناٹزم سے کام لے کر اس کے دماغ سے دواؤں کے نام اور فارمولے بھلا دیئے تھے مگر اب اسے دوائیں دیکھ کر ان کے نام یاد آنے لگے۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ شش۔ شاید یہ میرے سر پر لگنے والی چوٹ کا نتیجہ ہے کہ میری یادداشت واپس آگئی ہے۔" کمال خوش ہو گیا۔ بن مانس کی ٹھوکر اس کے لئے بہت بابرکت ثابت ہوئی تھی۔ اس نے فوراً الماری سے چند چیزیں نکالیں اور جلد ہی ایک محلول تیار کر کے سرنج میں بھرا پھر اس نے سرنج اپنے بائیں بازو کی ایک رگ میں داخل کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جسم سے بال غائب ہونے لگے۔ پھر اس کے چہرے کے نقوش بدلنے لگے۔ ہاتھ پیر سیدھے ہونے لگے اور جلدی ہی وہ دوبارہ ڈاکٹر کمال کے روپ میں آچکا تھا۔ اس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔ مگر پھر اچانک اسے اس شکاری کا خیال آیا اور پھر وہ ایک انجکشن اور تیار کرنے لگا۔

☆ .... ☆ ..... ☆

بن مانس اس درخت کے قریب پہنچنے والا تھا۔ ریاض یہ درخت بھی بدلنے کے لئے پیچھے ہٹا تو اس کے پاؤں کے نیچے لکڑی کا ایک ٹکڑا آگیا۔ وہ اس میں الجھ کر گر پڑا۔ اسی وقت زور سے بجلی چمکی اور بن مانس نے اسے دیکھ لیا ایک لمحے کی چمک میں ریاض نے اس کی خوفناک آنکھوں میں چمک دیکھی۔ اس نے تیزی سے اٹھنے کوشش کی مگر بن مانس اس کے سر پر پہنچ چکا تھا وہ اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ ایک خوفناک دھاڑ سنائی

دی۔ ریاض لرز کر رہ گیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک موٹا شیر کھڑا انہیں خونخوار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ ریاض کے ہوش اڑ گئے۔ یک نہ شد دو شد۔ وہ دو طرف سے گھر گیا تھا۔ اسی وقت بن مانس خوفناک انداز میں غرایا۔ انسانی روپ میں ہونے کے باوجود اس وقت وہ پورا درندہ نظر آرہا تھا۔ پھر ایک دم ہی شیر نے چھلانگ لگادی۔ ریاض نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ مگر شیر نے بن مانس پر چھلانگ لگائی تھی۔ شاید گرے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا اس کی غیرت نے گوارہ نہیں کیا تھا۔

دونوں درندے گتھم گتھا ہوچکے تھے۔ ریاض کانپتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور ان سے فاصلے پر کھڑا ہو کر یہ حیرت انگیز لڑائی دیکھنے لگا۔

بن مانس نے غصے میں سرنج کی سوئی شیر کے پیٹ میں بھونک دی۔ شیر دھاڑا اور اس کے چہرے پر پنجہ مارا۔ اس کا چہرا خون آلود ہوگیا مگر فوراً" ہی اس نے شیر کو اچھال پھینکا۔ اس دوران ریاض کو دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کمال اور شکاری دوڑے آرہے تھے۔ شکاری کے ہاتھوں میں اس کی بندوق بھی تھی۔ دونوں کو اصل روپ میں دیکھ کر ریاض کو حیرت ہوئی مگر فی الحال حیرت ظاہر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے یہاں پہنچے اور پھر ان کی آنکھیں بھی حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

شیر نے ایک بار پھر بن مانس پر چھلانگ لگائی مگر اس بار وہ جھکائی دے کر بچ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے سے خون صاف کیا۔ ادھر شیر نے فوراً" ہی دوبارہ چھلانگ لگادی تھی بن مانس خون صاف کرنے کے چکر میں دیکھ نہ سکا اور دھڑام سے گرا۔ شیر کا پنجہ اس کے سینے پر لگا اور دل کے مقام پر ایک لمبا سا شگاف پڑ گیا۔ بن مانس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ شیر قریب ہی کھڑا غرا رہا تھا۔ پھر اس کا تڑپنا بند ہوگیا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

فوراً" ہی اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ ہاتھ بھی شکل بدلنے لگے اور پھر پورے جسم پر بال نکلنے لگے۔ شاید مرتے ہی دوا کا اثر ختم ہوگیا تھا۔ شیر حیرت سے اسے گھور رہا تھا۔ اب وہ پورا بن مانس نظر آرہا تھا۔

"اف خدا۔ یہ تھا اس کا انجام۔" ریاض کے منہ سے نکلا۔ اور شیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ غراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ شکاری نے فوراً" بندوق سیدھی کرلی ادھر شیر نے چھلانگ لگائی ادھر بندوق نے شعلہ اگلا۔ گولی عین اس کے سر پر لگی اور وہ بھی گر کر تڑپنے لگا۔

ریاض کو اس کے مرنے کا افسوس سا ہوا کیونکہ وہ اس کا محسن تھا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد شیر بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

"تم نے دیکھ لیا کمال۔ اپنے تجربے کا انجام۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی ذہانت کو مفید کاموں میں استعمال کرو۔ قانونِ قدرت میں دخل نہ دو۔ اف خدا اگر عین وقت پر یہ شیر یہاں نہ پہنچتا تو ..... تو شاید میں بھی بن مانس بن چکا ہوتا۔" ریاض نے خوف سے جھرجھری لی۔

"ہاں ریاض، تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے چند دن بن مانس بن کر سبق مل گیا ہے۔ اس بن مانس کو میں یادگار کے طور پر ساتھ رکھوں گا۔" ڈاکٹر کمال نے کہا۔

پھر وہ دونوں لاشوں کو عمارت میں لے آئے۔ شیر کو شکاری لے کر جانا چاہتا تھا لہٰذا وہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ بارش بند ہو چکی تھی اور ہنگاموں سے بھری طوفانی رات کا اختتام ہو رہا تھا۔

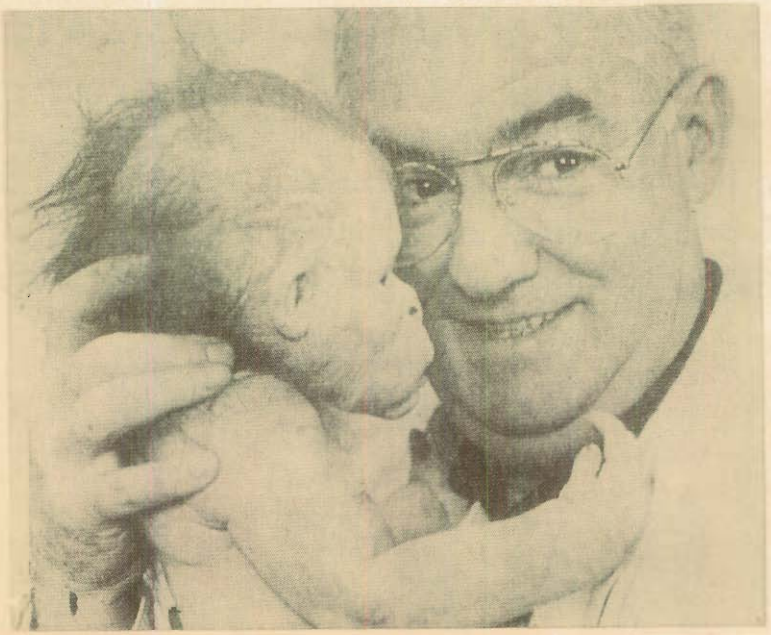

چڑیلوں کا شکاری

ترجمہ: سلیم احمد صدیقی
انتخاب: شیخ عبدالحمید عابد

انگریز ایک مہذب اور ترقی یافتہ قوم ہے اور اسے اس بات پر بہت فخر ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو انگریز جاہل اور وہمی سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ آج سے صرف تین سو سال پہلے تک یہی انگریز قوم خود بڑی جاہل اور وہمی تھی۔ جنوں بھوتوں، بد روحوں اور چڑیلوں کو یہ لوگ نہ صرف مانتے تھے، بلکہ ان کے تصور سے خوف کھاتے تھے۔

کسی ویران علاقے میں کسی تنہا جھیل کے کنارے، کسی قبرستان میں کوئی شخص رات کے وقت اکیلا جاتے ڈرتا تھا۔ بعض اوقات کالے کتوں یا کالی بلیوں کو بد روح سمجھ لیا جاتا تھا اور ان کو خوف، دہشت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

بہت سے لوگ بوڑھی اور بدشکل عورتوں کو چڑیل سمجھتے تھے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ یہ اقرار کرلیں کہ وہ چڑیل ہیں۔ جو عورتیں یہ مان لیتی تھیں کہ وہ چڑیلیں ہیں۔ انہیں مار دیا جاتا تھا۔

۱۶۴۵ء میں انگلستان کے ایک علاقے مشرقی اینگلیا میں چڑیلوں کے خلاف ایک زبردست مہم چل رہی تھی اور اس مہم کا لیڈر تھا میتھو ہوپ کنز۔

ہوپ کنز کا کام کیا تھا؟ گاؤں گاؤں، شہر شہر پھرنا اور چڑیلیں تلاش کرنا۔ وہ اپنے ساتھ ایک چیلا "جان سٹرن" رکھتا تھا۔ وہ ایسی عورتوں کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے جنہیں چڑیل سمجھا

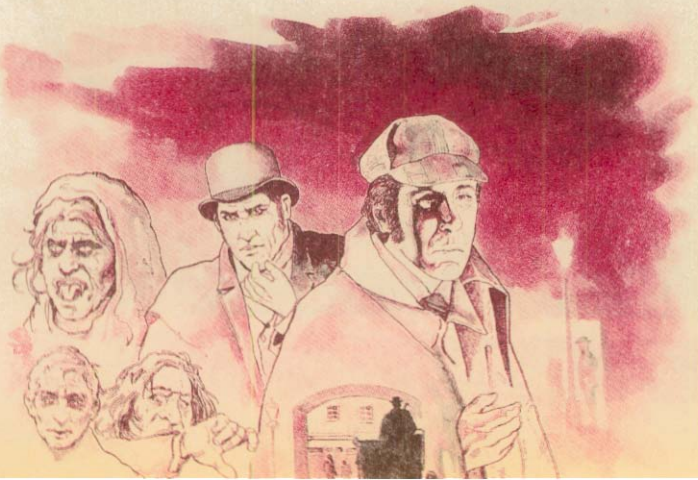

جاسکتا ہو۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ علاقے کے کسی آدمی کی کسی عورت کے ساتھ دشمنی ہوتی۔ وہ ان سے کہتا کہ یہ عورت چڑیل ہے اور وہ اس بے چاری کو پکڑ لیتے۔

چڑیل ہونے کے لئے بس اتنا کافی تھا کہ کسی عورت کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہوں یا اس پر تل یا مسا ہو یا زخم یا چوٹ کا نشان۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی بے چاری عورت کو چڑیل بنانے کے لئے کافی تھی اور گرو اور چیلے کو ہر بستی اور گاؤں پر چند ایسی عورتیں مل ہی جاتی تھیں۔

جب کسی عورت کو چڑیل ہونے کے شبہ میں پکڑ لیا جاتا تھا تو گرو اور چیلا اسے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ واقعی چڑیل ہے یا نہیں ایک موقع دیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے ہوپ کنز عجیب عجیب طریقے استعمال کرتا تھا۔ کسی عورت کے چہرے پر تل یا مسا ہوتا تو اس میں سوئی چبھوئی جاتی تھی۔ اگر اس میں سے خون نکل آتا تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ عورت چڑیل نہیں ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے تل یا مسّے میں سے خون نہ نکلتا تو اسے چڑیل قرار دے دیا جاتا تھا اور چڑیلوں کی سزا موت تھی۔

اس کے علاوہ چڑیلوں کے لئے ایک اور امتحان بھی تھا اور یہ امتحان بڑا خوف ناک تھا۔ جس عورت پر چڑیل ہونے کا شبہ ہوتا اسے پانی کے تالاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔ وہ ڈوبنے لگتی تو اسے انسان سمجھا جاتا تھا اور اگر وہ تیرنے لگتی تو سمجھا جاتا کہ وہ چڑیل ہے۔

اسی طرح کا ایک اور طریقہ یہ تھا کہ جس عورت پر چڑیل ہونے کا شبہ ہوتا اسے انجیل کی ایک دعا پڑھنے کے لئے کہا جاتا تھا اکثر عورتیں خوف کی وجہ سے یہ دعا بھول جاتی تھیں اور اس پر انہیں چڑیل سمجھ لیا جاتا تھا۔

ہوپ کنز نے ایک اور طریقہ بھی ایجاد کیا تھا وہ مشکوک عورت کو ایک کمرے میں بند کر دیتا تھا۔ اس کے بعد اس کا چیلا اس کمرے میں جاتا اور وہاں مکھیوں کو مارنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مرجاتیں تو عورت چھوڑ دی جاتی اور اگر نہ مرتیں تو عورت کو چڑیل سمجھا جاتا تھا۔

ہوپ کنز پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا۔ اس کی وکالت نہ چلی تو اس نے چڑیلوں کا شکار کرنا شروع کر دیا اور یہ کام اسے بہت راس آیا۔ وہ ایک چڑیل پکڑنے کی فیس بیس شلنگ لیا کرتا تھا۔ جو آج سے تین سو سال پہلے بڑی معقول رقم تھی۔

چڑیلوں کا شکاری سارے انگلستان میں مشہور ہو گیا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ اس نے سب سے پہلے قصبے میں سے ۲۹ چڑیلیں پکڑی تھیں اور ان سب چڑیلوں کو مار ڈالنے کے بعد ہی اسے

یہ خیال آیا تھا کہ اسے وکالت سے زیادہ آمدنی اس پیشے سے ہوگی۔ چنانچہ وہ وکالت چھوڑ کر چڑیلوں کے شکار میں مصروف ہوگیا۔

ایک اور قصبے الیسکس میں اس نے ساٹھ چڑیلیں پکڑی تھیں اور اسی طرح قصبے قصبے اور بستی بستی پھر کر چڑیلیں پکڑتا رہتا تھا۔ اس نے دو شخص ایسے پکڑے جن سے اس کی شہرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ ایک بوڑھی فقیرنی الزبتھ کلارک، جس کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ ہوپ کنز نے اسے چڑیل ثابت کیا۔ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں میز پر لٹا دیا گیا اور اس پر اتنا زیادہ ظلم کیا گیا کہ وہ چلّا چلّا کر کہنے لگی "ہاں! میں چڑیل ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک لنگڑے کتے، ایک کالی بلی، ایک بیل اور ایک خرگوش کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے چیلے ہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ اس کے ان چیلوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہوپ کنز کا دوسرا بڑا شکار برانڈاسٹن کا ایک بوڑھا پادری تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں۔ ہوپ کنز نے اسے بھی بھوت ہونے کے الزام میں پکڑ لیا۔ اس بے چارے کو اتنی تکلیفیں پہنچائی گئیں کہ اس نے زندگی سے موت کو بہتر سمجھا اور چیخ چیخ کر اپنے بھوت ہونے کا اقرار کر لیا۔ اس نے یہ بھی مان لیا کہ اس کے دو چیلے ہیں۔ جن میں سے ایک کو اس نے سمندر میں ایک جہاز ڈبونے کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے اس اقرار کے بعد اسے فرام لنھگم نامی جگہ پر پھانسی دے دی گئی۔

ہوپ کنز ان دو شکاروں کے بعد اور زیادہ مشہور ہوگیا اور جگہ جگہ اسے بڑے شوق سے بلایا جانے لگا وہ دھڑا دھڑ چڑیلیں پکڑتا رہا اور بے شمار بے گناہ عورتوں اور مردوں کو مرواتا رہا اور آخر ایک دن اسے بھی بھوت بنا کر مار دیا گیا۔

ہنٹنگ ڈن شائر کے علاقے میں گریٹ اسٹائن کے پادری جان گال نے لوگوں سے کہا کہ دراصل ہوپ کنز خود بھی بھوت ہے۔ اگر وہ بھوت نہ ہوتا تو چڑیلیں اس کے سامنے چڑیل ہونے کا اقرار نہ کرتیں۔ وہ کافی دنوں تک لوگوں کو سمجھاتا رہا اور جب لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تو انہوں نے ہوپ کنز کو پکڑ لیا اور اسے بھوت ثابت کرنے کے لئے اسی کے بتائے ہوئے ایک طریقے پر عمل کیا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے پانی میں ڈال دیا گیا۔ جب وہ ڈوبنے لگا تو اسے پھانسی دے دی گئی۔

یہ ہے ان انگریزوں کی جہالت کی ایک جھلک جو آج بہت مہذب اور ترقی یافتہ قوم کہلاتے ہیں۔

کل کے بھیڑیے آج کے ہیرو..

سرکس کا مالک
رابرٹ کیمپا اور اس کی بیوی
بھیڑیا برادران کے ہمراہ

لوگ انہیں "بھیڑیا برادران" کہا کرتے تھے کیونکہ جب دونوں بھائی پیدا ہوئے تو ان کے جسم کے علاوہ چہرہ بھی بالوں سے بھرا ہوا تھا اور اسی لئے دیکھنے میں یہ بھیڑیے لگتے تھے۔ ان میں ایک کا نام وکٹر اور دوسرے کا نام گیبریل گومیز ہے۔ کافی عرصے تک دونوں بھائی لوگوں کے طنز اور ہنسی مذاق کا نشانہ بنتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی شکل کو غیر معمولی پا کر ایک سرکس میں انہیں ملازمت مل گئی۔ ملازمت ملتے ہی دونوں بھائیوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ کہاں تو انہیں دیکھ کر لوگ سیٹیاں بجاتے اور آوازیں کستے تھے لیکن سرکس میں تماشائیوں کے درمیان آتے ہی لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔ جیسا کہ بعد میں ۱۳ سالہ وکٹر نے اعتراف کیا کہ

"کل تک ہم لوگوں کے لئے ایک خوفناک عجوبہ ہوتے تھے اور آج ہم ان کے ہیرو ہیں۔"

"اس لئے کہ اب ہم فن کار ہیں۔" ۱۷ سالہ گیبریل نے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں اب بھی کسی خوفناک بھیڑیے کی ہی طرح لگتے ہیں لیکن جب سے سرکس کے مالک رابرٹ کیمپا نے انہیں تربیت دی ہے، انہیں لوگوں کو خوش کرنا آگیا ہے۔

موت سے پنجہ آزمائی کرنے والا پائلٹ

رخشندہ خالد

پائلٹ
لفٹیننٹ
کرنل
بڈ ہالینڈ

آخری لمحات - طیارہ کنٹرول ٹاور کے گرد چکر کاٹتے ہوئے

طیارہ بے قابو ہوکر زمین کی طرف آرہا ہے۔

زمین سے ٹکرانے کا منظر - ایک زوردار دھماکہ آگ اور تباہی

ایک خوفناک، جوشیلے اور غیر محتاط پائلٹ کے جہاز کی تباہی کا منظر ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل بڈ ہالینڈ کی شہرت شروع ہی سے ایک ماہر لیکن غیر محتاط پائلٹ کی رہی تھی۔ وہ اپنی نشست سنبھالتے ہی جذباتی ہوجایا کرتا تھا اور اسی جذباتیت اور جوشیلے پن میں اس کا طیارہ قابو سے باہر ہوجاتا تھا۔ اس نے ہوابازی کا شاید ہی کوئی قانون ایسا ہو جسے نہ توڑا ہو۔ وہ خوش قسمتی سے ہر بار حادثے سے بچ جایا کرتا تھا۔ لیکن اس دن اسے ہوابازی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جو لوگ بڈ ہالینڈ کی طبیعت سے واقف تھے، وہ اس کی بیوی اور بچے کو اس مظاہرے میں شرکت سے روکنا چاہتے تھے اور یہ لوگ بالکل صحیح سوچ رہے تھے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کرنل بڈ کے ساتھ تین اور افسران بھی تھے۔

طیارہ ہوا میں اڑا، اس نے تیزی سے رن وے کے کنٹرول ٹاور کے گرد چکر لگانے کی کوشش کی۔ اس کی رفتار ۲۷۰ میل فی گھنٹہ تھی۔ چکر کاٹتے ہوئے طیارہ بے قابو ہوگیا اور سیدھا زمین سے آٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ چشم زدن میں طیارے میں آگ لگ گئی۔ کرنل بڈ سمیت تینوں افسران ہلاک ہوگئے۔ بے چارے بدقسمت افسران نہ جانے کیسے کرنل بڈ کے ساتھ پرواز کے لئے تیار ہوگئے ورنہ جونیئر افسران کی تو اس کے ہمراہ پرواز کرنے کے خیال سے ہی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ بھلا ایسی مہم جوئی کا کیا فائدہ جو اپنے ساتھ دوسروں کی بھی جان لے لے۔

خوف کی قید

اشتیاق احمد

"کیا ہوا ریاض..... گاڑی کیوں روک دی۔" میں نے چونک کر کہا۔

"ایک ٹرک بہت بے ہودہ طریقے سے آیا تھا سر..... مجھے گاڑی سڑک سے نیچے اتارنا پڑی..... لیکن اس طرف پانی کھڑا ہے..... زمین نرم ہونے کی بنا پر دائیں طرف کے دونوں ٹائر دھنس گئے ہیں..... اب دھکا لگانا پڑے گا۔"

"اور وقت کیا ہوا ہے؟"

"جی..... رات کے بارہ بج رہے ہیں۔"

"اور ریاض چاروں طرف گھنگھور تاریکی ہے..... نہ سامنے سے کوئی گاڑی آتی نظر آرہی ہے، نہ پیچھے سے..... اس قدر تاریکی میں کیا ہم لوگ دروازے کھول کر نیچے اتریں..... اگر کوئی چور ڈاکو آ گئے تو؟"

"مجبوری ہے سر..... دھکا تو لگانا پڑے گا۔"

"اچھا بھائی..... لگوالو تم بھی دھکا..... نوید، توحید،

تم بھی اترو، میں بھی اترتا ہوں.... باقی بچے اور عورتیں بیٹھے رہیں ..... اس غضب کی تاریکی میں اترنا خطرناک ہے..... یہاں سانپ وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں..... دائیں طرف بھی گھنا جنگل ہے اور بائیں طرف بھی..... اور دائیں طرف تو پانی بھی ہے...پانی میں سے کوئی چیز بھی رینگ کر اوپر آسکتی ہے.....“

”ہم.... ہم بھی اتریں گے ابو؟“ توحید نے کانپ کر کہا۔

”بھئی اب میں اکیلا تو دھکا لگانے سے رہا.... اترو۔“

ہم تینوں نیچے اتر آئے اور گاڑی کے پیچھے ہاتھ رکھ کر لگے زور لگانے۔ ریاض نے آگے بیٹھ کر گاڑی کو آگے سرکانے کی کوشش شروع کی ..... لیکن انجن گھر گھر کر کے رہ گیا۔ گاڑی ایک انچ آگے نہ سرک سکی۔

”یار ملک ریاض.... یہ تو بالکل نہیں سرک رہی۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”ہاں سر..... کچھ آدمیوں کی مدد لینا پڑے گی... کوئی گاڑی گزرنے دیں..... ان سے درخواست کریں گے.... یا پھر.....“

”یا پھر کیا....“

”باقی سب لوگوں کو نیچے اتار کر آپ سب زور لگائیں....“

”تمہارا مطلب ہے ..... عورتیں بھی زور لگائیں۔“

”ہاں سر..... ایک تو گاڑی پر وزن نہیں رہے گا، دوسرے زور لگانے والے زیادہ ہوجائیں گے.... ان سب کو نیچے تو اتارنا ہی پڑے گا۔“

”چلیں بھئی اتریں نیچے۔“

”ارے باپ رے۔“ بیگم کانپ گئیں۔

”آجائیں.... گھبرائیں نہ.... مجبوری ہے۔“

آخر سب گاڑی سے اتر آئے صرف ریاض بیٹھا رہ گیا..... چھوٹے بچے آصف، فاروق، عثمان اور عائشہ آواز سے رونے لگے۔

”اوہو.... بھئی روتے نہیں..... چپ رہو۔ تم تو میرے حوصلے کی بھی ہوا نکال دو گے رو کر“ میں گھبرا گیا وہ اور زور سے رونے لگے.....

دیکھو.... ہمیں زور لگانے دو..... تم روتے رہے تو ہم زور نہیں لگا سکیں گے۔“

انہوں نے آوازیں ذرا کم کرلیں، لیکن رونا بند نہ کرسکے..... اب ہم سب نے مل کر خوب زور مارا ریاض نے ایکسیلٹر پر خوب دباؤ ڈالا، انجن نے خوب شور مچایا۔ لیکن گاڑی ایک انچ نہ سرک سکی۔ عین اسی لمحے سامنے سے ایک گاڑی آتی نظر آئی۔

”دعا کرو.... یہ بس ہو....“ میں نے کہا۔

”کیوں ابو..... اگر یہ ٹرک ہوا تو اس سے کیا فرق

پڑجائے گا۔" توحید بولا۔

"بے وقوف ..... ٹرک میں صرف دو آدمی ہوتے ہیں.... بس میں پچاس ساٹھ' اس وقت ہمیں زیادہ دھکا لگانے والوں کی ضرورت ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

اب ہم سب کی نظریں آنے والی گاڑی پر جم گئی۔ دل بُری طرح بیٹھے جارہے تھے۔ چھوٹے بچے ایک بار پھر رونے لگے تھے....

آپ سوچ رہے ہوں گے .... ہمیں رات کے بارہ بجے سفر کرنے کی ضرورت کیا تھی.... یہ بھی سن لیجئے ..... میرے سالے کی شادی تھی ..... اول تو بارات لیٹ ہوئی جیساکہ ملک کا خاص معمول ہے پھر جھنگ سے کوٹ ادو بارات کو جانا تھا..... دوپہر کے بعد کہیں وہاں پہنچے' وہاں نکاح بھی خوب دیر سے پڑھایا گیا..... پھر کھانے میں کافی وقت لگادیا گیا' اس کے بعد جہیز کا سامان لدوانے میں وقت لگا۔ مطلب یہ کہ جب ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا تو رات ہو چکی تھی۔

باقی لوگ دو بسوں پر سوار تھے۔ دلہا دلہن وغیرہ ایک کار میں' اور میں اپنے گھرانے کے ساتھ اپنے سوزوکی ڈبہ پر..... ہم ایسے موقعے پر اپنا ڈبا پسند کرتے ہیں۔ بسیں پیچھے رہ گئیں ..... دلہا کی کار آگے نکل گئی' ہم درمیان میں رہ گئے ..... کہ یہ حادثہ پیش آگیا..... بسوں کو جب ہم پیچھے چھوڑ رہے تھے تو ان کو ایک جگہ رکے پایا تھا ..... ہم نے گاڑی روک کر پوچھا تھا کہ کیا بات ہے' آپ لوگ رک کیوں گئے..... معلوم ہوا' ایک بس کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا ہے..... وہ تو خیر ہوئی کہ بس کسی دوسری گاڑی سے ٹکرائی نہیں ..... لہٰذا اب جب تک وہ مرمت نہ ہوجاتی' دونوں بسیں آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں ..... ہماری گاڑی دھنس گئی اور اب ہم سامنے سے آنے والی گاڑی کا انتظار کررہے تھے ..... مارے خوف کے بچوں کا تو حال تھا ہی پتلا ..... اب تو ہم بڑوں پر بھی خوف حملہ آور ہوچکا تھا ..... ہم اپنی پوری کوشش کررہے تھے کہ خود کو اس خوفناک حملے سے بچائے رکھیں' لیکن اب ممکن نہیں تھا' خوف ہمیں پوری طرح اپنی لپیٹ میں لیے جارہا تھا۔ گاڑی کی لائٹیں اس وقت ہمیں بھوت دکھائی دے رہی تھیں..... اللہ اللہ کر کے گاڑی نزدیک آگئی' میں اور ملک ریاض سڑک کے درمیان آگئے' اور ہاتھ آگے کردیئے..... پر زور اشارے ہاتھوں سے کرنے لگے کہ خدا کے لئے رک جاؤ ..... ڈرائیور نے بھی سڑک پر بچوں اور عورتوں کو کھڑے دیکھا تو بس کو بریک لگا دیئے ..... ہم لوگوں کے چہروں پر رونق آگئی ..... کہ بس اب کام بن گیا..... ملک ریاض نے آگے بڑھ کر انہیں بتایا کہ مدد کی ضرورت ہے

.....ذرا دھکا لگوا دیں۔

"چلو بھئی بچوں اور عورتوں کا ساتھ ہے ..... ان کی مدد کرو..... آٹھ دس آدمی اتر کر دھکا لگا دو' ان بے چاروں کی گاڑی نکل جائے گی۔" ڈرائیور کے الفاظ صحرا کے پیاسوں کے لئے پانی ثابت ہوئے .....دس کے قریب مسافر اترے اور لگے ڈبہ کو زور لگانے' ان کے ساتھ ہم نے بھی زور لگایا ..... لیکن گاڑی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"نہیں بھئی .....اس کے تو ٹائر بہت نیچے تک دھنس گئے ہیں .....یہ دھکا لگنے سے تو نکلے گی نہیں لوہے کا رسہ ہمارے پاس ہے نہیں .....چلو بیٹھو۔"

مسافر بس میں بیٹھ گئے .....اور ہمارے دل بیٹھنے لگے .....بچے زور زور سے رونے لگے اب تو میرا بھی حوصلہ جواب دینے لگا.....

"ملک ریاض.....اب کیا ہوگا....."

"مم.....میں.....کک.....کیا کہہ سکتا ہوں سر ..... کسی اور گاڑی کا انتظار کرتے ہیں۔"

"یار آصف.....تم تو ان سے بڑے ہو.....تم تو چپ ہوجاؤ" میں نے جملہ کسا۔

آصف اور زور سے رونے لگا .....باقیوں نے اس کا ساتھ دیا .....لگے زور زور سے رونے۔

"ایک تو تم ہمارے اوسان خطا کئے دے رہے ہو ... خدا کے لئے خاموش ہوجاؤ .... اللہ سے دعا کرو۔"

"ہمیں بھی ڈر لگ رہا ہے ..... کیا ہم گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" بیگم نے کہا۔

"نہیں ..... تم لوگوں کو سڑک پر کھڑے دیکھ کر کوئی ڈرائیور ترس کھانے پر مجبور ہوجائے گا۔"

اسی وقت دوسری طرف سے ایک گاڑی آتی نظر آئی .....ہم دعا کرنے لگے .....یا اللہ یہ گاڑی رک جائے .....یہ لوگ ہماری مدد کریں .....ہماری گاڑی نکل آئے .....ہم جلدی جلدی دعا کرنے لگے۔ گاڑی نزدیک آئی تو ہم نے اس کو رکنے کے اشارے کیے ..... لیکن ڈرائیور نے گاڑی نہ روکی اور آگے نکل گئی .....ہمارے دل یک دم بجھ گئے .....خوف اب پوری قوت سے ہم پر حملہ آور ہوچکا تھا ہمارے رونگٹے کبھی کھڑے ہوتے' کبھی بیٹھ جاتے۔

"یار ریاض .....اگر ایسے میں کوئی ڈاکو ادھر نکل آئے .....تو کیا ہوگا۔"

"یا اللہ رحم...." ریاض کانپ گیا۔

وہ بہت عرصے سے میرے پاس ڈرائیور تھا.....اور سب لوگوں سے بے تکلف .....بس گھر کا فرد لگتا تھا.....ایک بار پھر سامنے سے ایک گاڑی آتی نظر آئی .....ریاض نے آنکھیں پھاڑ

پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کوئی ٹرک ہے؟"

"خیر بھئی..... ٹرک ہے تو کیا ہوا..... شاید مدد مل جائے۔"

"مشکل ہے..... اتنے آدمی زور لگا چکے ہیں..... ٹرک پر تو تین آدمیوں سے زیادہ ہوں گے بھی نہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا۔

ٹرک نزدیک آگیا..... ہاتھوں کے اشارے، عورتیں بچے..... یہ سب دیکھ کر ڈرائیور نے ٹرک روک لیا..... پھر تین آدمی دھکا لگانے کے لئے نیچے اترے..... ایڑی چوٹی کا زور لگا کر تھک گئے اور آخر مایوس ہو کر ٹرک پر بیٹھ گئے۔

"رسے کے بغیر نہیں نکلے گا۔" ڈرائیور نے گویا فیصلہ سنایا۔

بچے اب اور زور زور سے رونے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اب حوصلہ ہار چلا تھا۔ دل ڈوب ڈوب جارہا تھا..... ایسے میں بائیں طرف والے جنگل سے ایک لالٹین کی روشنی دکھائی دی..... لالٹین کی روشنی ہمیں حد درجے خوفناک لگی۔

"ارے باپ رے..... لگ..... کیا کسی ڈاکو نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" رفعت نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے....." بیگم کی آواز سنائی دی۔

ہمارے پتے پانی ہونے لگے..... ہم اپنی طرف آتی لالٹین کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ پھر لالٹین نزدیک آگئی..... صرف دھوتی باندھے ایک شخص لالٹین کے پیچھے نظر آیا۔ خدا کا شکر ہے..... اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی کلاشن کوف نہیں تھی۔

"کیا ہوا جناب؟"

"وہ..... گاڑی پھنس گئی ہے۔"

"میں نے بھی اندازہ لگایا تھا جب ٹرک رکا تھا..... میں روشنی لے کر آگیا ہوں کہ شاید آپ لوگوں کو اس سے سہارا لگے۔" "اوہ بہت بہت شکریہ..... واقعی آپ کے آجانے سے دلوں کو کچھ ڈھارس ہوئی ہے..... آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں..... آپ گھبرائیں نہیں..... ضرورت پڑی تو میں گاؤں کے لوگوں کو بلا لاؤں گا..... کچھ فاصلے پر یہاں گاؤں موجود ہے۔"

"اوہ اچھا۔" ہم خوش ہوگئے.....

اس وقت سامنے سے پھر ایک گاڑی آتی نظر آئی۔

"کیوں ریاض..... بس ہے یا ٹرک ہے۔"

"ٹرک لگتا ہے۔"

"کاش ..... یہ بس ہو ..... زیادہ سے زیادہ آدمی دھکا لگانے کے لئے اتر آئیں۔" میرے دل سے آواز نکلی۔

نزدیک ہونے پر معلوم ہوا ..... ٹرک تھا .... ہمارے منہ اتر گئے .... ریاض نے آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا ..... ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔

"ہاں جی ..... کیا ہوا؟"

"گاڑی پھنس گئی ہے ..... اس طرف پانی ہے۔"

"اچھا کوئی بات نہیں .... یہ کہہ کر ڈرائیور اتر پڑا ..... اس نے پہلے ہماری گاڑی کا جائزہ لیا ..... پھر لوہے کا ایک موٹا تار نکالا ..... اس تار کو ہماری گاڑی کے ساتھ کسا' دوسرا سرا' ٹرک کے ساتھ کسا ..... پھر سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔

"چلو ڈرائیور صاحب ..... گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

اب اس نے ٹرک کو اسٹارٹ کیا ..... ٹرک پیچھے ہٹا ..... تار تن گیا ..... اس وقت ہم سب کے دل بہت زور سے اچھلے ..... دلوں سے دعا نکلی ..... یا اللہ گاڑی نکل جائے ..... اور اسی لمحے گاڑی نکل کر سڑک پر آ گئی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے ....." میں بے ساختہ بولا ..... باقی لوگوں نے بھی شکر کا کلمہ پڑھا ..... ڈرائیور صاحب نے اپنا تار کھولا ..... میں آگے بڑھا ..... جیب سے کچھ نوٹ گنے بغیر لئے اور اس کی طرف بڑھا دیے .....

"یہ ..... یہ کیا ..... آپ میری نیکی برباد کرنا چاہتے ہیں ....." ڈرائیور بولا'

"اوہ ..... معاف کرنا بھائی۔"

میں اس سے لپٹ گیا ..... میری آنکھیں آنسو بہانے لگیں ..... ٹرک آگے بڑھ گیا ..... لالٹین والے کا بھی بہت شکریہ ادا کیا ..... اور اس طرح ہم گھر کی طرف روانہ ہو سکے۔

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے ..... لیکن وہ ڈرائیور مجھے آج بھی یاد آتا ہے ..... پھر دل سے اس کے لئے دعا نکل جاتی ہے ..... اللہ کرے وہ جہاں بھی ہو خوش رہے ..... اور ہاں وہ لالٹین والا بھی۔

"پطرس کے مضامین" کے شہرت یافتہ مصنف سید احمد شاہ بخاری کے کسی دوست نے ایک مرتبہ کسی بزرگ سے ان کا تعارف کرایا۔ یہ بزرگ ان کے چھوٹے بھائی سید ذوالفقار علی شاہ بخاری کو جانتے تھے چنانچہ یہ کہہ کر ملاقات کرائی گئی کہ سید ذوالفقار علی شاہ بخاری کے بڑے بھائی سید احمد شاہ بخاری ہیں۔ اس پر بزرگ نے برجستہ کہا "تو یوں کہئے نا کہ یہ صحیح بخاری ہیں۔"

مرسلہ:۔ محمد خالد قریشی، نصیر پور

ملکہ کا صندوقچہ

سید احمد بلوچ

دفتر میں کرسی پر بیٹھتے ہی سیٹھ قاسم نے اپنی سیکریٹری کو فون پر حکم دیا۔ "انسپکٹر عثمان سے بات کراؤ۔" اس نے ریسیور رکھا تو ایک ملازم معمول کے مطابق آج کے اخبارات سے اشتہارات کے تراشے لے کر آگیا۔ ایک اردو اخبار کے قدرے چھوٹے اشتہار کو دیکھ کر وہ خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا۔

"سونے کا تاریخی صندوقچہ برائے فروخت۔ یہ صندوقچہ عظیم چینی شہنشاہ قبلائی خاں کے عہد کا ہے۔ گمان یہی ہے کہ یہ قبلائی خاں کی ملکہ کے زیر استعمال رہ چکا ہے۔ اس صندوقچے کی نمائش آج صبح ۱۱ بجے تک ہوگی۔ اس کے تین دن بعد یہ نیلام عام کے ذریعے فروخت کیا جائے گا۔"

اشتہار کے آخر میں نادر اور تاریخی اشیا فروخت کرنے والی ایک نئی کمپنی کا نام تھا۔ سیٹھ قاسم اگرچہ ایک عرصے سے نادر اور پرانی تاریخی

اشیا (Antique) جمع کرنے کا شوقین تھا اور بڑی بڑی کمپنیوں کو جانتا تھا لیکن "ٹان جو" نامی یہ کمپنی اس کے لئے بالکل اجنبی تھی۔ سیٹھ قاسم نے گھڑی دیکھی۔ نمائش ختم ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے اپنی تمام مصروفیات ختم کر کے صندوقچہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

سیٹھ کے جانے کے چند منٹ کے بعد انسپکٹر عثمان کا فون آیا۔ سیکریٹری نے اسے بتایا کہ سیٹھ صاحب اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر ہوٹل نمائش دیکھنے چلے گئے ہیں۔

انسپکٹر عثمان سیٹھ کے قیمتی نوادرات کا محافظ بھی تھا۔ اس نے بھی وہ اشتہار دیکھا اور دیئے گئے پتے پر پہنچ گیا۔

ہوٹل المار کے ہال میں شہر کے کئی شوقین جمع تھے۔ یہ سب اس نادر صندوقچے کو دیکھنے آئے تھے جس کا اشتہار آج کے صرف ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔ صندوقچے کے بارے میں ملک کے معروف جوہری نے تصدیق کی تھی کہ وہ اصلی سونے کا ہے اور نوادرات کے ایک دوسرے ماہر نے سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا یہ صندوقچہ قریباً" آٹھ سو سال پرانا ہے۔

سیٹھ قاسم سمیت کئی لوگ جانتے تھے کہ قبلائی خاں ۱۲۵۱ء سے ۱۲۹۴ء تک چین کا شہنشاہ رہا تھا۔ اس لئے صندوقچے کے بارے میں کیا گیا دعویٰ درست ہو سکتا ہے۔ سیٹھ قاسم نے صندوقچے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کمپنی کے ذمہ دار لوگوں سے رابطہ کیا اور اسے علیحدگی میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور چند منٹ بعد انہیں ہوٹل کے ایک خاص کمرے میں لے جایا گیا جہاں مسٹر ٹان جو ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہی اس قیمتی صندوقچے کے مالک تھے۔

"ہیلو مسٹر قاسم!" ایک ادھیڑ عمر خوش پوش شخص نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سیٹھ قاسم کا استقبال کیا۔ "میرا نام ٹان جو ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ٹان جو نے بتایا: "میں ایک ماہر آثار قدیمہ (آرکیالوجسٹ) ہوں اور یہ کام حال ہی میں شروع کیا ہے۔ قبلائی خاں کے دور کا یہ صندوقچہ ہمیں ایک چینی کھنڈر کی کھدائی کے دوران ملا تھا۔ لیکن اس وقت کسی کو اس کی اصلیت کے بارے میں معلوم نہ تھا اور ہم نے بہت ساری اشیا کے ساتھ اسے بھی خرید لیا مگر بعد میں ایک دوسری کھدائی کے دوران شہنشاہ قبلائی خاں کے دور کے متعلق ایک کتاب ملی۔ اس میں صندوقچے کا بھی ذکر تھا۔ اس طرح اتفاق سے ایک بہت تاریخی، نادر اور قیمتی چیز ہمارے ہاتھ لگ گئی۔

"اگر اس کی تاریخ وہی ہے، جو آپ نے

بتائی ہے، تو پھر یہ بہت مہنگا ہوگا..... ایسی قیمتی چیز آپ ہمارے ملک کے بجائے امریکہ یا یورپ کے دوسرے ملکوں میں فروخت کے لئے کیوں نہیں لے گئے؟" سیٹھ قاسم نے پوچھا۔

ٹان جو بولا : "آپ بالکل درست کہتے ہیں، وہاں اس کی بہت معقول قیمت لگائی جاسکتی تھی۔ لیکن مجھے یہ حقیقت بھی معلوم تھی کہ ان ملکوں میں اس طرح کی نادر اشیا کو چرانے کے بڑے ماہر اور خطرناک چور بھی ہوتے ہیں اور یہ ظالم تو مالک کو جان سے مار ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس لئے زیادہ قیمت کے لالچ میں نہ اس قیمتی صندوقچہ کو ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا چاہتا تھا۔"

"آپ کی سوچ بالکل ٹھیک ہے مسٹر ٹان جو۔ اور میرے متعلق تو آپ جانتے ہوں گے کہ اس شہر میں ان چیزوں کا سب سے بڑا قدر دان میں ہوں۔ میں اگر صندوقچے کی اصلیت کے بارے میں مطمئن ہوجاتا ہوں تو اس کی منہ مانگی قیمت ....."

"سیٹھ قاسم کا جملہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی نے کاٹ لیا۔ وہ معذرت کر کے فون سننے لگا۔ یہ انسپکٹر عثمان کا فون تھا۔ اس نے کہا۔ "سیٹھ صاحب، مجھے معلوم ہے کہ آپ اس وقت کہاں ہیں، اس لئے خاموشی سے میری بات سنتے جائیں۔ آپ صندوقچے کو خریدنے کا کوئی معاہدہ نہ کریں۔ میں اس وقت اسی صندوقچے کے بارے میں تفتیش کررہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کوئی اہم بات معلوم ہوجائے۔ آپ سے اب آپ کے آفس ہی میں بات ہوگی۔"

اس فون سے سیٹھ قاسم کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھے جاسکتے تھے اور یہ بات ٹان جو نے بھی محسوس کی۔

وہ بولا : "ٹھیک ہے مسٹر قاسم۔ آپ جیسے چاہیں اس کا معائنہ کروائیں لیکن پھر آپ صندوقچے کو خریدنے کے پابند ہوں گے۔"

سیٹھ قاسم نے وعدہ کیا اور دونوں ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ سیٹھ قاسم اب بڑی بے چینی سے انسپکٹر عثمان سے ملنے کا منتظر تھا۔ وہ سیدھا اپنے آفس آیا۔ اس کے دفتر میں انسپکٹر عثمان نے فیکس کے ذریعے یہ پیغام دیا۔

"میں ٹان جو کمپنی کے متعلق ہی تفتیش کررہا ہوں۔ آپ صندوقچے کو خریدنا چاہیں تو نیلام کے ذریعے خریدیئے گا۔ نیلامی کے وقت آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔"

اس پیغام نے سیٹھ کو مزید بے چین کردیا تھا۔ وہ تو انسپکٹر سے مشورہ کر کے صندوقچے کا اپنے طور پر معائنہ کروانا چاہتا تھا۔ لیکن انسپکٹر

کا پیغام اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا اس نے فوراً" ٹان جو سے فون پر رابطہ کیا اور اسے بتادیا کہ وہ صندوقچے کو نیلام کے ذریعے ہی خریدنا پسند کرے گا۔

صندوقچے کی نیلامی سے پہلے والی رات ہوٹل المار پراسرار سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ انسپکٹر عثمان بھیس بدل کر اس کمرے کے بالکل قریب ٹھہرا ہوا تھا جہاں صندوقچہ محفوظ تھا۔ ٹان جو اس دن خود اس کمرے میں موجود تھا۔ رات کے آخری پہر انسپکٹر عثمان کو ٹان جو کے کمرے سے ایک آدمی نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ انسپکٹر نے پوری رات اس آدمی کا انتظار کیا تھا وہ یہ سب کچھ کمرے کے روشن دان سے دیکھ رہا تھا اس نے اپنے کمرے سے خفیہ طور پر نکلنے کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کے ذریعے وہ قریب سے گزرتے ایک پائپ کی مدد سے ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔ یہ کمرہ اس نے پہلے ہی ایک دوسرے نام سے محفوظ کروایا ہوا تھا۔ یہاں سے وہ ٹان جو یا اس کے کسی ساتھی کی نظر میں آئے بغیر اس آدمی کا پیچھا کر سکتا تھا جسے اس نے ٹان جو کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ آدمی ہوٹل کے باہر آکر ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔ انسپکٹر عثمان نے اپنی گاڑی سے مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب جاری رکھا۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ پراسرار آدمی ایئرپورٹ کی طرف جارہا ہے۔ انسپکٹر اس کے پیچھے پیچھے ایئرپورٹ تک پہنچا۔ وہاں اس نے معلومات کی کھڑکی سے کچھ سوال پوچھے اور پھر وہ ٹیلی فون کرنے لگ گیا۔ وہ ملک سے باہر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ہوٹل جانے کے بجائے اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

نمائش پر جانے سے پہلے سیٹھ قاسم انسپکٹر عثمان یا اس کے پیغام کا بڑی شدت سے انتظار کررہا تھا۔ لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی۔ البتہ جب وہ اپنی گاڑی میں ہوٹل کی طرف جارہا تھا تو اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی یہ انسپکٹر کا فون تھا سیٹھ کو انسپکٹر نے نئی ہدایت یہ دی تھی کہ وہ بولی لگانے میں احتیاط سے کام لے اور کسی ایسے شخص کی بولی کا مقابلہ نہ کرے جسے وہ جانتا نہیں۔

طرح طرح کے خیالات میں گھرا جب سیٹھ قاسم ہوٹل کے اس ہال میں پہنچا تو حیران رہ گیا۔ ہال میں کئی ایک غیر ملکی بھی نظر آرہے تھے۔ بولی شروع ہوئی تو یہ غیر ملکی بڑھ چڑھ کر بولی لگانے لگے۔ جلد ہی صندوقچے کی قیمت پچاس ہزار امریکی ڈالر تک پہنچ گئی۔ ایک اور بات سیٹھ قاسم نے یہ دیکھی کہ اسے ہال میں اپنے ملک کے

خریدار بہت کم نظر آئے۔ سیٹھ کے خیال میں صندوقچے کی قیمت ایک لاکھ ڈالر تک ہو سکتی تھی لیکن وہ پچپن ہزار ڈالر تک پہنچ کر رک گئی اور کوئی اور آدمی اس سے زیادہ بولی نہیں لگا رہا تھا۔ سیٹھ کے خیال میں صندوقچہ بہت سستی قیمت میں فروخت ہو رہا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ پچپن ہزار کی رقم ایک غیر ملکی نے لگائی تھی اور انسپکٹر عثمان نے سیٹھ کو کسی غیر ملکی کی قیمت سے زیادہ بولی لگانے سے منع کیا تھا۔ سیٹھ کو سخت غصہ آرہا تھا کہ انسپکٹر نے اسے عجیب حالت میں ڈال رکھا ہے جب بولی لگانے والے نے صندوقچے کی ایک دفعہ تاریخی اہمیت بتلا کر بولی بڑھانے کا آخری موقع دیا تو سیٹھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے ساٹھ ہزار ڈالر کا اشارہ کیا۔ مگر فوراً ہی ایک دوسرے شخص نے ستر ہزار کی رقم بول دی۔ سیٹھ قاسم کو بڑا غصہ آیا اور اس نے ذرا بلند آواز سے کہا..... "پچھتر ہزار ڈالر" مگر غیر ملکی نے بھی مقابلے کی ٹھان لی تھی۔ اس نے سیٹھ قاسم کی طرف طنزیہ نگاہ ڈالی اور بولا..... : "نوے ہزار" ڈالر۔"

ہال میں شور مچ گیا۔ غیر ملکی نے ایک دم بولی زیادہ کر کے سیٹھ کو گویا چیلنج کر دیا تھا۔ سیٹھ کچھ دیر سوچتا رہا..... آخر ساری مصلحتیں چھوڑ کر اس نے ایک لاکھ ڈالر کا فیصلہ کیا۔ مگر وہ جیسے ہی اٹھا۔ ایک شور سا مچ گیا۔ کچھ لوگ زبردستی ہال میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اسی وقت ٹان جو کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے اسے چند لفظوں کا فون کیا تھا۔ فون سننے کے بعد ٹان جو نے ایک غیر ملکی کو اشارہ کیا اور اگلے لمحے ہال ایک پٹاخے کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہال میں تیزی سے دھواں اٹھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہال دھوئیں سے بھر گیا ہر کوئی کھانسنے لگا۔ اب بھگدڑ مچ چکی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ غیر ملکی عجیب سی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک کسی نے انگریزی زبان میں، اونچی آواز میں خبردار کیا : "کوئی بھی شخص بھاگنے کی کوشش نہ کرے ..... پولیس نے ہال کو گھیر لیا ہے۔"

اس کے بعد پکڑ دھکڑ کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اردو میں کہا : "سر! ہم نے تمام ملزموں کو گرفتار کر لیا ہے۔ دروازہ کھول دیجئے۔" دروازہ کھلنے کے بعد ہال کا دھواں باہر نکلنا شروع ہوا اور کچھ دیر بعد لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے کے قابل ہوئے۔

سیٹھ قاسم نے جو منظر دیکھا وہ اس کے لئے سخت حیران کن تھا۔ پولیس نے ٹان جو سمیت تمام غیر ملکیوں کو گرفتار کیا ہوا تھا۔ سیٹھ قاسم نے پولیس آفیسر سے قدرے غصے سے پوچھا : "یہ

آپ نے ان لوگوں کو کیوں گرفتار کیا ہے؟"

"اس کی وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔" سیٹھ نے چونک کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ آواز انسپکٹر عثمان کی تھی۔ وہی اس ساری کارروائی میں پولیس کی رہنمائی کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چینی پولیس آفیسر بھی تھا۔ انسپکٹر عثمان نے بتانا شروع کیا۔

"دراصل ٹان جو اور یہ تمام غیر ملکی ٹھگوں کا ٹولہ ہے۔ ٹان جو چین کے ایک عجائب گھر میں ملازم ہے۔ اس نے عجائب گھر سے آٹھ سو برس پرانا ایک صندوقچہ غائب کر کے اس کی جگہ نقلی صندوقچہ رکھ دیا۔ اس چوری کئے گئے صندوقچے کو لے کر یہ پاکستان آگیا۔ ٹان جو یہاں بھیس بدل کر آیا تھا۔ اور پاکستان آنے کا فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ یہ ایک چھوٹا اور غریب ملک ہے' اس لئے انہوں نے سوچا کہ ان کے یہاں آنے سے شہرت نہیں ہوگی پھر انہیں سیٹھ قاسم کے متعلق علم ہوا۔ اور مجھے اس اردو اشتہار ہی نے شک میں ڈالا تھا۔ اور جب میں نے اس اخبار کے ذریعے اشتہار شائع کروانے والے کے متعلق معلوم کیا تو وہ ایک پرانا دھوکے باز نکلا۔ دراصل اسی نے ٹان جو کو سیٹھ کے متعلق معلومات دی تھی۔ میں نے ٹان جو اور اس کے صندوقچے کی تصویر چین بھیج دی اور چینی پولیس سے تفتیش کرنے کے لئے کہا۔ دوسرے ہی روز چینی پولیس نے مجھے ٹان جو کی اصلیت بتادی اور یہ خبر بھی دی کہ عجائب گھر میں اصلی صندوقچے کی جگہ نقلی صندوقچہ رکھ دیا گیا ہے۔ ادھر ٹان جو نے کل رات اپنے منصوبے کے مطابق اصلی صندوقچہ واپس چین بھجوادیا تاکہ اسے نقلی صندوقچے کی جگہ رکھ دیا جائے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو اور وہ اس طریقے سے اپنے فراڈ کا سلسلہ جاری رکھ سکیں اس اصل صندوقچے کی جگہ اس وقت نیلامی میں نقلی صندوقچہ رکھا ہوا ہے' لیکن میں نے ہوٹل سے اس غیر ملکی کا پیچھا کیا جس کے ذریعے صندوقچہ واپس چین بھجوایا جارہا تھا میں نے چینی پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دے دی۔ اور انہوں نے ایئرپورٹ سے ہی مجرم کو گرفتار کرلیا اور پھر چینی پولیس کی اجازت سے ہم نے آج کی یہ کارروائی کی ہے....."

سیٹھ قاسم نے فخر سے انسپکٹر عثمان کی طرف دیکھا جس نے مجرموں کے اس خیال کو غلط ثابت کردیا کہ پاکستان کوئی معمولی سا ملک ہے جہاں کسی شہری کو چکر دے کر وہ اسے لوٹ سکتے ہیں۔

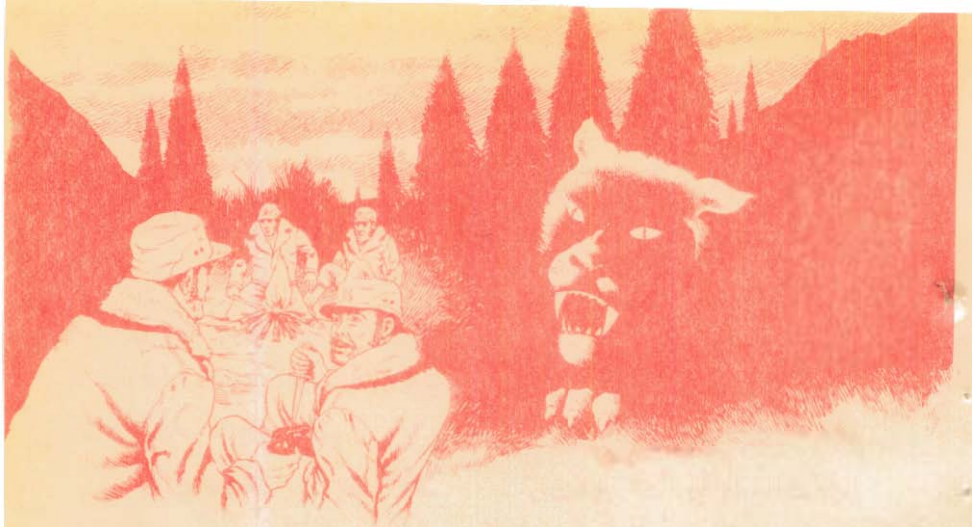

انوکھا درندہ

طل ہما حمید

یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں میں ہزارہا قسم کے خوفناک درندے موجود ہیں جو شکل وصورت، عادات و اطوار اور خونخواری میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ لیکن بلوچستان کی قدیم تاریخ میں ایک ایسے عجیب الخلقت درندے کا ذکر ملتا ہے جو اپنی ہیئت اور عادات و اطوار کے لحاظ سے درندوں سے زیادہ انسانوں سے ملتا جلتا تھا۔ جنرل پوسٹ آفس کوئٹہ سے نکل کر نالے کا پل پار کرکے چھاؤنی کی طرف جائیں تو تقریباً" دو فرلانگ کے فاصلے پر سڑک کی داہنی طرف ایک چھوٹی سی چار دیواری کے اندر گوروں کا قبرستان ہے۔ گزشتہ چند سال میں تقریباً" تمام قبریں مسمار ہو چکی ہیں سوائے دو تین کے، جن کے نشان اب بھی باقی ہیں۔ اسی قبرستان میں چند برس قبل ایک پختہ چبوترے پر ایک ایسے درندے کا سیمنٹ اور دیگر مصالہ جات سے بنایا ہوا بت موجود تھا جس کا تمام جسم اور دم شیر کی مانند تھے، لیکن سر، چہرہ اور سینہ بالکل عورت کی مانند تھے۔ اب اس بت اور چبوترے کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ اس خوفناک درندے کے بارے میں بہت سی مختلف روایات مقامی اور غیر مقامی باشندوں میں مشہور ہیں۔ پہلے

پہل یہی اندازہ تھا کہ کوئٹہ کے قریب پہاڑوں میں ہلاک کیا جانے والا یہ درندہ دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں دیکھا گیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ہی انسان نما خوفناک درندہ ملایا کے ربڑ کے جنگلات میں اور اس کے بعد کنیڈا میں دیکھا گیا تھا مگر کوشش کے باوجود نہ تو اس درندے کو زندہ پکڑا جاسکا تھا اور نہ ہی ہلاک کیا جاسکا تھا اور پھر یہ درندے کافی عرصہ تک نظر نہ آئے۔

جب برصغیر ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو اٹھارہویں صدی کے آخر میں فوج کی کچھ نفری کوئٹہ آئی۔ فوج کے ایک حصہ نے اپنا کیمپ اس جگہ لگایا جہاں آج کل موجودہ قلی کیمپ ہے۔ ابتدا میں تمام فوجی کیمپوں میں رہتے تھے کیونکہ اس علاقے میں چھاؤنی بنانے کے لئے سروے کا کام شروع تھا' سوائے چند ایک کچی بیرکوں کے جن میں ایمبولینس اور اسلحہ کے اسٹور تھے۔ تمام فوج ابھی بیرکوں میں مقیم تھی۔ ابتدائی سال میں صرف آٹھ دس ماہ کے اندر اندر مختلف مقامات سے تین انگریز فوجی کیمپ سے پراسرار طور پر غائب ہوگئے اور کافی تلاش کے باوجود ان کے اس طرح غائب ہوجانے کے بارے میں کوئی سراغ تک نہ ملا۔ ان فوجی افسران کو فوج سے بھگوڑے قرار دے دیا گیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ تینوں فوجی کسی نہ کسی طرح قبائلی لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے ہوں گے مگر قبائلی سرداروں سے رابطہ قائم کرنے پر یہ اطمینان ہوا کہ فوجیوں کے غائب ہوجانے میں قبائلیوں کا ہاتھ ہرگز نہیں۔ تینوں فوجی مختلف اوقات میں رات کے وقت کیمپ سے غائب ہوئے تھے۔ اس لئے ایک خیال یہ بھی تھا کہ قریبی پہاڑیوں سے کوئی درندہ ان کو اٹھا کر نہ لے گیا ہو۔ لیکن پہاڑوں میں تلاش کرنے کے بعد بھی ایسا نشان نہ مل سکا۔

رات کا پہرہ سخت کر دیا گیا اور رات کو پہاڑ کی جانب سے ایک ایسا درندہ آتے ہوئے دیکھا گیا کہ جب فوجیوں نے اس پر فائرنگ کی تو وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو کر پاؤں کے بل اتنی تیزی سے واپس بھاگا کہ اسے کوئی گولی نہ لگ سکی۔ پہرے پر موجود دستے نے بتایا کہ وہ جانور تیز رفتاری سے اس طرح بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور پھر نظروں سے اس طرح اوجھل گیا جس طرح کمان سے نکل کر تیر' دیکھنے میں اس خوفناک درندے کی شکل ریچھ کی مانند تھی۔ چند روز بعد پھر ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ اس مرتبہ ایک انگریز کیپٹن پراسرار طور پر اپنے کیمپ سے غائب ہوگیا تھا۔ ایک انگریز آفیسر کا اس طرح کیمپ سے غائب ہوجانا انگریزوں کے لئے ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ پوری فوج میں سے پچیس آدمیوں کا ایک دستہ منتخب کیا گیا اور پھر اسے دو حصوں میں

تقسیم کر کے یہ پروگرام مرتب کیا گیا کہ دونوں دستے الگ الگ اطراف سے پہاڑ پر چڑھیں گے۔ مناسب خوراک اور پانی کا ذخیرہ کر کے پروگرام کے مطابق دونوں دستے الگ الگ اطراف کو روانہ ہوگئے۔

کئی روز تک پہاڑوں کی تلاش کے باوجود ایسا کوئی نشان نہ مل سکا اور نہ ہی کوئی ایسا جنگلی درندہ دکھائی دیا جس کے بارے میں یہ شک کیا جاسکتا کہ غائب ہونے والے فوجیوں کو کوئی ایسا ہی درندہ اٹھا کر لے گیا ہو۔

پہاڑوں کے دامن میں جہاں کہیں مقامی لوگوں کی چھوٹی سی بستی نظر آئی ان سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ لیکن کوئی ایسی مفید بات معلوم نہ ہو سکی جو غائب ہونے والے فوجیوں کی تلاش میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی۔

ایک رات جب ایک دستہ پڑاؤ کئے ہوئے تھا تو پہرے پر موجود دو فوجیوں نے دور سے ایک کالی سی چیز کو حرکت کرتے اور ایک طرف کو بڑھتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے فوراً" دستہ کے انچارج کو جگایا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ ریچھ کی طرح کا جنگلی جانور تھا' مگر وہ اتنی دور تھا کہ اس پر گولی چلانے سے اس کے بچ نکلنے کا مکمل یقین تھا۔

دستہ کے انچارج نے دوربین سے دیکھا تو چاند کی ہلکی سی چاندنی میں اسے نظر آیا کہ وہ درندہ نہیں بلکہ کوئی عورت تھی جس نے سردی سے بچنے کے لئے کوئی پوستین پہن رکھی تھی اور پھر اچانک تھوڑی دیر بعد وہ واپس پلٹی اور بجلی کی سی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ صبح تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اب مذکورہ دستہ کا رخ اس جانب تھا۔ جس طرف رات کو اس جانور یا عورت کو دیکھا گیا تھا۔ مگر تمام دن کی تلاش کے باوجود پہاڑ پر کوئی ایسی آبادی نظر نہ آئی۔ اسی اثنا میں دوسرا فوجی دستہ آملا اور اس نے ایک پہاڑ کی ڈھلان پر ریچھ سے ملتا جلتا ایک جانور کھڑا دیکھا' جس کا سر اور چہرہ عورت کے چہرے سے مشابہ تھے۔ قبل اس کے کہ اس پر گولی چلائی جاتی وہ فوراً" نظروں سے اوجھل ہوگیا اور پھر تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اس رات اس جانور کو تلاش کرنے کے لئے ایک جامع پروگرام بنایا گیا۔ پروگرام کے مطابق چار چار فوجی جوانوں کی ٹولیاں ترتیب دی گئیں۔ جن کا کام پہاڑ میں مختلف غاروں کی اچھی طرح تلاشی لینا تھا۔ تلاش کرتے ہوئے ایک ٹولی کو ایک غار کے دہانے کے قریب کسی جانور کے پاؤں دکھائی دیئے۔ ان فوجیوں نے غار کے اندر جھانکا مگر دور دور تک گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک انہیں

غار کے اندر سے آتی ہوئی انسانی آواز سنائی دی جیسے کوئی انسان انہیں مدد کے لئے پکار رہا ہو۔

اب دو آدمیوں کو غار کے باہر متعین کیا گیا اور دو آدمی غار کے اندر داخل ہو گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ آگے بڑھتے رہے۔ پھر چلتے چلتے غار ایک طرف کو گھوم گئی اس جگہ راستہ ذرا کشادہ ہو گیا۔ یہاں رک کر انہوں نے آواز دی اور پھر جب غار کے اندر سے آواز آئی تو معلوم ہوا کہ غار کے اندر ان کا ساتھی کیپٹن ہیری تھا جو چند روز قبل کیمپ سے پراسرار طور پر لاپتہ ہو گیا تھا کیپٹن ہیری گھاس پر لیٹا ہوا تھا اس کے پاؤں کے تلوے بری طرح زخمی تھے اور ان کے خون رسنے کے بعد سرخ اور سیاہ دھبے بن گئے تھے۔

قریب ہی ایک جانب کچھ جنگلی پھل اور جڑی بوٹیاں پڑی تھیں۔ کیپٹن ہیری کو انہوں نے سہارا دے کر بٹھایا اور پھر اس نے اپنے غائب ہونے کے بعد سے اس وقت تک کے واقعات بتائے۔

کیپٹن ہیری نے بتایا کہ وہ آدھی رات کے وقت رفع حاجت کے لئے باہر نکلا تو دفعتاً کسی درندے نے اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس زور سے بھینچا کہ اس کی چیخ دب کر رہ گئی اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہ رہا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اس غار میں پایا وہ درندہ اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے درندے کا جو حلیہ بتایا وہ وہی تھا جو فوجیوں نے دیکھا تھا۔

فوجیوں نے کیپٹن ہیری کو فوراً غار سے نکال کر کیمپ میں پہنچایا اور دو آدمیوں کو کیمپ کے قریب چھوڑ دیا گیا تاکہ وہ اس جانور کے غار کی جانب آنے کا انتظار کریں سورج غروب ہونے سے قبل آٹھ آدمی ان کے پاس پہنچ گئے اور پھر مختلف جگہوں پر چھپ کر اس درندے کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

جونہی وہ درندہ آیا فوجی جوانوں نے جو بالکل چوکس تھے اسے حملہ کرنے یا واپس بھاگنے کی مہلت نہ دی یکلخت کئی گولیاں اس کے جسم کے آر پار ہو گئیں اور وہ فوراً ہی تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اگلی صبح یہ فاتح ٹیم کیپٹن ہیری کو اور اس پراسرار درندے کی لاش کو لے کر چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے۔ کیپٹن ہیری کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس خوفناک درندے کی لاش کی نمائش کئی روز تک چھاؤنی میں ہوتی رہی اور پھر ہیڈ کوارٹر سے حکم ملتے ہی اس پراسرار درندے کی لاش انگلستان روانہ کر دی گئی۔ اس خوفناک درندے کی حنوط شدہ ممی آج بھی لندن میوزیم میں موجود ہے۔

شجاع فاروق

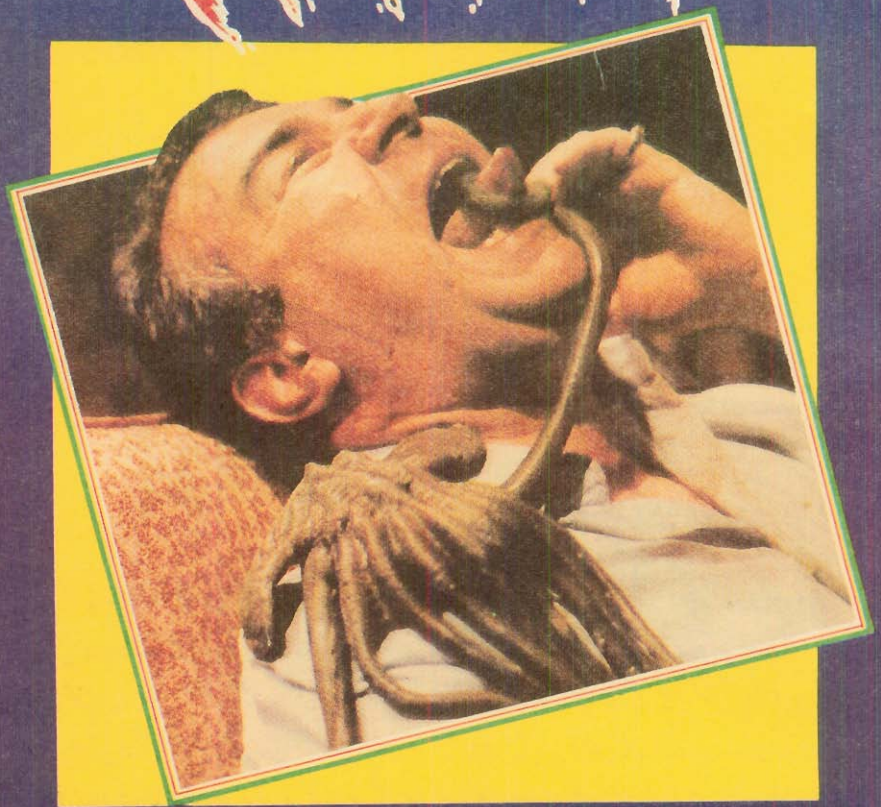

جب لوگ بہت جھوٹ بولنے لگے تو ایک عجیب و غریب مخلوق نمودار ہوئی۔ جوں ہی کوئی شخص جھوٹ بولتا، یہ مخلوق کہیں قریب ہی سے نکل کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتی اور اس کی زبان پکڑ لیتی۔ وہ شخص چیختا چلاتا، کراہتا، لیکن مخلوق اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑتی جب تک وہ شخص آئندہ جھوٹ بولنے سے توبہ نہ کر لیتا۔ رفتہ رفتہ اس مخلوق کے ڈر سے لوگوں نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا اور ہمیشہ اور ہر دل میں سچ بولنے لگے اور جب سچ بولنے لگے تو امن و سکون قائم ہو گیا۔ شاید یہ تصویر دیکھ کر لوگ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں۔

آزمائش

عبدالستار خان طاہر

یہ غالباً" ۱۹۶۸ء کی ایک چمکیلی صبح کا ذکر ہے۔ اس دن جب میں تیار ہو کر دفتر پہنچا تو دو خوشخبریاں میری منتظر تھیں۔ ایک تو میری پروموشن ہو گئی تھی اور میں رینج آفیسر سے ایس۔ ڈی۔ او بن گیا تھا اور دوسری خوشخبری یہ تھی کہ میرا تبادلہ چیچہ وطنی سے مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) کے مشہور و معروف جنگل "سندر بن" میں ہو گیا تھا میں نے سنا تھا کہ "سندر بن" میں ہاتھی، چیتے، شیر، ہرِیال، لگڑ بگے، ریچھ، بندر اور دیگر جنگلی جانور بکثرت پائے جاتے ہیں یہ سوچ کر بہت خوش تھا کہ اسی بہانے میں مشرقی پاکستان کے علاقوں کی سیر کرلوں گا۔ ٹھیک پندرہ دن بعد میری وہاں حاضری تھی۔ اس لئے ان پندرہ دنوں میں میں نے اپنی تیاریاں مکمل کرلیں اور آخر کار میری روانگی کا دن آپہنچا اور میں بحری جہاز کے ذریعے عازمِ مشرقی پاکستان ہوا۔ شام کے سورج

کی لالی ماند پڑتی جارہی تھی جب "سندربن" کے ڈاک بنگلے میں پہنچا۔ وہاں اردلی سے اپنا تعارف کرایا۔ میرا کمرہ پہلے ہی تیار کردیا گیا تھا کیونکہ میرے پہنچے کی اطلاع وہاں پہنچ گئی تھی۔ میں چونکہ سفر کا تھکا ہوا تھا اس لئے غسل کرنے اور کھانا کھانے کے بعد سوگیا اور شام تک سوتا رہا۔ شام کو جب سو کر اٹھا تو عملے کے تمام لوگ شام کے کھانے پر میرا انتظار کررہے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس کے بعد دوسروں کا تعارف ہونے لگا۔ وہاں ایک ڈویژنل فاریسٹ آفیسر محمد بشیر تھا۔ دوسرا محمد یوسف تھا جو میری طرح سب ڈویژنل آفیسر تھا۔ تیسرا ایک رینج آفیسر محمد جمیل تھا اور چوتھا فارسٹ بلاک آفیسر محمد فیصل تھا۔ میں وہاں پانچواں افسر گیا تھا۔ اس کے علاوہ باقی جنگل کا جونیئر عملہ تھا جن میں فارسٹ گارڈ، چوکیدار، بیلدار اور ڈاک بنگلہ کی انتظامیہ شامل تھی۔

انہوں نے وہاں ڈاک بنگلے کے برآمدے کے ساتھ باہر کی طرف ایک چوکور چبوترہ سا بنایا ہوا تھا۔ جو تقریباً" اڑھائی فٹ اونچا تھا۔ یہ دراصل مٹی کا قدرتی طور پر بنا ہوا چبوترہ تھا جسے تراش کر چوکور بنالیا گیا تھا۔ جنگل ایسا گھنا کہ چھوٹے بڑے درخت ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سورج کی تیز کرنیں بھی نیچے زمین پر پہنچنے سے قاصر تھیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی تھیں۔ چبوترے کی سیدھ میں درخت اور جھاڑیاں صاف کرکے تقریباً" بارہ فٹ چوڑا راستہ بنالیا گیا تھا اس کے علاوہ ڈاک بنگلے کے اردگرد بھی دس دس فٹ کا ایریا صاف کردیا گیا تھا۔ اور چھوٹی موٹی جھاڑیوں کو تراش کر خوبصورت بنادیا گیا تھا۔ میں وہاں گیا تو رات ہم پانچوں افسر چبوترے پر کینوس کی فولڈنگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ میری کرسی چبوترے کے کنارے پر تھی۔ تراشی ہوئی جھاڑیوں کے پتے میرے بائیں بازو کو چھورہے تھے۔ ان چار دنوں میں مجھے میری ڈیوٹی کے متعلق اتنا نہیں بتایا گیا تھا جتنی مجھے اس جنگل کی خوفناک باتیں سنائی گئیں تھیں۔ میرے ساتھ افسر ہروقت تفریح اور کھیل کود کے موڈ میں رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس جنگل میں ایسے ایسے درندے ہیں جو کسی اور جنگل میں نہیں ہوتے۔ بلی جتنے بڑے ایک درندے کے متعلق بتایا گیا کہ پیچھے سے حملہ اس طرح کرتا ہے کہ انسان کی گردن پکڑلیتا ہے اور دانت گردن کی ایک رگ میں گاڑ کر خون پینا شروع کردیتا ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرے یہ درندہ خون پیتا رہتا ہے۔ آخر کار انسان بے ہوش ہوجاتا ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہی مرجاتا ہے۔ اژدہے بھی

بتائے گئے جو سالم انسان کو نگل لیتے ہیں۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ اس جنگل میں انسانوں کی بدروحیں بھی رہتیں ہیں جو کہ عرصہ ہوا مرچکے ہیں۔ رات کو جنگل کے کسی نہ کسی حصے میں ان کی بدروحیں ناچتی اور گاتی ہیں اور بعض اوقات وہ روتی ہیں اور رات کو وہ اپنے اصل انسانی روپ میں آجاتی ہیں اور اگر رات کو کوئی افسر یا عملے کا دوسرا آدمی اکیلا جنگل میں جائے اور اسے کوئی بدروح دیکھ لے تو وہ اسے اس طرح ہلاک کرتی ہے کہ اس کی گردن مروڑ کر جسم سے الگ کردیتی ہے۔ جسم وہیں پڑا رہتا ہے اور سر اڑتا ہوا اس کے کمرے میں جاگرتا ہے۔ اس سے پہلے اس طرح کے چارپانچ واقعات یہاں ہوچکے ہیں۔ جنگل میں جو اژدہے ہیں وہ سب اژدہے نہیں ہیں، ان میں بعض بدروحیں ہیں جنہوں نے اژدہوں کا روپ دھار رکھا ہے۔ الغرض مجھے اس جنگل کے متعلق اتنی اتنی خوفناک باتیں بتائی گئیں کہ یقیناً" میں ڈر گیا۔

اگر مجھے یہ باتیں کم پڑھے لکھے افسر یا جونیئر عملہ جو کہ اکثر توہم پرست ہوتا ہے، بتاتا تو میں ہرگز یقین نہ کرتا لیکن مجھے یہ باتیں ڈی۔ ایف۔ او محمد بشیر اور ایس۔ ڈی۔ او محمد یوسف سنا رہے تھے جو کہ بہت زیادہ پڑھے لکھے اور روشن خیال افسر تھے۔ انہیں توہم پرست اور وہمی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ خوفناک باتیں سن کر میں خوفزدہ ہوگیا اور میں جنگل میں سے گزرنے سے بھی ڈرنے لگا۔ اب جبکہ چوتھی رات ہم کھانا کھا کر چبوترے پر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری کرسی چبوترے کے کنارے پر تھی۔ چاند ابھی اوپر نہیں آیا تھا لیکن اوپر کو اٹھتا آرہا تھا۔ درختوں میں سے چاند کی کرنیں چھن چھن کر آتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ لیکن مجھے یہ اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ مجھے ان سے بھی خوف محسوس ہورہا تھا۔ پھر بھی ڈی۔ ایف۔ او محمد بشیر نے ایک قصہ چھیڑ ہی دیا۔

"میں یہ واقعہ سناتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں اور خوف سے میرے دل کی دھڑکنیں اور سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں یہ جملہ بمشکل ادا کیا۔ "یہ دیکھو خوف سے تمہیں میری انگلیاں کانپتی ہوئی دکھائی نہیں دے رہیں؟" میرے دل پر پہلے ہی ڈر سوار تھا۔ ڈی۔ ایف۔ او محمد بشیر جیسے جرأت مند افسر نے جس نے وہاں کئی دفعہ بڑے بڑے خطرناک درندوں کا سامنا کیا تھا جب خوف سے کانپتی ہوئی انگلیاں دکھائیں تو میں نے محسوس کیا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہورہے ہیں۔ "جہاں تم بیٹھے ہو، وہ یہیں بیٹھا ہوا تھا۔" محمد بشیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایس۔ ڈی۔ او جہانداد خان ...... اس کا

نام جہانداد خان تھا اور وہ صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور شہر کا رہنے والا تھا۔ تمہاری عمر کا خوبصورت نوجوان تھا۔ رات اسی طرح تھی چار مہینے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ تینوں ڈیوٹی پر نکل گئے تھے۔" اس نے محمد یوسف، محمد جمیل اور محمد فیصل کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں میں اور جہانداد خان ہی تھے۔ ہم دونوں آج ہی کی طرح چائے پی رہے تھے۔ مجھے اس جگہ کے قریب جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی ان جھاڑیوں میں رینگ رہا ہو۔ میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ ایسی آواز ہوا بھی پیدا کرتی ہے جب جھاڑیوں میں سے گزرتی ہے۔ مگر میں نے محسوس کیا جیسے میرے سر سے پاؤں تک سردی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی برف کی طرح سرد ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے کپ میں ذرا زیادہ چائے انڈیلی اور ایک گھونٹ میں پی لی۔ میرا خیال تھا کہ رات سرد ہے یا مجھے نزلے کا عارضہ ہونے والا ہے۔ اس کا علاج یہی سوچا کہ زیادہ چائے پی جائے۔ ایس۔ڈی۔او جہانداد خان بالکل ایسے ہی بیٹھا ہوا تھا جیسے تم بیٹھے ہو۔ اسے بھی یہاں آئے ہوئے چوتھی رات تھی۔ میں اسے اس جنگل کی ہیبت ناک اور پراسرار کہانیاں سنا رہا تھا۔ مجھ سے پہلے یہاں ڈی۔ایف۔او ملک محمد افضل ہوا کرتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ جو نیا افسر یہاں آتا ہے اس کے لئے پہلے چار پانچ روز بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ یہاں کی بدروحیں اسے بڑی بری موت مارتی ہیں اور اکثر اژدہا بن کر آتی ہیں۔ وہ رات ایس۔ڈی۔او جہانداد خان کی چوتھی رات تھی میں اس کے عقب میں سرسراہٹ سی سن کر اپنے جسم میں سرد لہر محسوس کر کے بھی کچھ اور سمجھتا رہا۔ جس طرح آج جھاڑیوں کی ٹہنیاں تمہارے بائیں بازو کو چھو رہی ہیں۔ اسی طرح یہی ٹہنیاں جہانداد خان کے بازو کو چھو رہی تھیں۔" ڈی۔ایف۔او محمد بشیر نے جب جھاڑیوں کا ذکر کیا تو میں نے اپنا بایاں بازو نہایت آہستہ سے وہاں سے ہٹالیا تاکہ جھاڑیوں سے دور ہو جائے۔ محمد بشیر کے سنانے کے انداز میں خوفزدگی کی جھلک بڑی صاف تھی۔ مجھے زیادہ ڈر اس لئے محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں آئے ابھی میری چوتھی رات تھی اور میں خطرے میں تھا۔ لیکن میں ایس ڈی۔او تھا۔ ڈی۔ایف۔او محمد بشیر اور دوسرے افسروں پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں ڈرا ہوا ہوں۔ "اب کے جھاڑیوں سے اٹھنے والی آواز ذرا بلند سنائی دی۔ محمد بشیر نے اپنی بات جاری رکھی۔" اف! میرے خدایا! وہ کیا منظر تھا؟ جھاڑیوں کی طرف اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں اسی کرسی سے کوئی ایک گز پیچھے مجھے دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔

نے رات کے اندھیرے میں بلی یا سفید خرگوش کی
چمکتی ہوئی آنکھیں تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ میں
نے تاریک جنگل میں شیر کی چمکتی ہوئی آنکھیں
بھی دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے ایس۔ ڈی۔ او
جہانداد خان کے عقب میں جو آنکھیں دیکھیں وہ
نہ بلی کی طرح تھیں اور نہ ہی شیر کی آنکھوں
جیسی۔ گول رنگ (Ring) تھے۔ ہر رنگ کا
رنگ الگ تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ اگر آنکھیں
ہی ہیں تو کون سے درندے یا جانور کی ہیں۔ مجھے
ایسے لگا جیسے موسم یکلخت سرد ہوگیا ہو۔ میں نے
جہانداد خان کو خبردار کیا کہ اس کے پیچھے کوئی
درندہ ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کسی مرے ہوئے
انسان کی بدروح ہے۔ اور یہ جہانداد خان کو
لینے آئی ہے۔ جہانداد خان کو یہاں آئے ابھی
دو تھی رات تھی۔ میری زبان بند ہوگئی۔ جہانداد
خان میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے نہ
پوچھا کہ میں بولتے بولتے چپ کیوں ہوگیا ہوں۔
اور میں نے نظریں کہاں جمالی ہیں۔ میرا خیال ہے
کہ سردی کی جو لہر آئی تھی۔ اس نے جہانداد خان
کو بھی سکتہ طاری کردیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے
بدروحوں کی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ جب کوئی بد
روح کمرے میں آتی ہے تو خواہ کتنی ہی گرمی ہو'
کمرہ سرد ہوجاتا ہے اور انسان اپنے جسم میں سرد
لہر دوڑتی محسوس کرتا ہے۔ یہ آنکھیں یقیناً"
بدروح کی تھیں۔ میں ایک ذمہ دار فارسٹ افسر
ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے تھا۔ میں نے
دھیمی سی سرگوشی میں جہانداد خان سے کہا کہ
آگے پیچھے نہ دیکھنا' میں آتا ہوں۔ میں اپنے
کمرے میں گیا اور ہولسٹر سے ریوالور نکالا اس
میں چھ گولیاں تھیں۔ مجھے اندر کمرے میں کچھ
گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ایک
آواز بھی تھی جو انسانی معلوم ہوتی تھی۔ میں
واپس آیا تو میرے جسم میں خون جم کر رہ گیا۔ میں
نے دیکھا کہ جس کرسی پر جہانداد خان بیٹھا ہوا تھا
وہ گری پڑی تھی۔ اور جہانداد خان وہاں نہیں تھا
اور وہ چمکتے ہوئے گول دائرے والی آنکھیں بھی
غائب تھیں۔ وہ یہیں بیٹھا ہوا تھا جہاں آج چار
مہینوں بعد تم بیٹھے ہوئے ہو۔ اسے بھی یہاں
آئے چوتھی رات تھی۔ اور وہ تمہاری ہی طرح
خوبصورت جوان اور ایس ڈی۔ او تھا۔ اسے بد
روح لے گئی تھی۔" ڈی۔ ایف۔ او محمد بشیر کی
آواز میں اب خوفزدگی بھی تھی اور اس کی آواز
رندھیائی ہوئی بھی معلوم ہوتی تھی۔ میں ایسے
محسوس کرنے لگا کہ میں اپنے پیچھے جھاڑیوں میں
سرسراہٹ سنی ہے۔ لیکن میں پیچھے دیکھنے سے
گھبرا رہا تھا۔ میرے ساتھ کے دوسرے افسر ڈی
۔ ایف۔ او محمد بشیر کی بات بڑے غور سے سن
رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے منہ سے عجیب سی

آواز نکال کر خوفزدگی کا اظہار کرتا تھا۔ "پھر ہوا یہ کہ اچانک میرا خون گرم ہوگیا۔" محمد بشیر نے کہا۔"مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ درختوں سے آتی چاندنی میں مجھے نظر آیا کہ جہانداد خان چلا آرہا ہے۔ میں دوڑ کر اندر گیا اور ٹارچ اٹھا لایا۔"اس نے اس طرف اشارہ کیا جس طرف درخت اور جھاڑیوں کو کاٹ کر راستہ بنایا گیا تھا اور بولا۔ "میں نے ٹارچ کی روشنی ادھر کی۔ اف! میرے خدا! مجھے اپنی سانس حلق میں رکتی ہوئی معلوم ہوئی اور میں نے صاف محسوس کیا کہ میری حرکت قلب بند ہو رہی ہے۔ میرے سامنے بڑا ہی ہیبت ناک منظر تھا۔ ایک بہت بڑا اژدہا رینگتا جارہا تھا۔ وہ تمہارے جسم جتنا موٹا ہوگا اور اس کی لمبائی بیس اور پچیس فٹ کے درمیان ہوگی۔ اس کے سر کے ساتھ ساتھ جہانداد خان جارہا تھا۔ میں فوراً" ایک ذمہ دار فارسٹ آفیسر کے روپ میں آگیا۔ میں یہ تو جان گیا کہ یہ اژدہا انسانی بد روح ہے۔ اور جہانداد خان کو ہپناٹائز کر کے اپنے ساتھ لے جارہی ہے۔ لیکن میں اتنے خوبصورت اور جوان ایس۔ڈی۔ او کو ضائع نہیں کرسکتا تھا......"میں نے بلند آواز سے کہا۔ جہانداد خان! ہوش میں آؤ' واپس آجاؤ۔ جہانداد خان نے جواب دیا کہ میں واپس نہیں آسکتا۔ اس نے میرا ہاتھ منہ میں لے رکھا ہے۔ تب میں نے دیکھا کہ اژدہا نے اپنا منہ دو تین فٹ اوپر اٹھا رکھا تھا اور جہانداد خان کا ہاتھ اس کے منہ میں تھا۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔ میں اس پر ریوالور فائر کرتا ہوں۔ لیکن جہانداد خان نے گھبرا کر کہا فائر نہ کرنا۔ جسم پر گولی لگنے سے یہ نہیں مرے گا۔ اور پھر یہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں اژدہا کے سر پر تو گولی چلا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح جہانداد خان کا ہاتھ اڑ جاتا۔ جسم پر چلاتا تو واقعی مرتے مرتے جہانداد خان کو چبا ڈالتا "میں تھوڑی دور تک اس کے پیچھے گیا۔ مجھے گھٹا کی طرح گرج سی سنائی دی جو آسمان سے نہیں زمین سے اٹھی تھی۔ جہانداد خان نے بلند آواز سے کہا"بشیر! واپس چلے جاؤ۔ میں اس سے آزاد ہونے کی کوشش کروں گا۔" میں بے بسی سے رک گیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اژدھا جہانداد خان کو ساتھ لئے جنگل میں غائب ہوگیا۔ میں کیسے بتاؤں کہ میں نے وہ رات کس طرح گزاری۔ بس یوں سمجھئے کہ میری تمام رات مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے گزری اور میں ایک پل بھی نہ سوسکا بار بار جہانداد خان کا خوبصورت چہرہ میری آنکھوں میں گھوم جاتا تھا۔ صبح ہوئی تو میں نے آٹھ جوان اپنے ساتھ لئے اور اژدھا کے رینگنے کے نشان دیکھتا جنگل میں گیا۔ جہانداد خان کو ساتھ لئے جدھر سے گزرا تھا۔

وہاں سے جھاڑیاں روندی ہوئی تھیں۔ "اف! میرے خدا! میں نے کیا دیکھا ابھی تک وہ منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ اژدہا کنڈلی مارے گہری نیند سو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی پانی کا ایک بہت بڑا تالاب تھا اور اسی تالاب کے کنارے اژدہا سو رہا تھا۔ اس کے جسم کا ایک حصہ تقریباً پانچ فٹ لمبائی میں موٹا تھا۔ یہ اس کا پیٹ تھا جس میں میرا ساتھی ایس۔ ڈی۔ او جہانداد خان پڑا تھا۔ اژدہا سالم انسان یا جانور کو نگل لیتا ہے اور گہری نیند سو جاتا ہے۔ بعض اژدہے پورا مہینہ سوئے رہتے ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ۔ ان کا شکار پیٹ میں ہضم ہو جاتا ہے تو وہ جاگ اٹھتے ہیں۔ میں نے نشست لے کر ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں اژدہے کی سر پر فائر کر دیں۔ اس کے سر کے ٹکڑے ہوا میں اڑے۔ اس کا جسم کنڈلی سے کھل گیا۔ کچھ دیر تک جسم ہلتا رہا جیسے رینگنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر جسم ساکن ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اژدہے کا پیٹ چاک کیا۔ اس میں میرے ساتھی جہانداد خان کی لاش پڑی تھی۔ اژدہا کے پیٹ کے تیزاب نے جہانداد خان کی کھال اتنی نرم کر دی تھی کہ ہاتھ لگاتے تو کھال اترنے لگتی تھی۔ ہم سب نے مل کر وہیں جہانداد خان کے لئے قبر کھودی اور بڑی احتیاط سے وہیں اسے دفن کر دیا۔ چار مہینے پہلے وہ یہیں بیٹھا تھا جہاں تم بیٹھے ہوئے ہو۔" مارے خوف کے میرا پسینہ نکل آیا تھا۔ میں اس کرسی سے اٹھ کر جھاڑیوں سے دور بیٹھنا چاہتا تھا۔ مگر اس خیال سے نہ اٹھا کہ میرے یہ ساتھی افسر مجھے بزدل کہیں گے۔ لیکن جب محمد بشیر نے ایک بار پھر کہا کہ جہانداد یہیں بیٹھا تھا۔ جہاں آج تم بیٹھے ہوئے ہو تو میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے کہا کہ میں پانی پی آؤں۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا اور پانی پیئے بغیر باہر آکر میں نے اپنی کرسی وہاں سے اٹھائی۔ اور برآمدے کی برجی کے قریب رکھ کر بیٹھ گیا۔ تمام افسروں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ڈی۔ ایف۔ او محمد بشیر نے کہا۔ "تم کچھ دلیر معلوم ہوتے ہو۔ تم سے پہلے میں نے جس افسر کو بھی یہ کہانی سنائی وہ آدھی کہانی سن کر ہی وہاں سے اٹھ کر کرسی برآمدے کے قریب لے آیا۔ تم پوری کہانی سن کر وہاں سے پانی پینے کے بہانے اٹھے ہو۔ میں جانتا ہوں تم نے پانی نہیں پیا۔ تم وہاں سے اٹھنا چاہتے تھے کہ اژدہا آجائے گا۔ تم اتنے ڈرپوک نہیں ہو۔" وہ ہنس رہے تھے اور میرا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ "جناب خلیق احمد صاحب" محمد بشیر نے مجھے کہا۔ یہاں ڈاک بنگلے کے ارد گرد دور دور تک کوئی اژدہا یا بد روح نہیں ہے۔ یہاں جو نیا ساتھی افسر آتا ہے اسے ہم اس جگہ کرسی پر بٹھا

کر یہ کہانی سناتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس حد تک نڈر یا ڈرپوک ہے۔ تم سب سے کم ڈرپوک نکلے۔" "آپ سب کا خیال غلط ہے۔" میں نے کہا میرے جسم پر ہاتھ پھیرو میں پسینے میں نہایا ہوا ہوں۔ میں تو کہانی سننے سے پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ میں نڈر نہیں ہوں۔" "ایک ذمہ دار افسر کو نڈر ہونا چاہئے۔ کیونکہ زندگی میں اس کا واسطہ طرح طرح کی خطرات و مشکلات سے پڑتا رہتا ہے۔ ایس۔ ڈی۔ او محمد یوسف نے کہا۔ وہ سب ہنس رہے تھے اور میں سنجیدہ تھا۔ بہرحال خوف سے میری جو حالت ہوئی وہ شاید میں پوری طرح بیان نہیں کرسکا۔ بخدا اتنا عرصہ گزرنے کا بعد آج بھی جب اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور دل کی حالت غیر ہوجاتی ہے۔ میں نے وہاں دو سال تک سروس کی بعد میں میری پوسٹنگ مغربی پاکستان کے مشہور و معروف جنگل "چھانگا مانگا" میں ہوگئی۔ اور یوں میں مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) کے جنگل "سندربن" سے ایک عجیب یاد اپنے ساتھ لے کر آیا۔ جسے میں تا زندگی نہ بھول سکوں گا۔

آنکھ مچولی

آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے
کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ
ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔
ہماری کاوش آپ تک اور
آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے مُعاون

ہمارے مَددگار

صوبہ سندھ اور بلوچستان میں آنکھ مچولی کے ایجنٹ

محمد حسین برادرز — کراچی — ۷۷۲۴۱۲۶
مہران نیوز ایجنسی — حیدرآباد — ۲۰۱۲۸
سلمان برادرز — نواب شاہ — ۲۴۱۴
ایم ایم ٹریڈرز — کوئٹہ — ۷۵۰۰۲

خط و کتابت کے لیے
سرکولیشن مینیجر
ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ا۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

ڈراپسن

محمّد علی انصاری

سناؤں کیا تمہیں کہ ہے عجب یہ داستاں میری
کہے بن رہ نہیں سکتی ہے پھر بھی یہ زباں میری
بڑی ہی سرد شب تھی وہ دسمبر کے مہینے کی
مگر پھر بھی تھیں ماتھے پر مرے بوندیں پسینے کی
تھا قبرستان کا پُر ہول منظر سامنے میرے
تصوّر میں مرے ہر سمت تھے جنّات کے چہرے

دہل جاتا تھا دل میرا ذرا سی پاکے آہٹ بھی
تھی دہشت سے بُری حالت اور اس پر کپکپاہٹ بھی
عجب تھا حال ڈرتا اور مرتا جارہا تھا میں
قرآنی آیتوں کا وِرد کرتا جارا تھا میں
نظر آئی اچانک مجھ کو اک عورت اندھیرے میں
کھڑی تھی درمیاں قبروں کے اک مورت اندھیرے میں
جو دیکھا غور سے میں نے قبر کی اوٹ میں چھپ کے
پڑی تھی لاش اِک معصوم بچے کی قریب اس کے
تھا سرتن سے جدا جس کا بدن بھی خون آلودہ
یہ دیکھا تو اچھل کر حلق میں دل آگیا میرا
نہ دیکھا تھا کہیں میں نے کبھی ایسا کوئی منظر
عجب دہشت سی طاری تھی عجب اک خوف تھا مجھ پر
کہیں نہ دیکھ لے مجھ کو' یہی اک خوف دل میں تھا
مگر وہ بے خبر مجھ سے تھی میں اس کے عقب میں تھا
اچانک وہ مڑی تو دیکھ کر صورت کو میں اس کی
دبا بالکل سکا نہ خوف و ڈر سے چیخ کو اپنی
سُنی جو چیخ تو ڈائریکٹر پُرجوش سا ہو کے
بلند آواز سے چیخا کہ یہ سین ہوگیا "او کے"

تعلیم

قومی ترقی کا ایک اہم ستون!

ملک سے ناخواندگی دُور کر کے فنّی اور پیشہ ورانہ
تعلیم کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بامعنیٰ
تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

حبیب بینک اپنی اسکول بینکنگ اسکیم، اسپانسرڈ
اسکالرشپ اور قرضِ حسنہ اسکیموں کے ذریعے
ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے اپنا بھرپور کردار
ادا کر رہا ہے۔

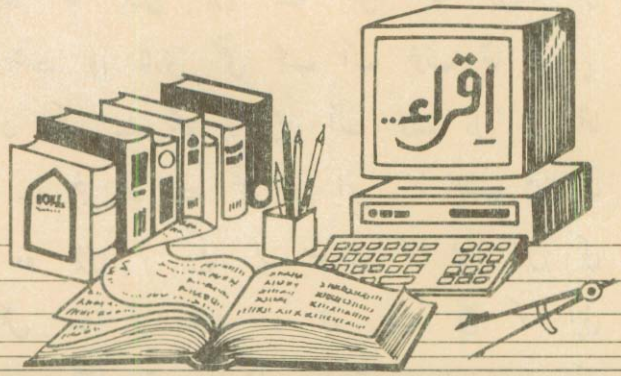

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PID (Islamabad)

مولانا شبلی نعمانی

مدرسے کی عمارت آہستہ آہستہ تیار ہو رہی تھی۔ ایک دن دیکھا کہ ایک مولوی صاحب جب طالب علموں کے ایک گروہ کے ساتھ آئے لڑکوں نے مزدوروں کو ہٹادیا۔ خود کام کرنا شروع کردیا۔ راج کام بتاتے رہے، کوئی گارا لایا، کسی نے اینٹیں جوڑنا شروع کیں۔ کوئی خالی تسلے لے کر جانے لگا۔ سب بڑی محنت سے کام میں مصروف ہوگئے۔ جو مولوی صاحب ان لوگوں کے ساتھ تھے، انہوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بڑی دردمندی سے دعا کرنے لگے کہنے لگے۔ "اللہ تعالیٰ یہ چند کم حیثیت بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں۔ ان کی مزدوری قبول فرما۔ مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانوں کو بہا لئے جارہا ہے۔ ان کی مذہبی حالت، علم، طور طریقے سب اس طوفان کی زد میں ہیں۔ یا اللہ ان چند ناتواں بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھال لیں گے تو

ہی ان کی عزت آبرو رکھنے والا ہے۔" مولوی صاحب یہ الفاظ کہتے جاتے تھے اور آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرتے جارہے تھے۔سارے دیکھنے والے مولوی صاحب کے لفظوں کا اثر اپنے دل میں محسوس کررہے تھے۔

ان مولوی صاحب کا نام تھا' مولوی محمد شبلی نعمانیؒ' زبردست عالم' مشہور استاد' ادب اور تاریخ کی بہت سی کتابوں کے مصنف' سارے ملک میں ان کے نام کا شہرہ تھا باہر کے ملکوں میں بھی ان کی بڑی شہرت اور عزت تھی۔ دُھن کے پورے کام کے پکّے۔ اس وقت طالب علموں میں گھرے ہوئے سب کے ساتھ گھُل مل کر مدرسے کی عمارت بنوانے میں مصروف تھے۔ یہ مدرسہ مکمل ہوا۔ بہت مشہور ہوا۔ ہزاروں طالب علم یہاں علم حاصل کرنے آئے اور مشہور ہوئے۔ اس مدرسے کا نام تھا "ندوۃ العلماء" آج بھی یہ مدرسہ اعلیٰ تعلیم کا بڑا عالی شان مرکز ہے۔

مولوی محمد شبلی نعمانی اترپردیش کے ایک شہر اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے اور عین اس دن پیدا ہوئے تھے جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں نے اعظم گڑھ جیل کا پھاٹک توڑ کر قیدیوں کو آزاد کردیا تھا۔ قدرت کی طرف سے یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس دن پیدا ہونے والا بچہ بڑا ہو کر پرانے علم کو جو نئے علم کے سامنے ایک قیدی ہو کر رہ گیا ہے' قید سے آزاد کردے گا۔ مولوی شبلی کے والد مولوی حبیب اللہ وکیل تھے۔ زمیندار بھی تھے۔ نیل اور شکر کی کوٹھیاں بھی تھیں۔گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔شبلی کی پرورش لاڈ پیار میں ہوئی۔ اچھے استادوں نے پڑھایا۔ شبلی بڑے ذہین طالب علم تھے۔استادوں سے خوب علم حاصل کیا۔ انہیں علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔علم کی خاطر دوسرے شہروں میں گئے۔ لاہور میں ایک بڑے مشہور استاد تھے مولانا فیض الحسن' شبلی ان سے پڑھنے لاہور آئے۔ ایک بڑے مشہور عالم سہارن پور میں تھے۔شبلی سہارن پور بھی گئے اور ان سے بھی تعلیم حاصل کی۔تعلیم مکمل ہوگئی تو باپ نے کہا"وکالت کا امتحان بھی پاس کرلو اور وکالت کرو"۔شبلی نے باپ کے کہنے سے وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔ وکالت کرنے لگے مگر اس کام میں ان کا جی نہیں لگا۔ انہیں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وکالت چھوڑ کر نوکری کرلی یہ ملازمت بھی انہیں پسند نہیں آئی۔ پسند آجاتی تو قوم کا بڑا نقصان ہوتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمان بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ انگریز حاکم انہیں شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان ہی برصغیر میں ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

انگریز اپنی تہذیب، اپنا علم اور اپنی زبان بڑی تیزی سے پھیلا رہے تھے۔ نئی چیزوں کو اختیار کرنے کی ایک دوڑ ہو رہی تھی مگر مسلمان اس دوڑ میں بہت پیچھے تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی علم اور طور طریقے اختیار کر کے اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے دور ہو جائیں گے۔ اس زمانے میں ایک باہمت مسلمان سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کو نیا حوصلہ دیا۔ سیّد احمد خان نے انہیں سمجھایا کہ نئے علم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مسلمان اگر نئے علم حاصل نہیں کریں گے تو دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ سید احمد نے یہ بھی کہا کہ اسلام دینِ فطرت ہے نئے علم اور خیالات اس سے ٹکرائیں گے تو اسلام کی خوبیاں اور بڑائیاں زیادہ نکھر کر سامنے آئیں گی۔ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا اور وہ آگے بڑھیں گے۔

یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے سید احمد نے مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ میں ایک کالج قیام کیا۔ سارے برصغیر سے مسلمان نوجوان تعلیم حاصل کرنے یہاں آنے لگے۔ شبلی کے ایک بھائی بھی یہاں پڑھتے تھے۔ شبلی ان سے ملنے آئے۔ سید احمد خان سے ملے۔ کالج انہیں بہت اچھا لگا۔ اتفاق یہ کہ فارسی کے استاد کی جگہ خالی تھی، شبلی نے درخواست دی، سید احمد خان نے انہیں یہ جگہ دے دی۔ اب شبلی صحیح جگہ پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے سارے علم حاصل کر لئے تھے۔ یہاں انہیں نئے علم اور ان کا زور نظر آیا۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو اب اپنے علم میں کیا تبدیلی کرنا چاہئے۔

اس زمانے کے انگریز اور یورپی عالم مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں بڑے زور و شور سے کتابیں لکھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی پرانی پرانی کتابوں کو ڈھونڈ کر دوبارہ شائع کیا مگر جہاں کہیں موقع ملا وہیں خاموشی سے اعتراض بھی کر دیا۔ چٹکی بھی لے لی۔ پرانے انداز کے عالم انگریزی نہیں جانتے تھے وہ اس شرارت سے بے خبر تھے اور کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ ایک انگریز عالم ولیم میور نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ وہی طریقہ رکھا جگہ جگہ اعتراض کئے۔ سید احمد خاں نے یہ کتاب دیکھی تو انہیں بڑا رنج ہوا۔ انہوں اس کتاب کا جواب لکھنے کے لئے انگلستان کا سفر کیا وہاں کتب خانے دیکھے اور پھر "خطبات احمدیہ" کے نام سے جواب لکھا۔ مولوی شبلی پرانے انداز کے عالم تھے مگر علی گڑھ آکر انہوں نے سید احمد خاں کے ساتھ کام کیا تو وہ نئے انداز کو پوری طرح سمجھ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک انگریز پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی۔

آرنلڈ نے ان سے عربی پڑھی اور انہیں فرانسیسی پڑھائی۔ مولوی شبلی کو پروفیسر آرنلڈ سے بڑا فائدہ پہنچا۔ آرنلڈ چھٹیوں میں انگلستان جا رہے تھے۔ شبلی بھی ان کے ساتھ اسلامی ملکوں کی سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اس سفر سے بھی انہیں بڑا فائدہ پہنچا اور انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ آزاد ملک کے لوگوں اور غلام ملک کے لوگوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس سفر میں شبلی ترکی بھی گئے تھے۔ ترکی کے سلطان نے انہیں ایک تمغہ، جس کا نام تمغۂ مجیدی تھا' دیا۔ اس طرح مولوی شبلی کے علم کو دوسرے ملکوں میں سراہا گیا۔

اب شبلی نے مسلمانوں کی تاریخ کو اس انداز سے لکھنا شروع کیا کہ مغربی عالموں کے اعتراضوں کا جواب بھی ہوجائے گا اور مسلمان نوجوانوں میں اپنی تاریخ کے مطالعے کا شوق بھی پیدا ہوجائے۔ انہیں صحیح حالات کا علم ہو اور وہ بیجا اعتراضوں کو سمجھ سکیں۔ انہوں نے عباسی خلیفہ مامون رشید کی سوانح عمری "المامون" کے نام سے لکھی۔ مامون کو علم سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس نے ایک بہت بڑا "دارالترجمہ" قائم کیا تھا۔ دور دور سے عالموں کو بلا کر جمع کیا تھا۔ یہاں بے شمار کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ شبلی نے اس کی سوانح عمری بڑی محنت سے لکھی۔ اس کے بعد اسلامی قانون کے بہت بڑے ماہر امام ابو حنیفہ کے حالات "سیرتِ نعمان" کے نام سے لکھے۔ اسلامی ملکوں میں جو کچھ دیکھا تھا اس کے بارے میں بھی ایک سفرنامہ لکھ دیا۔ ۱۸۹۴ء میں انگریزی حکومت نے انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ یہ خطاب صرف بڑے بڑے عالموں کو دیا جاتا تھا۔

سیّد احمد خاں کے انتقال سے شبلی کا دل علی گڑھ سے اچاٹ ہوگیا۔ وطن واپس چلے گئے۔ یہاں انہوں نے ایک مدرسہ نیشنل اسکول کے نام سے قائم کیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اس زمانے میں ان کی مشہور کتاب "الفاروق" شائع ہوئی۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح عمری ..... ہے اور بہترین سوانح عمری سمجھی جاتی ہے۔ وطن میں کچھ دن گزارنے کے بعد مولوی شبلی حیدر آباد دکن چلے گئے۔ یہاں چند برس رہے علمی کام کرتے رہے۔ یہاں رہ کر انہوں نے امام غزالیؒ کے بارے میں ایک کتاب "الغزالی" لکھی۔ مشہور شاعر اور بزرگ مولانا روم کی سوانح عمری لکھی۔ مشہور مرثیہ گو شاعروں انیس اور دبیر کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ بعض اور کتابیں لکھیں۔ چار برس میں بڑا کام کیا اور قومی بیداری میں بڑا حصہ لیا۔

حیدر آباد سے شبلی لکھنؤ آئے اور یہاں ندوۃ العلماء کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ بڑی محنت کی۔ ندوۃ کو ایک اعلیٰ درجے کی درس گاہ

بنادیا۔ یہاں انہوں نے فارسی شاعری کی مشہور تاریخ "شعر العجم" لکھی۔ "شعر العجم" بھی بڑی مشہور کتاب ہے۔ اس زمانے میں یہ ہوا کہ شبلی وطن گئے ہوئے تھے۔گھر میں بندوق بھری رکھی ہوئی تھی۔ اتفاق سے چل گئی۔ چھرے شبلی کے پیر میں لگے اور ایسے لگے کہ پیر کو کاٹنا پڑا مگر وہ بڑے حوصلے اور ضبط کے انسان تھے پہلے کی طرح کاموں میں مصروف رہے۔ شبلی نے آٹھ برس ندوۃ کی خدمت کی پھر وطن واپس جا کر نیشنل اسکول کی دیکھ بھال کی۔ اب یہ اسکول عالی شان کالج بن گیا ہے اور اس کا نام شبلی کالج ہے۔ شبلی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہوجائے جو ان کے کام کو آگے بڑھائے۔علمی خدمت کرے اور مسلمانوں میں بیداری پیدا کرے۔ اس کام کے لئے انہوں نے اپنا باغ اور بنگلہ دے دیا۔ ایک ادارہ "دارالمصنفین" بنایا۔ یہ ادارہ آج بھی قائم ہے اور زبردست علمی کام کررہا ہے۔ شبلی کو مسلمانوں کی ترقی سے دلچسپی تھی۔ وہ مسلمانوں کی بھلائی کے ہر کام میں شریک رہتے تھے اور تحریک آزادی میں بھی پیش پیش تھے۔ انگریزوں نے کانپور کی ایک مسجد شہید کردی اور مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تو شبلی نے بڑی زبردست نظمیں لکھیں۔ آج بھی ہم ان نظموں کو پڑھتے ہیں تو دل پر خاص اثر ہوتا ہے شبلی اردو اور فارسی کے بڑے شاعر تھے مگر ان کی نثر نے ان کی شاعری کو دبالیا۔

شبلی بڑے عرصے سے یہ چاہتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے حالات تفصیل سے لکھے جائیں تاکہ تمام لوگوں کو آپ کے بارے میں صحیح معلومات ہوں۔ یہ بہت بڑا کام تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو کچھ لکھا جاچکا تھا اس کو جمع کرنا، جائزہ لینا، دانہ دانہ جمع کرکے خزانے کی شکل دینا، یہ سب بڑا مشکل کام تھا۔ سرمایہ بھی درکار تھا۔ حوصلہ بھی درکار تھا مگر مولوی شبلی دُھن کے پکے تھے۔ انہوں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا اور "سیرت النبیؐ" کی پہلی دو جلدیں لکھ دیں۔ بعد میں ان کے لائق شاگرد سید سلیمان ندوی نے یہ کام مکمل کردیا۔ "سیرت النبیؐ" اتنی بڑی شان دار اور زبردست کتاب ہے کہ ہر مسلمان اسے پڑھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایسی زبردست کتابیں کم لکھی جاتی ہیں۔ "سیرت النبیؐ" سے اردو زبان مالا مال ہوگئی ہے۔

مولوی شبلی اردو زبان کے بہت بڑے لکھنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اردو نثر لکھنے والے پانچ مصنف ایسے ہیں جنہیں بہت بڑا نثر نگار سمجھا جاتا ہے۔ سید احمد، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، الطاف

اقوال نبیؐ

○ ..... بُردبار (برداشت کرنے والا) وہی ہے جس نے ٹھوکریں کھائیں اور دانا وہی ہے جس نے تجربہ حاصل کیا۔

○ ..... اللہ تعالیٰ ہنرمند مومن کو پسند کرتا ہے۔

○ ..... آدمی کو اپنی ساری حاجتیں (ضرورتیں) اللہ ہی سے مانگنی چاہئیں۔ یہاں تک کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ ہی سے مانگے اور اگر نمک کی ضرورت ہو تو وہ بھی اللہ سے مانگے۔

○ ..... وہ شخص طاقت ور نہیں ہے جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دیتا ہے بلکہ دراصل طاقت ور وہ ہے جو غصے کے موقع پر اپنے اوپر قابو رکھتا ہے۔

○ ..... مومنوں میں سے ایمان کے اعتبار سے کامل ترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔

مرسلہ ..... عدیل احمد عدی. کراچی

حسین حالی اور مولوی شبلی نعمانی۔ شبلی نے اُردو نثر کو جو انداز دیا آج کی نثر کا علمی انداز وہی ہے۔

مولوی شبلی بہت بڑے آدمی تھے۔ بڑی عزت تھی۔ لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ مزاج کے سادے، رحم دل اور ملنسار آدمی تھے۔ ایک دن کہیں جارہے تھے دیکھا کہ کچھ آدمی رو رہے ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے لوگوں نے کہا ان کا بیل مرگیا ہے۔ اس کے سہارے کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ رو رہے ہیں کہ اب کیا کریں گے؟ مولوی صاحب نے جیب سے دس روپے نکال کر ان کو دے دیئے۔ سادگی ایسی کہ ایک دفعہ ندوۃ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مولوی صاحب ایک حجرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی آدمی نہیں تھا جو جھاڑو دیتا اور صفائی کرتا۔ مولوی صاحب نے خود ہی جھاڑو دی اور کمرے کی صفائی کرلی۔ یہ بڑے پن کی بات ہے اپنے کام کرنے سے کسی آدمی کی عزت نہیں گھٹتی عزت بڑھتی ہے۔

مولوی شبلی کو مٹھاس بہت پسند تھی۔ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ بیٹھے ہیں باتیں ہورہی ہیں، ایک پلیٹ میں شکر رکھی ہوئی ہے مولوی صاحب باتیں بھی کررہے ہیں اور شکر بھی کھاتے جارہے ہیں۔ شبلی بڑے خود دار اور غیرت مند انسان تھے۔ شہرت اور دولت کی کبھی پروا نہیں کی۔ ساری زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔

مولوی شبلی "سیرت النبیؐ" کی دو جلدیں لکھ چکے تھے۔ آگے لکھنے کا ارادہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بلاوا آگیا۔ ۱۹۱۴ء میں اسی مہینے کی ۱۸ تاریخ کو رخصت ہوگئے مگر اس طرح کہ ان کا نام آج بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگار اور قومی خدمتوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے اور ہمیشہ مشہور رہے گا۔ ایسے زبردست عالم قوم کے محسن اور سچی لگن رکھنے والے انسان ہر قوم کا فخر ہوتے ہیں۔

عمران بوبی کی شوخیاں

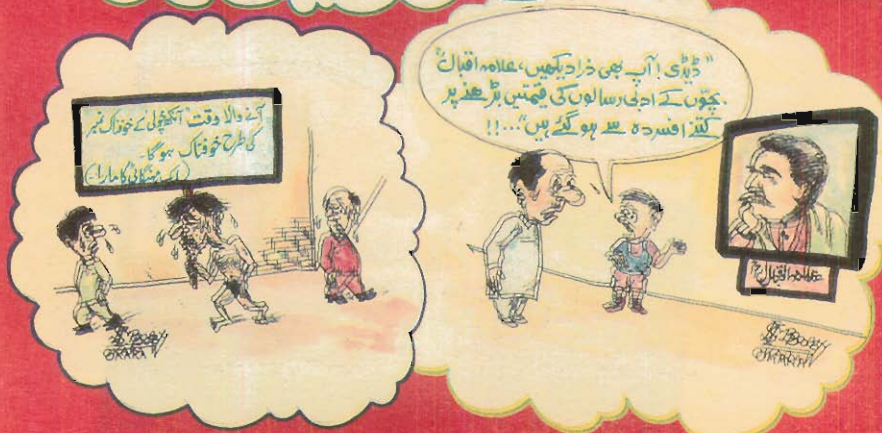

امریکہ میں خون کی ہولی

سراب ایک قتل

عمر صدیقی

تڑ تڑ تڑ بائیس ریوالوُرہ کی گولیوں نے ایک ساتھ دیوار پر لگ کر خوفناک ارتعاش پیدا کیا، جس میں صدر ریگن اور وائٹ ہاؤس کے پریس سیکریٹری جیمس بریڈی زخمی ہوگئے۔ مگر یہ یادوں کو تازہ کرنے والی تصویریں ہیں جو ۱۹۸۱ء کی ایک فلم کے دوران بنائی گئی تھیں۔ جس کو دوبارہ (T.V) کی ایک نئی فلم (H - 80) کی صورت میں بنایا گیا۔ اس میں حصہ لینے والے سب اداکار ہیں نہ کہ اصلی چہرے۔

سب سے اوپر دائیں والی تصویر میں بریڈی کا کردار بیو برائیجس نے ادا کیا۔ جو اپنے قاتل سے ناواقف ہے وہ قاتل اس کے بالکل پیچھے ہی کھڑا ہے اور اس پر فائر کر رہا ہے، قاتل جان ہنکلے ہے جس کا اصلی نام اسٹیون فلائن ہے۔ اس فلم میں برائن کلارک نے ریگن کا کردار ادا کیا ہے۔

وہ اس لئے گر گیا ہے کہ اس کے سینے میں گولیاں آر پار ہوگئیں، اور دوسری طرف اس کے سر پر بھی گولی لگی لیکن اصلی جیمس بریڈی کے مقابلے میں برائیجس ایک نرم گدے پر گر رہا ہے، جب کہ وہ سخت فرش پر گرا ہوگا۔ برائیجس نے میک اپ کے ذریعے بریڈی کا روپ دھارا تھا۔ مگر کلارک کو میک اپ کی زیادہ ضرورت ہی نہ پڑی وہ اس لئے کہ اس کا چہرہ ریگن سے ویسے ہی ملتا تھا۔ وہ حیرت ناک حد تک ریگن سے ملتا جلتا ہے جیسے آپ تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ منظر تھے اس نئی فلم کے جس کا نام "جیمس بریڈی کی کہانی" ہے جو ۱۷، ۱۸ دسمبر کو اس اصلی جگہ بنائی گئی جہاں واقعی گولیاں لگی تھیں۔ یہ جگہ واشنگٹن ہلٹن ہوٹل کا ایک حصہ تھی۔ یہ فلم دراصل اصلی بریڈی کی بہادری کی داستان ہے۔ اس نے فائرنگ سے زخمی ہونے کے بعد بڑے حوصلے سے اپنی بیماری کا مقابلہ کیا اور موت کو شکست دے دی۔

اصلی روپ

صائمہ دلدار

"ڈیئر گرلز! بُوا نے کھانا پکا لیا ہے لہٰذا حملے کی تیاری کردو۔" تحریم نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے اعلان کیا۔سب لڑکیاں اس کی شرارت پر مسکراتے ہوئے ہال کی جانب لپکنے لگیں۔

"نہیں جانا سمیرا!" تحریم نے دوسری لڑکیوں کے برعکس سمیرا کو اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر کہا۔

نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے۔" سمیرا نے جواب دیا۔ تحریم نے سر جھٹکا اور وہاں سے چلی آئی۔ اصرار اس نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ سمیرا تھی ہی عجیب۔عموماً" وہ دن کا ایک کھانا گول کر جاتی تھی۔ اور اگر کوئی کھانے کا اصرار کرتا تو الٹا کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی چنانچہ اب انہوں نے اصرار کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

"میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔" سمن ہاسٹل میں اپنے ساتھ بیٹھی تحریم سے مخاطب ہوئی۔"ہاں مجھے بھی تمہاری حالت محسوس ہو رہی ہے۔ یوں کرو تھوڑا بہت کھا کر سر درد کی کوئی گولی لو اور سو جاؤ۔ ابھی یہاں تو لڑکیاں کافی دیر بیٹھیں گی۔" اور سمن نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ سمن اٹھ کر اپنے کمرے

کی جانب چلی۔ کمرہ نمبر ۵ اس کا کمرہ تھا ایک ایک کمرے میں چھ چھ چارپائیاں تھیں گویا ایک کمرہ چھ لڑکیوں کا تھا۔ سمن نے اپنے کمرے کا دروازہ بند دیکھا تو حیران ہوئی۔ سب دروازے تو کھلے تھے۔ شاید ویسے ہی بند ہوں وہ وہم سمجھ کر دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ کھٹ پٹ کی آواز پر رک گئی۔ "چور!" یہ سوچ ہی اسے خوفزدہ کر گئی۔ پہلے سوچا کہ شور مچادے مگر پھر خیال آیا کہ چور کو دیکھا جائے۔ اس نے دبے پاؤں دروازے کی جھری سے آنکھ لگادی۔ اندر کا منظر اچھے بھلے کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ سمن حیرت و خوف سے جکڑی کھڑی تھی۔ اندر ایک بھیانک اور ڈراؤنی صورت عورت بال بکھرائے اپنے آگے طرح طرح کے کھانے رکھے بیٹھی تھی۔ کبھی وہ کچھ اٹھا کر منہ میں رکھ لیتی کبھی کچھ۔ سمن میں یکدم جوش سا پیدا ہوا اور وہ واپس ہال کی جانب بھاگی۔ لڑکیاں اس کا سراسیمہ چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ وہ پہلے تو خوف کے مارے کچھ بتا ہی نہ سکی۔ لیکن جب ٹھنڈا پانی پینے کی بعد اس کے حواس ٹھکانے پر آئے تو اس نے اصل بات بیان کی اور نتیجتاً سب خوفزدہ و ہراساں ہو گئیں۔ وارڈن نے سب کو ڈانٹا اور چند مضبوط دل کی لڑکیوں کو لے کر آگے بڑھی لیکن کمرہ نمبر ۵ تو کھلا تھا اور اندر سمیرا چارپائی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سب لڑکیوں کی جان میں جان آئی۔ "سمن! تم نے یقیناً" کوئی خواب دیکھا ہوگا" نیلہ نے اس سے کہا۔ "خواب! سمن بڑبڑائی، نہیں نہیں! ابھی تو میں اپنے کمرے میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی۔"

یہ بات سمیرا کو جب معلوم ہوئی تو وہ قہقہہ لگا بیٹھی۔ "ارے واہ! بھئی سمن مجھے تو وہ منظر دکھادو۔ ہاں کیا حسین منظر ہوگا۔" وہ چٹخارے لے رہی تھی۔ سمن کی بات پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ خیر رفتہ رفتہ یہ واقعہ مدھم پڑتا گیا۔ سمن بھی اس کو وہم جان کر بھلانے کی کوشش کرتی تھی۔

وہ شہر کا سب سے بہترین ڈگری کالج تھا اور یہ سب اس کالج میں پڑھتی تھیں اور ہاسٹل میں رہتی تھیں۔ مختلف علاقوں سے آئی ہوئی لڑکیاں آپس میں بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ ایف اے کے امتحانات شروع ہو گئے تھے۔ سمن، تحریم، سمیرا، نریمان اور دو اور نئی لڑکیاں ایک کمرے میں مقیم تھیں۔ دن رات پڑھائی میں مشغول رہتیں۔ البتہ سمیرا سب سے مختلف تھی۔ وہ کتاب کو بھی مرضی سے ہاتھ لگاتی۔ زیادہ تر لائبریری سے ناول ایشو کروا لاتی۔ وہ بھی اتنے خوفناک کہ بس۔ ایک دفعہ امتحانات سے قبل نریمان نے ٹائٹل دیکھ کر ہی چیخ مار دی تھی اور سمیرا نے اس کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ وہ سب اس کی لاپروائی کے باوجود جانتی تھیں کہ وہ اچھے نمبر

لے کر پاس ہوگی۔ کیسے؟ اس کا سبب وہ نہ جانتی تھیں اور نہ ہی جاننے کی خواہش مند۔ آخری پیپر دے کر سب نے سکون کا سانس لیا۔ خاص طور پر تحریم اور سمن نے جو آپس میں کزن بھی تھیں۔

"آج تو ہاسٹل میں آخری رات ہے خوب موج اڑائیں گے۔" ایف اے کی ساری لڑکیوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔ اس رات ہاسٹل ہال میں خوب ہنگامہ رہا۔ آدھی رات بھیگی تو سب اپنے کمروں کو چلیں۔ "آج تو تھک گئے۔" نریمان سمیرا سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں تم لوگ خاصی تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ بھئی میں تو ابھی بھی فریش ہوں ابھی تو مجھے ناول بھی ختم کرنا ہے۔"

"کیا؟" تحریم چلائی "تو کیا اب تم ہمیں لائٹ بھی بند نہیں کرنے دو گی۔"

"تو اور کیا؟" سمیرا نے ازلی لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔

اور وہ پانچوں دانت کچکچاتیں اپنے اپنے بستروں میں گھس گئیں۔ "اب تو لائٹ بند کردو۔" نبیلہ نے کوئی گھنٹہ بھر کے بعد سمیرا سے التجا کی۔

"اچھا!! ابھی کرتی ہوں۔ سمیرا نے ہامی بھری اور نبیلہ نے پھر آنکھیں موندلیں اور نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ روشنی کی وجہ سے تحریم بھی کسمسا اٹھی۔

"سمیرا پلیز لائٹ آف کردو۔"

بورڈ سمیرا کی چارپائی سے اتنا دور تھا کہ اٹھ کر تین چار قدم چل کر جانا پڑتا تھا۔ لیکن جو منظر تحریم نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ سمیرا نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے بورڈ کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اس کا ہاتھ اتنا لمبا ہوا کہ باآسانی بورڈ تک پہنچ گیا۔ بند لائٹ میں تحریم کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ تحریم کو چیختے دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی خوفزدہ ہوگئیں اور پھر جب چوکیدار نے دروازہ توڑ کر لائٹ جلائی تو عجیب منظر تھا۔ پورا کمرہ ابتری کا شکار تھا اور لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹی چیخیں مار رہی تھیں۔ پورے کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ اور چھٹی لڑکی سمیرا غائب تھی۔ اور آج سمن کی بات پر تحریم سمیت سب نے یقین کر لیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل سمن نے سمیرا کو جس روپ میں دیکھا تھا وہی اس کا اصل تھا۔ لگتا تھا وہ محض انجوائے کرنے کالج آئی تھی۔ تحریم اب بھی کبھی کبھی خوفزدہ ہوجاتی ہے۔ رات کو سوتے سوتے اٹھ کر چیخیں مارنے لگتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسے آسیب ہوگیا ہے کبھی کسی جن کا اور کبھی چڑیل کا جبکہ سمن جانتی ہے کہ اس کو آسیب نہیں خوف نے لپیٹ میں لے رکھا ہے سمیرا کے خوف نے۔

لہو لہو ہے مرا کراچی

ضیغم حمیدی

نجانے کس کی نظر لگی ہے، لہو لہو ہے مرا کراچی
ہر ایک کی جان پر بنی ہے، لہو لہو ہے مرا کراچی

یہ کس خوشی میں خو[illegible] ہاتھوں تم اپنے گھر کو جلا رہے ہو؟
سبق محبت کا گو[illegible] سے عوام کو تم پڑھا رہے ہو
کہ لڑ کے آپس مئ[illegible] دشمن کو راستہ خود دکھا رہے ہو

یہ [illegible] تی ہے کہ دشمنی ہے؟ لہو لہو ہے مرا کراچی
ہر [illegible] کی جان پر بنی ہے، لہو لہو ہے مرا کراچی

یہ کس نے میری حسین کھیتی میں بیج نفرت کے بو دیئے ہیں
یہ راستہ ہے تباہیوں کا کہ جس پہ ہم سب ہی چل پڑے ہیں
یہ آگ دشمن نے ہے لگائی کہ جس کے شعلے بھڑک رہے ہیں

یہ اجتماعی سی خود کشی ہے، لہو لہو ہے مرا کراچی
ہر ایک کی جان پر بنی ہے، لہو لہو ہے مرا کراچی

نمک سے موت

محمد ظریف

کراچی کے مغربی اور پی۔اے۔ایف بیس ماری پور کے درمیان "گریکس کالونی" نام کی ایک بستی واقع ہے۔ یوں تو یہ ایک بہت قدیم آبادی ہے لیکن اسے یہ موجودہ نام اس وقت ملا جب جرمنی کا ایک منفرد یہودی گرین فیلڈ گریکس ۱۹۶۱ء میں کراچی آیا اور ساحل سمندر پر نمک سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ مذکورہ یہودی جرمنی سے اس لئے فرار ہوا تھا کہ وہاں پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹) کے دوران ہی یہودیوں سے نفرت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اور متعصب جرمن انہیں طرح طرح سے ستا رہے تھے۔ گرین فیلڈ جب کراچی پہنچا اور اس نے کراچی کے ساحلی علاقے ہاکس بے کے نزدیک کچھ لوگوں کو سمندر کا پانی خشک کر کے نمک بناتے ہوئے دیکھا تو اسے یہ

کاروبار بہت منافع بخش معلوم ہوا کیونکہ اس میں "ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے" کے مصداق منافع تھا۔ کیونکہ پانی سمندر کا روشنی سورج کی اور نفع کام کرنے والے کا۔ بس توجہ کی ضرورت تھی۔ نمک بنانے کی مزدوری کرنے والے لوگ ان دنوں ایک روپیہ کی مزدوری پر مل جاتے تھے۔ گریکس نے حکومت سے اجازت لے کر اس علاقے میں اپنا ایک کارخانہ قائم کرلیا۔ کارخانہ قائم کرنے کی فوری اجازت اسے اس لئے مل گئی کہ ان دنوں حکومت برطانیہ جرمنی سے فرار ہو کر آنے والے لوگوں بالخصوص یہودیوں کے لئے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھی۔ گرین فیلڈ کا کارخانہ بہت جلد چل نکلا۔ سال دو سال کے عرصے میں ان کے پاس کوئی پانچ سو مزدور جمع ہوگئے۔ گرین فیلڈ کے نمک سازی کے کارخانے "گریکس سالٹ ورکس" کی نسبت سے یہ علاقہ بہت جلد گریکس کالونی کے نام سے ہی پکارا جانے لگا۔

تقریباً" بیس برس تک گریکس نمک سازی کا کاروبار کرتا رہا۔ اس نے یہاں اپنے لئے ایک خوبصورت اور عالی شان بنگلہ بھی تعمیر کرالیا تھا۔ انہی دنوں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں مقامی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا اعلان کیا۔ جب یہ خبر گریکس کو ملی تو اس نے بھی نمک سازی کا کام چھوڑ کر اسی مقام پر کپڑے کی ایک مل لگانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ گریکس کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدور نمک سازی کے سوا کسی اور فن سے ناواقف تھے اس لئے وہ کپڑے کے کارخانے میں کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے۔ مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر گریکس انہیں برطرف کرتا تو مزدوروں کی بہبود کے قانون یعنی فیکٹری ایکٹ ۱۹۳۶ء کے مطابق انہیں بہت بڑی رقم ادا کرنا پڑتی لہٰذا گریکس کے سازشی ذہن نے ایک ایسا منصوبہ مرتب کیا جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی یہ لوگ ازخود یہاں سے بھاگ جائیں اور گریکس کو انہیں کچھ بھی نہ دینا پڑے۔

دراصل گریکس کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح بستی میں خوف و ہراس کی ایسی فضا پیدا کردی جائے جس سے کارخانے کے مزدور دہشت کے عالم میں بستی سے فرار ہوجائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے اپنے بنگلے کے ایک خفیہ حصہ میں ایک چھوٹا سا وائرلیس اسٹیشن قائم کیا۔ اور بستی میں ایستادہ چند گھنے درختوں میں لاؤڈ اسپیکروں کے ہارن چھپا کر وائرلیس کا سلسلہ ان سے جوڑ دیا۔ ایک رات نصف شب کے بعد گریکس نے وائرلیس کے سامنے بیٹھ کر اپنے حلق سے ایک عجیب چنگھاڑتی، دھاڑتی آواز نکالی جو

لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی آنِ واحد میں پوری بستی میں پھیل گئی۔ بستی کے تقریباً" تمام باشندے اس آواز کو سن کر اٹھ بیٹھے اور جو کسی وجہ سے جاگ رہے تھے بے ساختہ گھروں سے باہر نکل آئے۔ بستی کے اکثر ضعیف الاعتقاد باشندے تو ان آوازوں کو جنوں یا بھوتوں کی چیخ و پکار سمجھ کر خود بھی ڈری سہمی آوازیں بلند کرنے لگے۔ خاص طور پر عورتیں اور بچے تو بُری طرح بدحواس ہوگئے۔ بستی میں یہ شور و غوغا کوئی نصف گھنٹہ تک برپا رہا اور اس دوران بستی کے لوگ خوف و دہشت سے کانپتے رہے۔ جب یہ شور تھما تو بستی کے کچھ نوجوان ان آوازوں کا راز جاننے کے لئے آوازوں کی سمت چلے۔ بستی والے انہیں روکتے رہ گئے۔ مگر ان نوجوانوں نے بستی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک دو دن بعد گریکس نے پھر یہی حرکت کی بستی والوں نے چاہا کہ وہ گریکس سے اس سلسلے میں مدد چاہیں مگر گریکس بہت چالاک آدمی تھا۔ اس دوران وہ اپنے بنگلہ کے اندر ہی روپوش رہا۔ اس کے "معتمدین" نے کالونی کے لوگوں کو بتایا کہ گریکس تو بمبئی گیا ہوا ہے۔ ادھر پر اسرار آوازوں کے دوسری بار چیخ و پکار کے سبب کچھ کمزور دل لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ چند دن کے وقفے کے بعد گریکس نے تیسری بار پراسرار اور ہیبت ناک آواز میں بستی والوں کو دھمکی دی کہ اگر وہ بستی چھوڑ کر نہ گئے تو بہت جلد موت کا شکار ہو جائیں گے۔ اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے سمندر کے ایک خاص حصے پر جہاں بستی والے مچھلی کا شکار کرتے تھے ایک خاص قسم کا زہر پھیلا دیا جو سست اثر کرنے والا تھا اس جگہ کی مچھلیوں پر اس زہر نے اثر کیا اور جب ان میں سے کچھ مچھلیوں کا بستی کے لوگوں نے شکار کر کے ان کا گوشت کھایا تو ان میں سے بہت سوں کی حالت بگڑ گئی۔ اور چند لوگ جاں بحق بھی ہوگئے۔ اب تو بستی کے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور تمام باشندے افراتفری کے عالم میں بستی سے بھاگ نکلے۔

گریکس نے اپنی اس انسانیت سوز کارروائی کے بعد اطمینان کا سانس لیا اور اسی مقام پر ٹیکسٹائل مل لگائی اور دولت سے کھیلنے لگا۔ لیکن خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آچکی تھی۔ ایک دن جب گریکس ملز کے اس حصے کا معائنہ کر رہا تھا جہاں کپڑے کی رنگائی ہوا کرتی تھی تو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایک جگہ کھلی الماری میں رنگ کے ڈبے چنے ہوئے تھے۔ گریکس نہ معلوم کس بے دھیانی میں تھا کہ بری طرح اس الماری سے ٹکرا گیا اور رنگ کے تمام ڈبے اس کے سر پر ڈھیر ہوگئے۔ اس

شدید چوٹ کی تاب نہ کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ مگر ہوش میں آکر اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک عجیب سے مرض کا شکار ہو گیا ہے۔ دراصل اب وہ نمک بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہوا یوں کہ ہوش میں آکر اس نے نمک اور کالی مرچ لگا کر انڈا کھالیا تو دوبارہ بے ہوش ہو گیا اسے شہر کے سول ہاسپٹل میں لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے "مخصوص مرض" کی تشخیص کی اور تمام عمر کے لئے اس کے کھانے میں نمک بند کرادیا۔ ڈاکٹروں کا تو کہنا تھا کہ نمک کھانا تو کجا اب وہ کبھی نمک کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔

لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ گریکس کی موت تو "نمک کے ہاتھوں" ہی ہونا تھی اور ایک دن ایسا ہو بھی گیا۔ ہوا کچھ اس طرح کہ ایک دن جب وہ کراچی کے مشہور کاروباری علاقے صدر کی ایک فٹ پاتھ پر چل رہا تھا تو سڑک پر چلنے والی ایک گدھا گاڑی جس پر نمک کی بوریاں لدی ہوئی تھیں اس کے قریب سے گزری۔ ایک بوری پھٹی ہوئی تھی جس میں سے نمک نکل نکل کر ادھر ادھر بکھر رہا تھا۔ اچانک ہوا کا ایک زور دار جھونکا آیا جس کی وجہ سے بوری سے گرنے والا نمک فضاء میں پھیل گیا اور نمک کی ایک بڑی مقدار گریکس کی آنکھوں، منہ اور ناک میں گھس گئی۔ اس وقت اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ بلا نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ وہ تیورا کر پختہ سڑک پر گرا اور اس نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔

نمک کے مزدوروں کا قاتل نمک ہی کی بدولت واصل بہ جہنم ہو چکا تھا۔

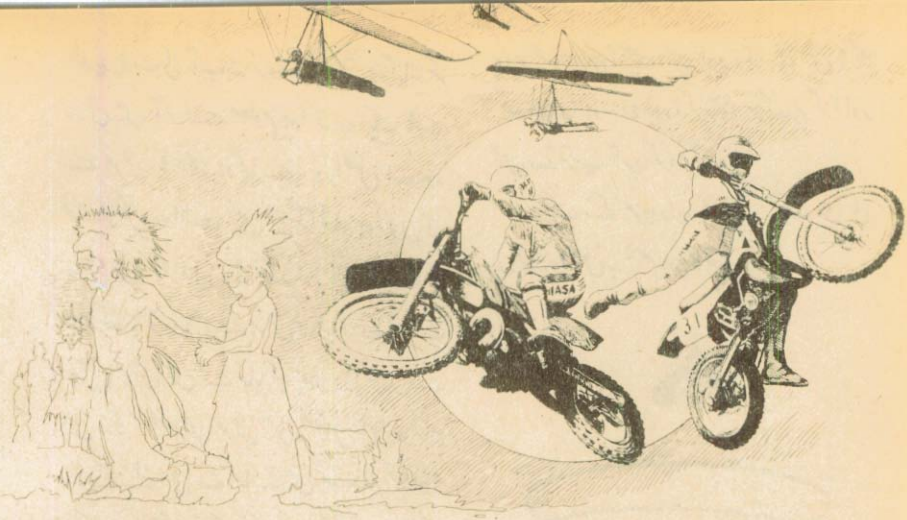

دنیا کے خوفناک اور خطرناک کھیل

شیخ عبدالحمید عابد

دنیا میں ایسے بہت سے کھیل انسانوں نے ایجاد کئے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے بھی خوف سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان میں چند ایک کھیلوں کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

پتنگ کے ذریعے اڑنے کا مشغلہ مغربی ملکوں خصوصاً یورپ کے ساحلی علاقوں میں بڑا مقبول ہے۔ بڑی بڑی پتنگیں موٹر لانچوں یا دوسری تیز رفتار کشتیوں کے ساتھ باندھ کر اڑائی جاتی ہیں، کشتی جتنی تیز ہوگی پتنگ اتنی ہی اونچی اڑے گی اور پتنگ جتنی بڑی ہوگی اس نسبت سے اس میں وزن سہارنے کی قوت ہوگی۔ منچلے لوگ ان پتنگوں سے لٹک جاتے ہیں اور کئی کلومیٹر تک لٹکے چلے جاتے ہیں۔ بعض حالتوں میں وہ پتنگ سے لٹکی ہوئی رسی کی سیڑھی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ تفریح کی غرض سے اڑائی جانے والی پتنگ کاغذ یا ریشمی کپڑے کی بنتی ہے۔ اس کی بے شمار شکلیں ہوتی ہیں لیکن بنیادی اصول سب کا ایک ہوتا ہے۔ پتنگ اپنے حجم اور بوجھ پر ہوا کے مخالف دباؤ کے نتیجے میں اڑتی ہے اور اسی دباؤ کے اثر سے بلند ہوتی ہے اس کا رخ متعین کرنے میں اس کی دُم اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر دُم نہ ہو اور پتنگ کی کھپچیوں کا توازن صحیح نہ ہو تو اوّل

تو پتنگ اڑے گی نہیں اور اگر اڑے گی تو مسلسل چکر کھاتی رہے گی اور بلند بھی زیادہ نہ ہو سکے گی۔

چند سال گزرے ایک ۳۷ سالہ فرانسیسی برنارڈ ڈینس نے ایک پتنگ کے سہارے رودبار انگلستان کو عبور کیا۔ اس مقابلے میں ایک دوسرا فرانسیسی لیئر فونز بھی شریک تھا۔ لیکن وہ صرف ایک کلو میٹر ہی دور رہ گیا تھا کہ پتنگ سمیت سمندر میں گر پڑا اور مقابلے سے دست بردار ہو گیا۔ برنارڈ ڈینس ایک بہت بڑی پتنگ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا جو ایک تیز رفتار کشتی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی یہ کشتی تقریباً" سو کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تیر رہی تھی۔

۱۹۴۱ء میں پتنگ کے ذریعے اسی رود بار کو عبور کرنے کی جدوجہد میں پانچ جانیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس مقابلے میں جو منچلے حصہ لے رہے تھے ان کی لانچیں آپس میں ٹکرا گئیں اور پانچوں کی ڈوریاں ٹوٹ گئیں چونکہ ساتھ کوئی حفاظتی کشتی نہیں تھی اس لئے یہ پانچوں رودبار کی موجوں میں گر کر دوبارہ نہ ابھر سکے۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں ایک بار پھر یہ خوفناک مقابلہ ہوا اور آٹھ نوجوانوں نے اس میں حصہ لیا۔ اتفاق سے دو لانچیں دوڑ رہی تھیں اور ان دونوں کی پتنگوں کے ساتھ بندھے ہوئے نوجوان تقریباً" دوسو میٹر کی بلندی پر ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ رودبار کے شور کے باوجود ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے ابھی انہوں نے نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ تیز ہوائیں چلنے لگیں اور ان کی پتنگیں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ یہ ٹکراؤ اتنا تند اور تیز تھا کہ دونوں نوجوانوں کے سر پھٹ گئے اور سر سے خون بہنے لگا۔ طوفان کے شور میں ان کی چیخ وپکار کشتی میں موجود لوگوں کو سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب طوفان تھما اور کشتیاں ساحل پر لگیں تو زیادہ خون بہنے کی وجہ سے ایک تو ہلاک ہو چکا تھا اور دوسرا بے ہوش تھا۔ بعد میں اس نے بھی ہسپتال میں جاکر دم توڑ دیا۔

کیلی فورنیا کے لوگ بڑے ہی زندہ دل واقع ہوئے ہیں انہوں نے ایک انتہائی خوفناک کھیل کو اپنی جرأت کا مظہر قرار دیا ہے۔ یہ کھیل پہاڑوں پر موٹر سائیکل جمپ کہلاتا ہے۔ مقابلے میں حصہ لینے والے نوجوان پانچ ہارس پاور کی موٹر سائیکلوں پر دوڑ لگاتے ہیں۔ لیکن یہ دوڑ پختہ سڑک یا کھلے میدانوں میں نہیں ہوتی۔ بلکہ کیلی فورنیا کے اونچے اونچے ہیبت ناک پہاڑوں پر ہوتی ہے۔ یہ موٹر سائیکلیں مخصوص قسم کی ہوتی ہیں لیکن ہوتی دو ہی پہیوں والی ہیں اور ٹائروں کے سوا ان کا ہر کل پرزہ عام موٹر سائیکلوں جیسا ہوتا ہے۔ یہ عموماً" ستر کلو میٹر کی رفتار سے ناہموار

اور سنگلاخ پہاڑوں پر دوڑتی ہیں۔ سب سے خوفناک منظر اس وقت ہوتا ہے جب اس انتہائی تیز رفتار دوڑ میں کوئی کھائی آجاتی ہے یا دو ٹکڑوں کے درمیان خلا آتا ہے۔ اس وقت کھیل کے رسیا انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی موٹر سائیکلوں کو باآسانی ان گھاٹیوں پر سے گزار دیتے ہیں۔ دنیا میں اس سے زیادہ خطرناک کھیل کوئی نہیں۔ پہاڑوں پر نہ سڑکیں ہوتی ہیں اور نہ ہموار پٹریاں۔ یہ دوڑیں عموماً ساٹھ کلو میٹر لمبی ہوتی ہیں پہاڑوں پر اس دوڑ کے لئے مخصوص راستے ہوتے ہیں لیکن یہ انتہائی ناہموار ہوتے ہیں اور راستے میں ایک دو گھاٹیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ جن راہوں میں گھاٹیاں نہیں ہوتی انہیں اس دوڑ کے لئے منتخب نہیں کیا جاتا۔ موٹر سائیکل سوار دوڑ سے پہلے ایک پٹی کے ذریعے خود کو موٹر سائیکل سے کس کر باندھ لیتا ہے اور آخری گیئر میں پہنچ کر پوری رفتار سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ پر کوئی طوفان آگیا ہے۔ گھن گرج کی آواز سے منظر اور بھی خوف ناک ہوجاتا ہے۔ پہاڑ کے بلند حصوں پر تماشائی اپنی شاباش کی آوازوں اور تالیوں سے مقابلے میں اترنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ لیکن جب ان میں سے کوئی لڑھک جاتا ہے تو وہ دوڑ ختم ہونے تک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی موٹر سائیکل پھسلی اور وہ لڑھکتا ہوا سینکڑوں میٹر نیچے جاگرا۔اس دوڑ کے وقت ابتدائی طبی سہولتوں کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اب تک پہاڑوں پر موٹر سائیکلوں کی دوڑ میں کئی سو افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایک بار حکومت نے اس کھیل کو ممنوع قرار دینے کی کوشش کی لیکن عوام کے دباؤ اور زبردست احتجاج کے پیش نظر اس نے ارادہ بدل دیا۔

افریقی ممالک کے بیشتر غیرمتمدن اور وحشی قبائل میں عجیب وغریب کھیل رائج ہیں۔ جو انتہائی ڈراؤنے اور خطرناک ہیں۔ شمالی رہوڈیشیا کے انتہائی جنوب میں جو قبائل بستے ہیں وہ ہر پورن ماشی (چودھویں کی چاند رات) کو ایک خوفناک کھیل کھیلتے ہیں یہ کھیل نصف رات سے شروع ہو کر صبح صادق تک رہتا ہے۔اس میں قبیلے کے تمام نوجوان جن کی عمر بیس سال سے زیادہ اور چالیس سال سے کم ہوتی ہے حصہ لیتے ہیں۔ جونہی چودھویں کا چاند اپنی کرنیں بکھیرتا ہے یہ لوگ ایک کھلے میدان میں جمع ہوجاتے ہیں۔ان کے پاس جانوروں کے نہایت نوکیلے سینگ ہوتے ہیں جنہیں وہ پتھروں پر رگڑ کر تیز بنالیتے ہیں۔ سب سے پہلے بیس افراد کی ایک ٹولی دائرے کی

شکل میں میدان میں آتی ہے۔ ان کا دایاں ہاتھ کمر کے ساتھ چمڑے کی ایک پٹی سے بندھا ہوتا ہے۔ بائیں ہاتھ میں نوک دار سینگ ہوتا ہے۔ اس ہاتھ کی گرفت تو آزاد ہوتی ہے لیکن کہنی کو ایک کھچی کے ذریعے اس طرح کسا ہوتا ہے کہ بازو کہنی کی ہڈی پر حرکت نہیں کرسکتا اور اسے ہاتھ کی گرفت سے کندھے تک کسی خم کے بغیر ہی گھمایا جاسکتا ہے۔ یہ ٹولی ایک مخصوص گیت گاتی ہے۔ رقص کا یہ حلقہ آہستہ آہستہ تنگ ہونے لگتا ہے نوک دار سینگ تنے ہوتے ہیں اور اسی حالت میں ایک دوسرے کے سینوں کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ طبلے پر تھاپ پڑتے ہی کھلاڑیوں میں جوش و خروش پیدا ہوجاتا ہے۔ گیت کے زیروبم اور طبلے کی تھاپ پر وہ دیوانہ وار رقص کرنے لگتے ہیں اور اس طرح اچھلتے کودتے ہیں جیسے کوئی گوریلا انسان کو دیکھ کر کودتا اور شور مچاتا ہے۔ لحہ بہ لحہ دائرہ تنگ ہونے لگتا ہے اور نوکیلے سینگ ایک دوسرے کے سینے پر لگتے ہیں۔ کھلاڑیوں کے سینے بالکل برہنہ ہوتے ہیں۔ ان پر کہیں کہیں مور اور دوسرے خوبصورت جانوروں کے پروں کی جھالر سی لٹکی ہوتی ہے۔ اس کھیل میں ان سینگوں کو قوت کے بل پر کسی کے سینے میں پیوست کرنے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن کیف و مستی کے عالم میں یہ سینگ سامنے کے کھلاڑیوں کے سینے میں کھب جاتے ہیں خون کی دھاریں بہنے لگتی ہیں خون بہتے ہی طبلے پر دوسری تھاپ لگتی ہے۔ جو پہلے کی نسبت زیادہ زور دار ہوتی ہے اور ایک دوسرا گیت جسے فنٹوٹال کہتے ہیں، چھیڑ دیا جاتا ہے۔ پھر دائرہ کھلنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ اتنا وسیع ہوجاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے اتنے عرصے میں بیس آدمیوں کی ایک اور ٹولی یہی کھیل شروع کردیتی ہے۔ جب آخری ٹولی میدان میں اترتی ہے تو باقی ٹولیاں بھی اس کے ساتھ شریک ہوجاتی ہیں پھر ایک ہنگامہ اور انتہائی خوفناک رقص ہوتا ہے۔ سینگوں کی نوکیں سینوں میں اترتی ہیں خون کے فوارے چھوٹ پڑتے ہیں کئی لوگ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ لیکن ناچنے والے گرنے والوں سے بے نیاز اپنے کھیل میں رقص کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح صادق ہوجاتی ہے اور کھیل کا ریفری کھیل ختم ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ کھیل ختم ہوتے ہی وہ زخمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور خون روکنے کی جدوجہد ہوتی ہے اور بعض اوقات خون کا بہاؤ روکنے کے لئے گرم لوہے سے اس جگہ کو داغا جاتا ہے۔ یہ کھیل آج بھی اسی ذوق و شوق سے کھیلا جاتا ہے جس شوق سے سوبرس پہلے کھیلا جاتا تھا۔

کیا وہ خواب تھا

نادیہ غفور

"کیوں بھئی تانیہ کیسا لگا نیا گھر؟" غفران ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "گھر تو ٹھیک ٹھاک ہے مگر آبادی سے خاصا دور ہے۔" تانیہ نے جواب دیا۔ "ہاں مگر فی الحال اسی پر گزارہ کرلو۔ کچھ دنوں میں نیا گھر ڈھونڈلیں گے۔" غفران نے ببلو کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

دراصل غفران کی نئی نئی پوسٹنگ اسلام آباد ہوئی تھی اور فی الحال سرکاری گھر الاٹ نہیں ہوا تھا اس لئے انہیں کرائے پر گھر لینا پڑا تھا۔ ورنہ تانیہ جو غفران کی بیوی تھی ایسے گھر میں ہرگز نہیں رہ سکتی تھی جو آبادی سے کافی دور ہو۔ یہ گھر کافی بڑا تھا اوپر والا حصہ خالی تھا۔ انہوں نے صرف نیچے والا حصہ کرائے پر لیا تھا۔ گھر میں پہلے سے ہی فرنیچر موجود تھا مگر پھر بھی گھر کی سجاوٹ اور صفائی ستھرائی کی ضرورت تھی جو تانیہ اور غفران کی مشترکہ کوشش سے انجام پاگئی۔ رات کو سخت تھکاوٹ کے باوجود تانیہ کو نیند نہیں آرہی تھی جبکہ غفران اور ببلو آرام سے سو رہے تھے۔

تانیہ نائٹ بلب جلا کر کوئی ناول پڑھ رہی تھی

"ماما" ایک معصوم آواز آئی۔

"جی بیٹا جان۔" تانیہ نے بے خیالی میں کہا پھر چونک کر ببلو کو دیکھا جو میٹھی نیند سویا ہوا تھا۔ "یہ آواز کس کی تھی؟" تانیہ نے سوچا ببلو ایک صحت مند بچہ تھا لیکن ابھی تو وہ صرف چھ مہینے کا تھا اور ابھی بولنا کہاں آیا تھا۔ تانیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پر اپنا وہم خیال کر کے دوبارہ ناول کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ببلو اٹھ

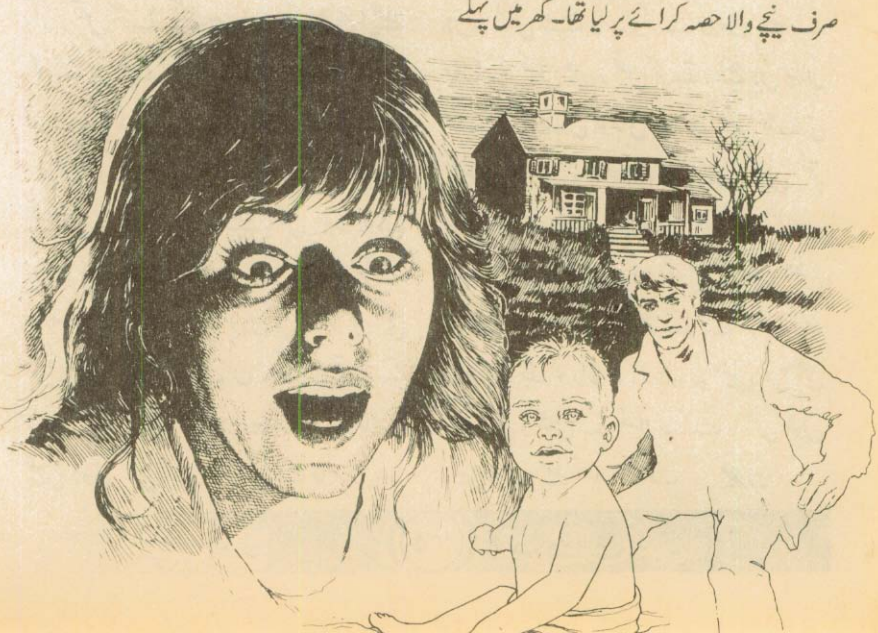

کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ببلو بیٹا" تانیہ نے پیار سے پوچھا۔ مگر ببلو جواب دینے کی بجائے بستر سے اتر گیا۔ "کہاں جارہے ہو ببلو۔" تانیہ نے پریشانی سے پوچھا۔ ببلو نے مڑ کر تانیہ کو دیکھا تو ایک خوف کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ ببلو کی آنکھیں بے انتہا سرخ ہو رہی تھیں اور اس کے چہرے پر ایک پر اسرار مسکراہٹ تھی۔ ببلو اب آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک جا پہنچا تھا۔ ایک چھ مہینے کا بچہ کیسے چل سکتا ہے؟" تانیہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ جلدی سے بستر سے اٹھی اور ببلو کے پیچھے بھاگی۔ ببلو اب تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل کی طرف جارہا تھا۔ تانیہ جلدی سے واپس بیڈ روم میں آئی تاکہ غفران کو جگا سکے۔ مگر غفران بیڈ پر نہیں تھا۔ تانیہ نے غفران کو کپکپاتی آواز میں پکارا۔ "غ.....غ.....غفران" مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ پھر اندر جھانک کر دیکھا وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ جب وہ واپس مڑی تو غفران بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ تانیہ کو دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ گیا اور آہستہ آہستہ تانیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ "کیا بات ہے؟" غفران نے ایک پر اسرار سرگوشی میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر بالکل وہی پر اسرار مسکراہٹ تھی جو تھوڑی دیر پہلے ببلو کے چہرے پر تھی۔ تانیہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہو گئی۔

"غفران کیا ہوا ہے تمہیں اور وہ ببلو....."

اس سے آگے تانیہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اب غفران دونوں بازو پھیلا کر اس کے قریب آچکا تھا۔ "غفران.....ت.....ت.....تم۔" تانیہ کی خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ غفران اب تانیہ کا گلا دبانے لگا تھا۔ "چھوڑو.....چھوڑ دو مجھے۔" تانیہ زور سے چیخنے لگی۔ غفران کے شکنجے کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ تانیہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی آخر کار تانیہ نے زور لگا کو خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا اور باہر کو دوڑ پڑی۔ غفران بھی اس کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ تانیہ نے باہر آتے ہی دروازے کو کنڈی لگا دی۔ غفران اب دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تانیہ رونے لگی۔

"ماما" اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔ تانیہ نے مڑ کر دیکھا تو ببلو زمین سے دس فٹ بلند ہوا میں کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر اب بھی وہی پر اسرار مسکراہٹ تھی۔ تانیہ خوف سے کانپ گئی۔ اس کے آنسو اب ساکت ہو گئے تھے۔ ببلو یکدم تانیہ پر جھپٹا اور اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچی اور اپنے نوکیلے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیئے۔ تانیہ چیخنے لگی اور ببلو کو

خود سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ تانیہ نے ببلو کو زور سے جھٹکا دیا تو وہ دور جا گرا۔ اتنے ہی میں دھڑام کی آواز کے ساتھ بیڈ روم کا دروازہ کھل گیا۔ تانیہ نے مڑ کر دیکھا تو غفران وہاں کھڑا تھا اپنی پر اسرار مسکراہٹ سمیت۔ تانیہ نے ایک زور دار چیخ ماری اور اور باہر کی طرف دوڑی۔ لیکن داخلی دروازہ بند تھا۔ تانیہ نے کنڈی کھولنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ بہت کانپ رہے تھے۔ اب غفران اس کے قریب آچکا تھا اور کنڈی کھولنے کا وقت نہیں تھا۔ تانیہ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو اسے کرسٹل کا ایک گلدان نظر آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلدان ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جب غفران بالکل اس کے قریب آگیا تو اس نے پوری قوت سے گلدان غفران کے سر پر دے مارا جو اس کے ماتھے پر لگا اور خون رسنا شروع ہوگیا۔ یہی موقع تانیہ نے غنیمت جانا اور کنڈی کھول کر باہر دوڑ گئی۔ اس نے یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ غفران اس کا پیچھا کر رہا ہے کہ نہیں۔

پتا نہیں تانیہ کو بھاگتے ہوئے کتنی دیر ہوئی تھی گھر کتنی دور رہ گیا تھا کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور اسے ایسا لگا کہ وہ کسی کنویں میں گر گئی ہے اس کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا تانیہ؟" جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بیڈ روم میں بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ "کیا ہوا، تم نے کوئی خوفناک خواب دیکھا ہے؟" غفران نے پریشانی سے پوچھا۔ تانیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ببلو کو دیکھا جو معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے ببلو اور غفران کے چہرے پر کوئی پر اسرار تاثرات نظر نہیں آئے۔ شاید یہ ایک خواب ہی تھا۔ اس واقعہ کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اب بھی تانیہ اکثر راتیں جاگ کر گزارتی ہے۔ غفران نے اس کے پر زور اصرار پر اگلے دن ہی وہ گھر خالی کر دیا تھا۔ اس کے باوجود تانیہ کو اب بھی غفران اور ببلو سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ وہ اب تک یہ جان نہیں پائی کہ غفران کے ماتھے پر یہ کالا نشان کیوں ہے؟ جو اس خوفناک رات کے بعد اس کے ماتھے پر ابھرا تھا۔ جس کے بارے میں غفران نے تانیہ کو بتایا تھا کہ وہ باتھ روم میں گر گیا تھا۔ مگر تانیہ کو اس کی بات پر یقین کیوں نہیں آیا تھا؟ اور اب بھی جب ببلو اسے "ماما" کہہ کر پکارتا ہے تو تانیہ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ یہ وہی آواز ہے جو اس نے بھیانک خواب میں سنی تھی اور اسے اب بھی کبھی غفران اور ببلو کی مسکراہٹ پر اسرار کیوں لگتی ہے؟ وہ ابھی تک یہ فیصلہ کیوں نہیں کر پائی کہ وہ رات ایک خواب تھی یا حقیقت، وہ اپنی زندگی میں اس خوفناک رات کو کبھی بھلا نا سکے گی۔

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے

صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھلنے اور بند ہونے والا ڈھکنا اور اس کے نیچے نرم فوائل کی سیل جس کی بدولت حبیب بناسپتی کی اعلیٰ کوالٹی اور تازگی آخر تک برقرار۔

بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہتر ہے

دیکھتے ہی دیکھتے کیسے بدل جاتے ہیں لوگ

سلمان خان

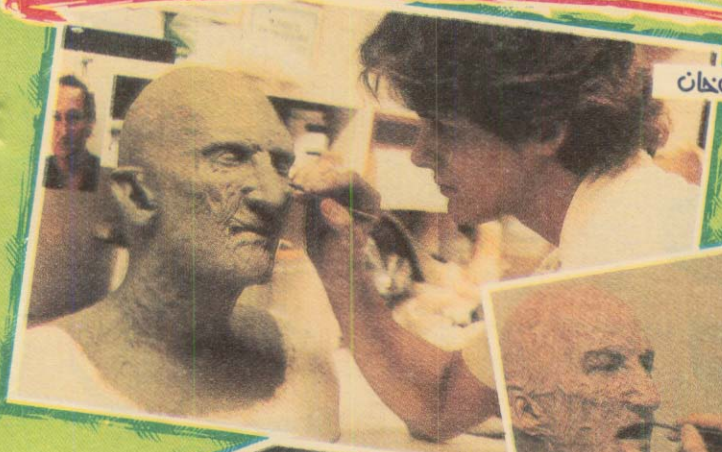

کسی ڈراؤنی فلم کے لئے اداکاروں کا میک اپ کیسے کیا جاتا ہے؟ ان تصویروں میں اسی راز پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ فلم میں جس خوفناک کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے پہلے اس کا پلاسٹک کا مجسمہ تیار کیا جاتا ہے پھر اس کے اجزا الگ کر دیئے جاتے ہیں اور ان ہی اجزا کو کردار کے چہرے پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ آپ ان تصویروں میں اس طرح سے میک اپ ہوتے دیکھ سکتے ہیں۔

اندھی قید

الطاف حسین

جب مجھے ہوش آیا تو میرے چاروں طرف بھیانک سناٹا اور گہری پُر ہول تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ حبس اتنا تھا کہ مجھے دم سینے میں گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چند لمبے لمبے سانس لینے کے بعد میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن سوائے گھُپ اندھیرے کے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا..... مجھے اپنا وجود بھی تاریکی کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ اعصاب شکن سکوت سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانا چاہے تو ایک نئے انکشاف نے مجھے لرزا دیا..... میرے پاؤں اور کمر کا حصہ کسی چیز سے بندھا ہوا تھا اور ..... پورا جسم چادر میں لپٹا ہوا تھا..... میرا دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ اور چہرے پر دہشت سے پسینہ آگیا۔

"یا اللہ! میں کہاں ہوں؟ یہاں مجھے کون چھوڑ گیا ہے؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے اٹھنے کی

کوشش کی تو سر پتھر کی مضبوط چھت سے ٹکرا گیا اور مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔

"کیا مجھے زندہ قبر میں دفنا دیا گیا ہے؟" دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ قبر میں موجودگی کا دہشت ناک احساس ہوتے ہی میرے حلق سے بیک وقت کئی چیخیں نکل گئیں۔ اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا..... میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوبارہ مجھے کب ہوش آیا۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن یہ ضرور معلوم تھا کہ میں شہر خموشاں کی تنگ و تاریک کوٹھری میں قید کر دیا گیا ہوں۔ قبر جو مردے کے لئے تھی اس میں ایک زندہ شخص کو دفنا دیا گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ اور پاؤں پتھر کی سل پر جما کر پورے جسم کا زور لگایا لیکن میری یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی..... پتھر کی بھاری سل ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں نے ایسا کئی بار کیا اور ہر کوشش میں مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا..... ویسے بھی پتھر کی بھاری سل جس پر منوں مٹی پڑی تھی اپنی جگہ سے کیسے ہٹ سکتی تھی..... میں تھک ہار کر بے سدھ لیٹ گیا..... میرا ذہن آہستہ آہستہ سوچوں کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔

وہ سبھی خواہشیں جن پر میں عمل کرنا چاہتا تھا..... وہ سارے وعدے جو میں نے نبھانے تھے .....وہ تمام آسائشیں جنہیں میں نے حاصل کرنا تھا ... ایک ایک کر کے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگیں.....

"اگر میں مرگیا تو ....." دفعتاً میرے ذہن میں زوردار دھماکہ ہوا اور میری سوچ کا رخ منکر نکیر کی طرح پھر گیا... جو کسی وقت بھی میرا حساب لینے کے لئے مجھے دبوچ سکتے تھے .....بڑے بڑے سانپ اور اژدہے اپنے خوفناک منہ کھولے پھنکارتے ہوئے مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دینے لگے..... میں نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں ..... میرے جسم پر لرزہ طاری ہو چکا تھا..... اور چہرے پر ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا اور سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں..... اور پھر ایسا لگا جیسے قبر کی دونوں دیواریں پھیل گئی ہیں اور مقناطیس کے دو سروں کی طرح اچانک زور سے آپس میں ملیں اور میرا سارا وجود ان کے درمیان آکر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

عین اس لمحے اوپر زمین پر قدموں کی چاپ سنائی دی..... میری خوفناک سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا..... میں زور زور سے چیخنے لگا "مجھے باہر نکال دو..... خدا کے لئے مجھے یہاں سے باہر نکالو..... تم جو کوئی بھی ہو ..... میری آواز سنو ..... مجھے اس

اندھی کوٹھری سے باہر نکال دو۔" لیکن آواز کی لہریں قبر کا محاصرہ توڑ نہ سکیں اور قدموں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی۔

امید کی کرنوں کو مایوسی کے اندھیروں نے نگل لیا ....اور میں اپنی بے بسی پر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دیا.....نہ جانے کب تک میں روتا رہا.....ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ میں رویا بہت تھا.....اور پھر روتے روتے میری آنکھ لگ گئی.....اچانک مجھے جسم پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا.....جسم پر ہاتھ پھیرتے ہی بے شمار چھوٹے چھوٹے کیڑے میرے ہاتھوں سے لپٹ گئے۔ اندھیرے کے باعث مجھے ان کی شکلیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے انہیں مسلنا شروع کردیا ..... لیکن ان کی تعداد شاید ہزاروں لاکھوں میں تھی جتنے میں مسل دیتا اس سے کہیں زیادہ مجھے اپنے جسم پر رینگتے ہوئے محسوس ہوتے .....ان کے کاٹنے سے میرے جسم پر خارش سی ہونے لگی.....میں نے کھجا کھجا کر جسم کو زخم زخم کردیا ..... لیکن ان کے کاٹنے میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہوئی۔ تھک ہار کر میں نے خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا.....اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرا جسم بے حس ہوگیا.....میں چیخنے کی کوشش کرتا تو آواز حلق میں اٹک جاتی ..... جسم میں جان ختم ہوگئی.....اب میں کسی معجزہ کا منتظر تھا.....ایک ایسا معجزہ جو مجھے اس اندھی قید سے رہائی دلا سکتا تھا.....وقت چیونٹی کی رفتار سے رینگتا رہا اور میں اندھیروں میں چپ چاپ "بے سدھ لیٹا اپنی بے بسی پر آنسو بہاتا رہا.....اور پھر آنکھوں کا پانی بھی خشک ہوگیا.....اس عالم میں کتنا وقت گزرا..... کیسے گزرا .....مجھے خبر نہیں .....کیونکہ میں زندہ ہو کر بھی مردوں سے بدتر ہوچکا تھا.....ہاتھ پاؤں کی حرکت ختم ہوچکی تھی .....قوت گویائی سلب ہوچکی تھی.....اور پھر ایک وقت مجھے اچانک احساس ہوا جیسے میری قبر کے اوپر بہت سے لوگ موجود ہیں.....میرے جسم میں زندگی کی حرارت ایک بار پھر جاگ اٹھی .....میرا دل جو خوف اور مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا.....امید پاکر خوشی کی سطح پر آکر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی میں نے پھر کوشش کی.....اور جسم کی بچی کھچی قوت کو جمع کر کے زور لگایا.....حلق سے کئی دل خراش چیخیں نکل گئیں.....جو پتھر کی بھاری سلوں اور منوں مٹی کا سینہ چیرتی ہوئیں زمین سے باہر نکل گئیں.....گہرے اور پُر ہول سناٹے میں مجھے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں.....غالباً" وہ چیخوں کے متعلق چہ میگوئیاں

کررہے تھے۔ "چیخوں کی آواز اسی قبر سے آئی تھی۔" اچانک ان میں سے کوئی چیخا "لگتا ہے یہ زندہ ہے!" کسی نے قیاس آرائی کی "یہ تو علیم الدین کی قبر ہے جسے میں نے تین دن قبل خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا۔" کسی نے انکشاف کیا۔

"ہاں.....ہاں.....عابد صاحب درست کہہ رہے ہیں۔" کسی نے تائید کی "لیکن مجھے یقین ہے کہ قبر والا زندہ ہے۔"

تو پھر قبر اکھاڑ کر دیکھ لیتے ہیں۔" کسی نے کہا۔

وہ لوگ زور زور سے بول رہے تھے اور مجھے ان کی باتوں کا ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔

میں زور سے چیخا "ہاں.....ہاں.....قبر اکھاڑ دو.....اکھاڑ دو قبر میں.....زندہ ہوں ں ں ں ں ں ں!!"

"خاموش.....خاموش..... سنو! آواز پھر آرہی ہے!!" کوئی سب کو چپ کراتے ہوئے قبر کی آواز پر توجہ دلا رہا تھا۔

اور پھر خاموشی چھاگئی .....گہری اور اعصاب شکن خاموشی.....وقت کا اک اک لمحہ مجھ پر قیامت کی طرح بھاری گزر رہا تھا.....میرا جی چاہتا تھا جتنی جلدی ممکن ہو قبر کھول کر مجھے باہر نکال لیا جائے اور میں زندوں کی دنیا میں جی بھر کر لمبے لمبے سانس لوں اپنے بچھڑے ہوؤں سے ملوں.....

"مولوی صاحب اجازت ہو تو قبر کھول دیں۔" کسی نے اجازت چاہی۔

"ہاں.....ہاں.....کھول دو قبر۔" کئی آوازیں ابھریں۔

"اگر تم بضد ہو تو قبر اکھاڑو۔" کسی کی بھاری آواز سنائی دی اور پھر قرآن کی تلاوت شروع ہوگئی اور ساتھ ہی زمین پر اوزار چلنے کی آوازیں آنے لگیں.....

تھوڑی دیر بعد کھدائی کا سلسلہ رک گیا لیکن قرآن کی تلاوت جاری رہی میری آنکھیں بڑی بے قراری سے روشنی کی منتظر تھیں....ان صبر آزما لمحات میں مجھے دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا.....اور پھر اچانک پتھر کی بھاری سل ہٹ گئی.....ہوا کا تازہ جھونکا قبر کی حبس زدہ خوفناک گہرائی میں زندگی کے احساس کے ساتھ داخل ہوا.....اس کے ساتھ دو چہرے قبر کے دہانے پر جھکے دکھائی دیئے.....میں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھا.....دونوں کے منہ سے بیک وقت بھیانک چیخیں نکل گئیں اور چہروں کا رنگ زرد پڑ گیا.....اگلے لمحے وہ چہرے میری نظروں کے سامنے سے یکدم غائب ہوگئے اور پھر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے

لگیں..... شاید وہ سبھی خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے..... تھوڑی دیر بعد قدموں کی آوازیں دم توڑ گئیں..... میں ایک بار پھر بے بس ہو چکا تھا .... جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اٹھ کر قبر سے باہر نکل سکتا..... اور یہ بات بھی مجھے پریشان کئے دے رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو یہ لوگ دوبارہ قبر کو بند کر کے مٹی ڈال دیں اور میں ..... پھر ..... شاید واقعی مرجاؤں..... میں اسی لرزہ خیز سوچ میں غرق تھا کہ اچانک قدموں کی آوازیں دوبارہ سنائی دینے لگیں۔

"باقی سلیں ہٹا کر اسے باہر نکالو ..... آپ لوگوں کو یقین کیوں نہیں آرہا تھا کہ یہ زندہ ہے ..... یہ ..... واقعی زندہ ہے۔" مجھے کسی ہمدرد کی آواز سرہانے کے قریب سنائی دی۔

"مولوی صاحب! آپ اسے باہر نکالیں....." یہ کام آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"میں!!"

"ہاں .....ہاں..... آپ!" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

"اچھا!" مولوی صاحب کی مردہ آواز سنائی دی۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ قبر میں ..... اترنے لگے..... میں بے حس و حرکت پڑا انہیں نیچے اترتا دیکھ رہا تھا۔

اور پھر جوں ہی نیچے اتر کر انہوں نے میرے چہرے کا جائزہ لیا میں نے جسم کی قوتوں کو آخری بار جمع کیا اور اگلے لمحے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مولوی صاحب کی گردن کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

مولوی صاحب کے منہ سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی اور وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح تھر تھر کانپنے لگے..... ان کی پیشانی پر نمودار ہونے والا پسینہ قطروں کی صورت میں ..... ٹپ ٹپ میرے چہرے پر گرنے لگا.....

انہوں نے تیزی سے سیدھا ہو کر قبر سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے..... ان کی سانس اکھڑی ہوئی تھی..... وہ خود کو میری گرفت سے آزاد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے..... لیکن میں نے بھی دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسا کر ان کی گردن کو قابو کیا ہوا تھا۔

"مجھے باہر نکالو..... خدا کے لئے ..... جلدی کرو۔" مولوی صاحب گھگھیائے اور اگلے لمحے کئی لرزتے کانپتے ہاتھوں نے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں باہر کھینچ لیا میں بھی ان کے جسم کے ساتھ لٹکا ہوا قبر سے باہر آگیا..... جیسے میں بھی ان کے جسم کا ہی ایک حصہ ہوں۔

وہم

یمن کا حکمران یحییٰ تصویر کھنچوانا پسند نہیں کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ جب بھی اس کی تصویر کھنچے گی یا کسی اخبار میں شائع ہوگی اسی دن اس کی وفات ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک مصور نے اس کی قومی تصویر بنا کر اخبار میں شائع کی اور اسی دن ایک انقلابی نے حکمران یحییٰ کو قتل کر دیا۔

مرسلہ۔ رضوان اللہ خان۔ سکھر۔

"کوئی مجھے اس کے پنجے سے رہائی دلائے"

مولوی نے بے بسی سے درخواست کی لیکن خوف و دہشت سے کوئی ان کے نزدیک نہیں آرہا تھا..... سب ان کو قبر سے باہر کھینچ لینے کے بعد کئی گز دور جا کر کھڑے ہوئے تھے۔

مولوی صاحب کھڑے کانپ رہے تھے اور میں ان کے گلے سے ہار کی طرح لٹکا ہوا تھا..... اسی اثنا میں میرے گھر والے اور دیگر رشتہ دار بھی قبرستان پہنچ چکے تھے۔ میں ان کے سامنے ایک ناقابل یقین حقیقت کی صورت میں موجود تھا اور وہ قدرت کے اس کرشمہ پر انگشت بدنداں مجھے یوں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے..... جیسے انہیں میرے زندہ ہونے پر شک ہو۔

..... لیکن

..... میں زندہ تھا! بالکل زندہ!!

..... اللہ نے مجھے نئی زندگی بخش دی تھی

--- ○ ---

فوری طور پر طبی امداد دینے کے بعد ڈاکٹر نے میری زندگی خطرے سے باہر ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے میرے جلد از جلد صحت یاب ہو جانے کی خوشخبری سنائی۔

کافی دنوں کے علاج کے بعد جب میری حالت بہتر ہوئی تو سب سے پہلے میں اللہ کے حضور اس کی بے کراں مہربانی کے شکرانے میں سجدہ ریز ہو گیا اور ایک روحانی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا علاج کرانا شروع کیا اور آج میں بفضلِ تعالیٰ بالکل ٹھیک ہوں۔

آپ یقیناً "یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں گے کہ مجھے قبر میں کیوں کر زندہ دفنا دیا گیا۔ مجھے بچپن سے سکتے کی بیماری تھی۔ جب مجھ پر سکتے کا دورہ پڑتا تو کبھی تو تھوڑی دیر بعد میں ہوش میں آجاتا اور کبھی کبھار یہ دورانیہ بہت طویل ہو جایا کرتا تھا۔ اب کی بار جب مجھ پر سکتہ طاری ہوا تو کافی دیر تک میں سنبھل نہ سکا۔ خاندان کے کئی افراد نے میرے مرنے کی تصدیق کر دی..... پورے خاندان میں صف ماتم بچھ گئی اور گھر والوں نے میرا "زندہ" جسد خاکی تمام مذہبی رسوم کی تکمیل کے بعد قبر کی اندھیری کوٹھری میں اتار دیا۔

کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ میں بہترین

قالین کی صفائی میں اعلیٰ ترین

TIP-TOP

DRYCLEANERS

TOPS IN DRYCLEANING

*

ہیڈ آفس

علامہ اقبال روڈ ـــــ ۴۵۵۰۹۴۳

*

برانچ آفس

* حسن اپارٹمنٹس ـ ۴۹۶۵۰۶۸
* کلفٹن ـــــ ۵۳۰۲۶۹
* ویڈن برن روڈ ـ ۴۹۴۶۶۱۹
* ڈیفنس سوسائٹی ـ ۵۴۲۱۶۳
* ناظم آباد ـ ۶۲۳۸۱۳
* بلوچ کالونی ۴۳۲۹۵۹

اب میں کیا کروں؟

میں سخت الجھن کا شکار ہوں۔ ہم گھر والے ایک ایسے فلیٹ میں رہتے ہیں جس کے پانی کا ٹینک مشترکہ ہے۔ اس ٹینک سے چار فلیٹوں میں پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ چونکہ پانی کا اکثر ناغہ ہو جاتا ہے اس لئے ٹینک سے پانی ختم ہو جاتا ہے اور جب پانی ختم ہو جاتا ہے تو چاروں فلیٹ کے بڑے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں وہ ایک دوسرے پر پانی زیادہ خرچ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کی شکایتیں ایسی بچکانہ ہوتی ہیں کہ بتاتے ہوئے بھی ہنسی آتی ہے۔ کئی بار تو نوبت مار پیٹ کی بھی آچکی ہے۔ میں اپنے بڑے بھائی اور والد صاحب سے دبے لفظوں میں کہہ چکا ہوں کہ پڑوسیوں سے لڑنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے لیکن بھائی صاحب کہتے ہیں کہ اپنے حق کے لئے لڑنا جہاد ہے چونکہ ہفتے پندرہ دن پر لڑائی ضرور ہوتی ہے اس لئے میں سخت پریشان رہنے لگا ہوں، مجھے سخت شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ باہر نکل کر لڑتے ہیں اور باقی لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں دوسرے کیا سوچتے ہوں گے کہ کیسے جاہل لوگ ہیں لیکن افسوس کہ لڑنے والوں کو اس کا احساس ہی نہیں۔ بھلا بتایئے میں کیا کروں؟

(ش، م، کراچی)

پچھلے ماہ جمیل احمد کراچی نے اپنا مسئلہ بھیجا تھا کہ ان کی اکثر باجماعت نماز شرم اور جھجھک کی وجہ سے قضا ہو جاتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب وہ کسی کے گھر گئے ہوئے ہوں یا کوئی دوست اور عزیز ساتھ ہو تو وہ اس خیال سے نماز کے لئے نہیں کہہ پاتے کہ کہیں مہمان یا دوست یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنے نمازی ہونے کا رعب ڈال رہے ہیں۔ ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے جو مشورے موصول ہوئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں :

عقیلہ رشید، لاہور۔ جمیل احمد صاحب، آپ کا مسئلہ تو بہت عجیب و غریب سا ہے۔ اس کا آسان سا حل تو یہی ہے کہ آپ پکا ارادہ کرلیں کہ آپ کسی صورت میں نماز نہیں چھوڑیں گے، جب نماز کا وقت ہو تو تمام خیالات ذہن سے نکال کر نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں اور تصور کرلیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں اگر یہ تصور قائم نہیں کرسکتے تو یہ تصور قائم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ نماز کا وقت ہو تو آپ اپنے دوست کو بھی نماز کی دعوت دیجئے۔

اعجاز، (؟)۔ نماز کے لئے کہنے میں شرم اور جھجھک کیسی۔ نماز کے لئے کہنے سے رعب نہیں پڑتا بلکہ یہ تو دوسروں کو ان کا فرض یاد دلانا ہے۔ اس احساس کو دور کرلیجئے۔

محمد کامران ایوب، کراچی۔ میرے بھائی، آپ جب اپنے دوست یا عزیز کے ساتھ بیٹھے ہوں اور نماز کا وقت ہو جائے تو صرف آپ اپنی فکر نہ کریں بلکہ اپنے دوست یا عزیز کو بھی نماز کی دعوت دیں۔ اسی طرح آپ کا عزیز نماز پڑھے یا نہ پڑھے آپ نماز ضرور پڑھ لیں گے۔ جیسا چوکیدار کا معاملہ ہے کہ وہ ..... "جاگتے رہنا" "جاگتے رہنا" کی آواز لگاتا ہے اب کوئی دوسرا جاگے یا نہ جاگے وہ خود ضرور جاگتا رہتا ہے۔

شگفتہ صدیقی، کراچی کیا تم نے سنا نہیں کہ نماز سے مت کہو کہ مجھے کام ہے۔ بلکہ کام سے کہو کہ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ جن لوگوں سے آپ کو نماز کا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ مسلمان وہ ہے جو خود بھی نماز پڑھے اور دوسروں کو بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

سید شعیب علی، گجرات۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے : "نماز ایک ایسا فرض ہے

کہ جو کسی حالت میں معاف نہیں۔ خواہ انسان بیمار ہو یا سفر کی حالت میں۔" اس حدیث سے نماز کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ اب جو آدمی نماز نہیں پڑھتا وہ ایک برائی میں ملوث ہے لہٰذا حضور صلعم کی ایک اور حدیث ہے کہ "جو شخص کسی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور اسے منع نہیں کرتا تو وہ بھی اس برائی میں برابر کا شریک ہوجاتا ہے۔"

یاد رکھیئے نیک کام میں شرم اور جھجھک سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

انعام یافتہ حل

آنحضرت صلی اللہ کا فرمان ہے کہ

"جس نے جان بوجھ کر بھی ایک نماز چھوڑی گویا اس نے کفر کیا"

دینی معاملات میں بے حسی انسان کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ جب بنی اسرائیل پر عذاب آیا، تو سب سے پہلے اس شخص کو عذاب دیا گیا جو بڑا ہی پرہیز گار اور متقی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو بُرے کام کرتے ہوئے دیکھتا، مگر ان کو منع نہ کرتا جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادتیں کرتا، مگر لوگوں کو اللہ کے غضب سے نہ ڈراتا تھا۔

جناب جمیل احمد! سوچیں اور کانپ اٹھیئے کہ کیا ہم اس بنی اسرائیل کے شخص جیسے نہیں؟ اب بھی وقت ہے کہ ہم جاگ جائیں۔ نیکی کی دعوت عام کریں۔ اپنے دوستوں، عزیز رشتہ داروں اور گھر والوں کو نماز پڑھنے اور نیکی کی دعوت دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ

"اپنے اہل وعیال کو اس جہنم کی آگ سے بچاؤ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔"

اگر آپ سچے دل سے دوستوں کو نماز پڑھنے کی ترغیب دلاتے رہے تو یہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔ نیک کام کرتے وقت جھجھک اور شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ شرم تو برے کام کرتے وقت آنی چاہئے۔ اللہ آپ کو ہدایت دے۔ (آمین)

(محمد رمضان، گجرات)

محمد محسن اعظم، میرپور آزاد کشمیر : چند لوگ تو لاعلمی کی وجہ سے نماز پڑھنے والوں کے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں لیکن آپ کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ نماز کے وقت یہ کہہ کر اجازت طلب کر لیجئے کہ ایک ضروری کام کر کے ابھی آتا ہوں۔

شیر نواز گل، پشاور : اگر آپ اچھے نمازی ہونا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو ان رکاوٹوں کو صبر و تحمل کے ساتھ عبور کرنا پڑے گا۔

نوشین مختار، لاہور : نماز کے لئے کسی سے اجازت طلب کرنے میں شرم یا جھجھک کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آپ اس پر رعب ڈال رہے ہیں تو یہ اس کی کم ظرفی اور کم عقلی ہے۔

علی خرم پاشا، اسلام آباد : اگر کبھی ایسا موقع آئے تو دوستوں کو بھی نماز کی دعوت دیں اور اگر وہ ٹال مٹول سے کام لیں تو آپ سیدھا مسجد کا رخ کریں۔ دوستوں یا مہمانوں کی مروّت میں نماز چھوڑ دینا یقیناً" اچھی عادت نہیں۔ ایک دو دفعہ ایسا کرنے کے بعد آپ کو یہ احساس بھی نہیں رہے گا کہ "لوگ کیا کہیں گے۔"

آنکھ مچولی آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے مشوروں کی روشنی میں بہتر سے بہتر رسالہ ترتیب دیں اور بروقت آپ تک پہنچائیں۔ ہماری کاوش آپ تک اور آپ کی رائے ہم تک پہنچانے میں

ہمارے معاون ہمارے مددگار

صوبہ سرحد و پنجاب میں "آنکھ مچولی" کے ایجنٹ

۱	افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵	۱۰	طاہر نیوز ایجنسی	جہلم
۲	سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹	۱۱	چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان - ۷۲۶۲۶
۳	ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲	۱۲	مسلم بُک ڈپو	سرائے عالمگیر
۴	اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰	۱۳	رحمت بُک اسٹال	اوکاڑہ
۵	فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶	۱۴	رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاولنگر
۶	اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ		۱۵	ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ ۸۷۹۸۹
۷	سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹	۱۶	سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال
۸	پاکستان اسٹنڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱	۱۷	اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی ۲۸۸۹
۹	خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱	۱۸	کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور ۲۹۵۷

خط وکتابت کے لیے **سرکولیشن مینجر"** ماہنامہ **آنکھ مچولی**، اے-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قابلِ اعتماد۔ غذائیت سے بھرپور

دیسی گندم کا آٹا

کپڑے اور کاغذ کے تھیلوں میں
ممتاز اسٹورز اور یوٹیلٹی اسٹورز
پر دستیاب ہے۔

کراچی میں

کپڑے کے
تھیلوں میں دیسی گندم
کا آٹا پیش کرنے کا سب سے
پہلا شرف ہمارے ادارے
کو حاصل ہے۔

اشرفی برانڈ
آٹا سے پکائی ہوئی روٹی نرم
اور ملائم رہتی ہے کیونکہ ہم
خودکار مشینوں پر اعلیٰ نسب
کی دیسی گندم سے آٹا تیار
کرتے ہیں اس میں میدہ اور
سوجی پوری مقدار میں شامل
ہوتے ہیں جو کہ آٹے میں
غذائیت کا جزوِ اعظم ہیں
اب انٹرنیشنل کاغذ کی پیکنگ
میں بھی دستیاب ہے۔

اشرفی
برانڈ آٹا ۲۵ سال سے
اعلیٰ معیار کی ضمانت

کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو
ہم نے تمہیں
عطا کی ہیں۔ (القرآن)

ماہانہ گھریلو خریداری میں سرفہرست

اچھی صحت، خدا کی نعمت

ہُوا یُوں کہ.....

جب احسان کرو تو

عبدالمجید انجم

میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ اسی برسات کے موسم میں میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ میں اور میرا دوست عرفان برسات کے موسم میں ایک تیز بارش کے دوران اکٹھے بیٹھے ایک پروگرام بنا رہے تھے۔ ہمارے گھر کے قریب ہی جامن کا ایک باغ ہے جو کافی بڑا ہے۔ اس کا مالی جو پہلے تھا ہمارا واقف کار تھا یعنی ہم اپنے امی ابو بڑے بھائی کے ساتھ وہاں جاتے رہتے تھے۔ برسات کے موسم میں جامن پکے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ برسات کی ایک تیز بارش تھی۔ ہم نے پروگرام ترتیب دیا اور ایک عدد تھیلے کے ساتھ باغ میں داخل ہوگئے۔ چونکہ بارش کافی تیز تھی اس لئے ہمارا خیال تھا کہ کافی سارے جامن گرے ہوں گے۔ جو ہم اٹھا کر لائیں گے اور مزے مزے سے کھائیں گے یہی سب سوچتے ہوئے ہم باغ میں داخل ہوگئے۔ تیز بارش ہو رہی تھی اور مالی بابا بھی اپنی جھونپڑی میں

دبکے بیٹھے تھے۔

ہم نے احتیاط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک بڑے سے جامن کے پیڑ کا انتخاب کیا اور اس کے نیچے سے جامن اکٹھے کر کے تھیلے میں ڈالنے لگے۔ ہم بڑے مزے سے جامن کھا بھی رہے تھے اور اکٹھے بھی کر رہے تھے۔ یہاں میں آپ کو ایک بات بتادوں کہ عرفان فطرتاً کمزور دل کا مالک اور ایک بزدل سا لڑکا تھا۔

میں درخت کے چاروں طرف گھوم پھر کر جامن اکٹھے کر رہا تھا جبکہ وہ درخت کے قریب ہی ادھر ادھر سے جامن اٹھا رہا تھا۔ اچانک وہ کچھ ہو گیا کہ جس کا ہمیں گمان بھی نہ تھا۔ موسم طوفانی تھا۔ تیز بارش کے ساتھ ساتھ ہوا بھی بڑے زوروں کی چل رہی تھی اِس لئے ایسے واقعات ہوتے پتہ نہیں چلتا۔

اُف وہ لمحہ! اب بھی یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایک موٹا سا تنا گرا اور عرفان کو لیتے ہوئے زمین پر آرہا۔ کچھ تو عرفان کمزور دل کا مالک تھا اور کچھ یہ مصیبت اچانک آئی تھی اس لئے عرفان کو چیخنے کا موقع بھی نہ ملا اور بیچارہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس پر ستم یہ کہ تنا بھی اس کے اوپر گرا تھا۔ اس کی ٹانگیں تنے کی موٹی لکڑی کے نیچے دب گئی تھیں۔ میں اس صورت حال سے گھبرا تو گیا لیکن فوری ردعمل کے طور پر میں نے تنے کو ایک طرف ہٹانے کے لئے زور آزمائی شروع کر دی۔ لیکن تنا کافی موٹا تھا۔ اس لئے میں اسے اٹھانے میں ناکام رہا۔ میرا دماغ کام کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا اور میں منٹوں یونہی بے مقصد زور آزمائی کرتا رہا۔

جب مجھے ناکامی ہوئی تو میں نے باقاعدہ سوچنا شروع کر دیا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ اس ترکیب سے عرفان تنے کے نیچے سے نکل سکتا تھا میں نے عرفان کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔

تھوڑی دیر بعد عرفان کو ہوش آگیا اور میں نے اسے ساری بات سمجھا دی کہ میں تنے کو ایک طرف سے پکڑ کر اٹھاؤں گا اور تمہیں نیچے سے نکلنے کی کوشش کرنی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب بات اس کی سمجھ میں آگئی تو میں نے تنے کو ایک طرف سے پکڑ کر اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔

اب چونکہ تنا ایک طرف سے اٹھایا گیا تھا۔ اس لئے آسانی سے اٹھ گیا میں نے عرفان کو نکلنے کے لئے کہا لیکن عرفان کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ (شاید وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا) ..... میں بہت پریشان ہو گیا۔ تنے کو چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اگر تنے کو چھوڑنے میں تیزی سے کام لیا جاتا تو وہ ایک جھٹکے سے نیچے گرتا اور عرفان کی درگت لازمی بن جاتی۔ میں نے عرفان

کو تیز آواز میں چلا کر پکارنا شروع کردیا۔ لیکن اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی میں تنے کو آہستہ آہستہ نیچے لانے سے قاصر تھا۔ اس لئے اسے اٹھائے کھڑا رہا اور عرفان کو پکارتا رہا۔ اسی کوشش میں میرے ہاتھ شل ہوگئے لیکن عرفان کے جسم میں حرکت نہ ہوئی۔ آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر میں خدا کو پکارنے لگ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو ایسے جاری ہوگئے جیسے کہ بارش کے دوران چھت ٹپکتی ہے۔

تیز بارش، طوفانی ہوا، ایسے میں کسی کو کیا بلاتا، بس دعا کرتا رہا اور عرفان کو آواز دیتا رہا۔ قریب تھا کہ ہاتھوں کی تکلیف سے تنگ آکر میں تنے کو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیتا اور وہ سیدھا عرفان کے اوپر گرتا اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور پھر تنا کچھ بلند ہوگیا۔

میں نے گھوم کر اور تنے کو پکڑے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا۔ کوئی شخص اپنا چہرہ نقاب میں چھپا کر تنے کو پکڑے کھڑا تھا۔ اسی وقت وہ بولا۔ "بیٹے! جلدی کرو اپنے دوست کو تنے کے نیچے سے نکالو" ..... اس کی آواز سن کر میں چونکا۔ لیکن تیزی سے عرفان کی طرف بڑھا اور اسے تنے کے نیچے سے نکال کر ایک قدرے اونچی جگہ پر لٹادیا اور اسے ہوش میں لانے کے کوشش شروع کردی۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ وہ شخص جارہا ہے۔ اس خراب موسم میں وہی تو میرے لئے امید کی کرن بن کر آیا تھا اور اب وہ بھی جارہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اچانک میں نے ہمت کی اور کہا۔

"کہاں جارہے ہو مالی بابا، ہمیں آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔" میری آواز پر وہ چونکا اور پھر عرفان کو اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں لے آیا بلاشبہ وہ مالی بابا ہی تھا اور میں اسے پہچان چکا تھا۔

جھونپڑی میں عرفان کو لٹا کر مالی بابا نے اسے ایک موٹا سا کمبل اوڑھا دیا جس کی کہ عرفان کو اشد ضرورت تھی۔ تھوڑی سی کوشش پر عرفان کو ہوش آگیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد کے ماحول کو دیکھنے لگا۔

غالباً ابھی تک تنے کے گرنے والا حادثہ اس کے ذہن پر ابھر کر اسے پریشان کررہا تھا۔ کمبل میں لیٹے رہنے کی وجہ سے اسے کافی آرام ملا۔ تھوڑی دیر بعد مالی بابا نے مجھے دودھ کا ایک گلاس اور عرفان کو دودھ کے گلاس کے ساتھ کچھ گولیاں دیں جو اس نے احتیاط رکھی ہوئی تھیں۔

ہم نے دودھ کا گلاس شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد عرفان کی حالت بالکل نارمل ہوچکی تھی۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بے ہوشی میں

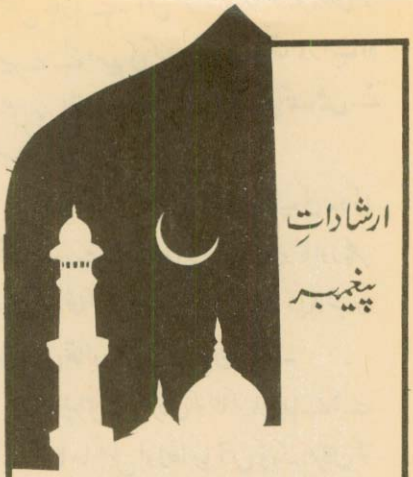

○ ..... اخلاق کا اچھا ہونا محبتِ الٰہی کی دلیل ہے۔

○ ..... دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

○ ..... جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضو کرو۔

○ ..... آپس میں سلام کا رواج عام کرو، محبت بڑھے گی۔

○ ..... جو شخص اپنے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

○ ..... کسی انسان کے دل میں ایمان اور حسد اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

مرسلہ منزہ شیخ جنگ گجرات

چوٹ سے زیادہ خوف کا دخل تھا کیونکہ چوٹ تو بہرحال اسے آئی تھی۔ لیکن..... اتنی نہیں آئی تھی کہ وہ بے ہوش ہی ہوجاتا چونکہ وہ کافی بزدل تھا اسی لئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اب ایک حد تک آرام پاکر وہ بالکل نارمل ہوچکا تھا اور شرمندہ شرمندہ سی نظروں سے مالی بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی بہت حد تک شرمندہ تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں جب عرفان کو اٹھنے کے لئے کہتے ہوئے چیخ رہا تھا تو اگر مالی بابا نہ آتے تو کیا ہوتا ایک گھنٹے بعد بارش رک چکی تھی اور ہم گھر جانے کے لئے تیار ہوچکے تھے۔

اس لئے ہم نے شرمندہ سے انداز میں مالی بابا سے اجازت چاہی اور گھر کو چل دیئے لیکن چلنے سے پہلے میں پوچھ ہی بیٹھا "مالی بابا آپ نے نقاب کیوں اوڑھ رکھا تھا؟"

مالی بابا نے اس کا بہت مختصر جواب دیا تھا کہ

"کسی پر جب احسان کیا جائے تو جس پر احسان کیا جاتا ہے اس سے اپنے آپ کو ہر ممکنہ حد تک چھپانے کی کوشش کرنی چاہئے تاکہ وہ بھی سر اٹھا کر چل سکے۔"

اس طرح ساری بات مجھ پر واضح ہوگئی اور ہم نے گھر کی راہ لی۔ اس واقعہ کے بعد عرفان اور میں نے ایسے ہر کام سے توبہ کرلی۔ مالی بابا کو فوت ہوئے اب دو سال ہوچکے ہیں لیکن آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو میرا دل اس عظیم انسان کی یاد میں بھر آتا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مالی بابا کو جنت الفردوس میں جگہ ملے۔ آمین۔

ٹیوشن
رحمت ہے یا زحمت

ادارہ آنکھ مچولی نے "ٹیوشن رحمت ہے یا زحمت" کے عنوان سے تحریری مباحثے کا اعلان کیا تھا۔ اس مباحثے کے لئے ہمیں سینکڑوں مضامین موصول ہوئے۔ فیصلے کے لئے معروف نوجوان ادیب اور ٹیلی وژن کے اسکرپٹ رائٹر جناب سہیل احمد صدیقی کو زحمت دی گئی تھی جنہوں نے تمام مضامین کو پڑھنے کے بعد اول، دوم، سوم انعامات کا تعین کیا ہے۔ انعام یافتہ مضامین شائع کیے جارہے ہیں۔ ہم انعام جیتنے والوں کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

پہلا انعام

طیبہ صدف، رحیم یار خان

"ٹیوشن رحمت ہے یا زحمت" جناب والا! تحریری مباحثے کے اس موضوع نے ان طلبہ کو اپنے خیالات کے اظہار ایک سنہری موقع دیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ایک اچھا ذہن عطا کرتا ہے۔ اور جو "محنت کرکے آگے بڑھنے" کی لگن بھی رکھتے ہیں۔ لیکن رستے میں حائل رکاوٹیں انہیں ان کی منزل سے دور لے جاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں میں ٹیوشن بھی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس رکاوٹ کو زحمت ہی کہا جاسکتا ہے۔ ایسے طالب علم جن کے والدین اپنا پیٹ کاٹ کر بمشکل ان کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے ہیں۔ ٹیوشن پڑھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے والدین اتنا زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ انہیں جو کچھ کرنا ہے اسکول میں کروائی جانے والی پڑھائی اور اپنی محنت کے

بل بوتے پر کرتا ہے لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ انہیں ان کی محنت کا ثمر بھی نہیں ملتا۔ اسکولوں میں اساتذہ کرام ان طلبہ پر "خصوصی توجہ" دیتے ہیں جو بہت زیادہ شوق سے ان سے ٹیوشن پڑھتے ہیں اور "ان ہی" طلبہ کو نمایاں پوزیشنیں بھی دلائی جاتی ہیں۔ جناب والا! میرا آپ سے سوال ہے کہ کیا اب "کامیابی کا معیار" محنت کی بجائے ٹیوشن ہے۔ وہ چیز جس کی بنیاد پر حقداروں کو ان کے حق سے محروم کردیا جاتا ہے رحمت کیسے ہوسکتی ہے۔ ٹیوشن ہی وہ "موذی چیز" ہے جس کے باعث اساتذہ کرام زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی دھن میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت برتنے لگے ہیں۔ ایسے میں شائد وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنی ڈیوٹی کی ادائیگی کے دوران وقت کے ایک ایک لمحہ کے ضیاع کی طلبہ کو بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ خصوصاً" ان طلبہ کو جو ٹیوشن نہیں پڑھتے یا پڑھ نہیں سکتے۔ فری پیریڈ ہونے کے باوجود اساتذہ کرام دوسرے پیریڈز بھی کثرت سے چھوڑتے ہیں اگرچہ ایسے استاد بھی موجود ہیں جو ایک پیریڈ بھی غیر ضروری طور پر نہیں چھوڑتے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ جان بوجھ کر کورس مکمل نہیں کروایا جاتا تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ ٹیوشن رکھنے پر مجبور ہوجائیں۔ (بھئی اگر کورس ہی مکمل نہیں ہوگا تو امتحان کس چیز کا دیں گے)

جناب والا! میرے مخالفین جن کا خیال ہے کہ ٹیوشن ہمارے لئے ایک رحمت ہے ان کی رائے ذرا ملاحظہ کیجیئے کہ چونکہ اسکولوں سے تعلیم ناپید ہوچکی ہے اس لئے ٹیوشن ہی وہ راستہ ہے جس سے ایک طالب علم استاد کی خصوصی توجہ کے ساتھ علم حاصل کرسکتا ہے تو جناب پہلے تو اس بات سے پردہ اٹھایئے کہ اسکولوں میں تعلیمی معیار گرنے اور تعلیم کے ناپید ہونے کی وجوہات کیا ہیں۔ یقیناً" میرے مخالفین ایسا کرنے سے ہچکچائیں گے۔ یہ کام بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ تو سنیئے، ان وجوہات میں ٹیوشن ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو اساتذہ کرام ٹیوشن پڑھاتے ہیں ان کی توجہ اسکول میں کم اور اپنے ٹیوشن سینٹر پر زیادہ ہوتی جاتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسکول میں پڑھائی کا معیار گرجاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ٹیوشن تو بے شمار طلبہ پڑھتے ہیں اگر ان میں سے ہر ایک کو (ٹیوشن کے حمائیتیوں کی رائے کے مطابق) استاد کی بھرپور توجہ ملتی ہے تو ہر ٹیوشن پڑھنے والے طالب علم کو بہت ذہین اور قابل ہونا چاہیئے لیکن ہمارا مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ بہت سے طالب علم ٹیوشن پڑھنے کے باوجود ناکام ہوجاتے ہیں۔ اور کئی طالب علم ٹیوشن پڑھے بغیر بھی کامیابی سے ہمکنار

ہوتے ہیں۔ کسی بھی طالب علم کو ٹیوشن نہیں بلکہ اس کی محنت قابل بناتی ہے۔ ٹیوشن تو صرف اور صرف پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ بن چکی ہے۔

موجودہ دور میں بے شمار لوگ ٹیوشن کو تعلیمی میدان میں بہتری کے لئے نہیں بلکہ فیشن کے طور پر بھی اپناتے ہیں۔ نمایاں کامیابی کے لئے ٹیوشن پڑھنا لازمی خیال کیا جاتا ہے لیکن جناب والا! سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٹیوشن پڑھنا اتنا لازمی ہوا کیسے؟ ایک وقت تھا جب ٹیوشن پڑھنا بہت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ جو طلبہ ٹیوشن پڑھتے تھے وہ یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے مبادا کہ ان کے ساتھی انہیں یہ طعنہ نہ دے دیں کہ "بھئی نکمے ہوگئے ہو کیا جو ٹیوشن کی ضرورت پڑ گئی؟" لیکن اب صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے اب تو بڑے فخر سے بتایا جاتا ہے کہ ہم اتنی ٹیوشنز پڑھتے ہیں۔ گویا ٹیوشن پڑھنا باعثِ عزت و فخر سمجھا جاتا ہے۔ ٹیوشن کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ یہ ہے کہ والدین اسکولوں میں کروائی جانے والی پڑھائی سے مطمئن نہیں ہیں۔ لیکن جناب والا! ایسی صورت میں ہم دوسرے راستے اختیار کرنے کی بجائے یہ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ اسکولوں میں تعلیم کا معیار بہتر بنایا جائے۔ جناب والا! تمام والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں۔ اس کے لئے وہ اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہیں اور بچوں کو ٹیوشن رکھوانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کے بچے نمایاں کامیابی حاصل کریں لیکن ایسے میں ہم ان غریب والدین کو کیوں بھول جاتے ہیں جو اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اساتذہ کی بھاری بھر کم فیسیں ادا کرکے اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھا سکیں اور یہ بات آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی استاد فیس کے بغیر نہیں پڑھاتا۔ سوال یہ ہے کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا انہیں حق نہیں کہ وہ ترقی کی راہوں میں دوسروں کے ہم قدم چلیں۔ وہ بھی معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی اکثریت ان لوگوں پر ہی مشتمل ہے۔ ایسے میں ایک دور اندیش انسان یہ جان سکتا ہے کہ ٹیوشن زحمت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ "یہ ملک کے مستقبل کے لئے بھی زحمت ہے اور ملک کے عوام کے مستقبل کے لئے بھی۔"

جناب والا! یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ملک اور اپنی قوم کی بھلائی کے لئے ٹیوشن کے بڑھتے ہوئے رجحان کو ختم کریں۔ اس بات سے سبھی آگاہ ہیں کہ اگر اسکولوں میں بھرپور توجہ اور لگن سے پڑھایا جائے، وقت کے ایک ایک لمحے کی صحیح معنوں میں قدر کی جائے تو کسی طالب علم

کوٹیوشن پڑھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ وہ چیز جس سے ہمارے ملک کے غریب عوام پریشانی سے دوچار ہوں یقیناً" ایک "بہت بڑی زحمت" ہے۔

دوسرا انعام

حمیرا ناز، ہری پور ہزارہ

یہ دُکھ نہیں کہ وہ سمجھا نہیں میرے فن کو
مخالفت کا سلیقہ نہیں تھا میرے دشمن کو

جناب صدر!

آج جس موضوع پر میں لکھنے کی جسارت کررہی ہوں وہ ہے "ٹیوشن زحمت ہے۔" جناب صدر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیوشن زحمت ہے اور طلبہ پر اضافی مالی بوجھ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اللہ نے انسان کو عقلِ سلیم اس لئے عطا کی ہے کہ وہ اسے استعمال کرے پھر زندگی کے ہر شعبے میں اس کے لئے مختلف رہنما مقرر کردیئے گئے ہیں۔ جیسے پرورش کے لئے والدین، تعلیم اور روحانی تربیت کے لئے اساتذہ کرام وغیرہ۔

اب انسان کا کام یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنی عقل سلیم کو استعمال کرے اور جہاں کہیں رہنمائی کی ضرورت پڑے اپنے رہنماؤں سے رابطہ کرلے۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

مگر آج کل ہر کوئی آرام پسند زندگی کا طالب ہے اور دوسروں پر انحصار کرتا ہے۔ ٹیوشن بھی ایک ایسا ہی مرض ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ٹیوشن کی وبا شروع کہاں سے ہوئی اور پھیلی کیسے؟ ہوسکتا ہے کہ ایک دن کلاس میں کسی بچے کو کوئی سوال ٹھیک سے سمجھ نہیں آیا اور اس نے آکے والدین سے کہا کہ آج مجھے یہ چیز سمجھ میں نہیں آئی پھر والدین نے بجائے اس کو یہ نصیحت کرنے کے کہ جاکے استاد سے ٹھیک طرح سے سمجھو، سوچا ہوگا کہ کیوں نہ اس کے لئے علیحدہ استاد کا انتظام کردیں اور یوں یہ وبا شروع ہوئی اور جیسے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ایسے ہی انہوں نے بھی ٹیوشنیں لگوالیں اور یوں استادوں کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگیا۔ اور ان کی توجہ اسکول سے ہٹ کر ٹیوشنوں کی طرف مبذول ہوگئی۔ شروع شروع میں وہ بھی محنت کرواتے تھے مگر جیسے ہی زمانے نے مزید ترقی کی، بازار میں گیس پیپرز، ٹیسٹ پیپرز اور اسی طرح کے دوسرے "پیپرز" آگئے۔

استادوں کا بوجھ بھی کم ہوا اور ان کی تمام توجہ آسان سے آسان طریقے سے روپے کمانے پر مبذول ہوگئی۔ اس اثنا میں سفارش کا دور دورہ ہوا اور ..... نااہل امیدوار معلم جیسے مقدس پیشے کے لئے منتخب ہونے لگے۔ اس تمام

عمل میں غریب طلبا' جن کی حالت پہلے ہی دگرگوں تھی مزید خستہ حال ہوئے اور یوں ان کو ٹیوشن مجبوراً" لینی پڑی۔ یہ تمام تمہید اس لئے باندھی ہے تاکہ ساتھیوں پر تمام پس منظر واضح ہوسکے۔ اب آتے ہیں اصل بات کی طرف۔

جب سفارش کا دور دورہ ہوا جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے' تو طلبا کی پریشانیاں مزید بڑھ گئیں۔ اس وجہ سے اساتذہ اور طلبا کے درمیان کچھ فاصلہ پیدا ہوگیا۔ یہاں سے طلبا کی غلطی شروع ہوئی ہے۔ اگر وہ روزانہ استادوں سے اپنے مسائل ڈسکس کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ استاد انہیں ٹھیک طرح سے نہ سمجھاتے۔ مگر طلبا بھی آرام پسند ہوچکے تھے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹیوشنز لگوانی شروع کردیں کہ فی الوقت یہی کامیابی کی ضمانت بن گئی تھی۔ حالانکہ اچھے اور محنتی استادوں کی کمی کبھی بھی نہیں رہی ہے۔ اس صورت حال میں جب متوسط گھرانوں کے بچوں نے اپنے والدین کو ٹیوشنوں کے لئے تنگ کرنا شروع کردیا تو انہوں نے یہ سوچ کر کہ

غم کی زد میں اگر بگڑ جائیں
پھر کہاں قسمتیں سنورتی ہیں !

جیسے تیسے کرکے ٹیوشن تو لگوادی مگر جب نتیجہ حسب توقع آنے کے بجائے خلاف توقع آیا تو ان کے خواب کیسے چکنا چور ہوئے ہوں گے۔ اس کا اندازہ آپ بہتر طور پر لگا سکتے ہیں۔ حالانکہ یہی طالب علم اساتذہ کو اپنے مضمون میں دلچسپی لینے پر مجبور کرسکتے تھے۔ اگر یہ طلبا تھوڑی سی محنت کرتے اور روزانہ کا سبق روزانہ پڑھ کر اس میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر سوال پوچھتے تو استاد خود بخود ان میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوجاتا۔

ایک بات تو طے ہے کہ جتنی سمجھ انسان کو اپنی ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں۔ ویسے بھی جو چیز انسان خود پڑھتا ہے وہ اسے تاعمر یاد رہتی ہے۔ جبکہ ٹیوشن پڑھنے سے انسان دوسروں پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن کو زنگ لگ جاتا ہے اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لئے بھی دوسروں کا محتاج ہوجاتا ہے اور ہمارا ملک جو پہلے ہی نہایت سست روی سے ترقی کررہا ہے اور قرضوں اور امداد کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے جب اس کو اس سے بھی زیادہ سست قسم کا مستقبل ملے گا تو اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے برعکس جو انسان خود پڑھتا ہے وہ وقت کی قدر کرنا جانتا ہے ایسا انسان ہر چیز سے' ہر بات سے سیکھتا ہے اور نہایت محنتی ہوتا ہے اور پاکستان کو اس وقت ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

ایک بات اور یہ کہ جو لوگ ٹیوشن پڑھاتے ہیں ان کا طریقہ مختلف ہوتا ہے اس طریقے سے جس سے استاد پڑھاتے ہیں لہٰذا ایک طالب علم

جو ایک سوال کو صبح ایک طریقے سے پڑھتا ہے شام کو دوسرے طریقے سے۔ پیپرز میں ایک کو بھی صحیح طرح بیان نہیں کر سکتا اور یوں ذہنی دباؤ اور بوجھ اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ آج کے اس مہنگائی کے دور میں جہاں ایک متوسط طبقہ بمشکل اپنی ضروریات پوری کرتا ہے جب ٹیوشن جیسی فارملیٹیز اور تکلفات میں پڑے گا تو یہ بلاشبہ اس کے لئے مالی زحمت ہے۔

ہمارے ہاں اکثر طالب علموں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ استاد ٹھیک سے پڑھاتے نہیں ہیں۔ میں ان سے پوچھتی ہوں کہ اگر وہ محنتی ہیں اور روز کے روز پڑھتے ہیں تو پھر اپنے مسائل کیوں نہیں بتاتے۔ آخر وہ کس انتظار میں ہیں۔ ہم خود پر انحصار کرنا کب سیکھیں گے۔ اگر ہم میں صرف خود انحصاری پیدا ہوجائے تو ہم جاپان کی طرح ریکارڈ مدت میں ترقی کرلیں۔ آج کتنے عرصے سے ہم سن رہے ہیں کہ پاکستان ترقی کررہا ہے۔ آخر وہ دن کب آئے گا جب ہم سنیں گے کہ پاکستان ترقی کرچکا ہے۔ شاعر مشرق کا فرمان ہے،

نہیں ناامید اقبال اپنے کِشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

تیسرا انعام

اسماء شفیق

اس مرتبہ مباحثے کا جو عنوان دیا گیا ہے اس میں شاید اکثر قارئین کی رائے یہ ہو کہ ٹیوشن ایک زحمت ہے لیکن اگر ہم اپنے قرب و جوار میں پوری سچائی کے ساتھ ایک نگاہ دوڑائیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ٹیوشن درحقیقت طالب علموں کے لئے رحمت ہے۔

شہر کراچی میں جس تعداد میں ٹیوشن سینٹر موجود ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان ٹیوشن سینٹروں میں طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد شاید اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ٹیوشن پڑھنا طالب علموں کی ضرورت بن چکا ہے۔

جناب والا! آج کا طالب علم اتنا سمجھ دار ضرور ہے کہ اسے اپنے والدین کا مالی بوجھ بڑھاتے ہوئے ضرور شرمندگی کا سامنا ہوتا ہوگا لیکن کیا کیا جائے کہ وہ ٹیوشن کے اس اضافی خرچے کے بغیر اگلی جماعت میں داخل نہیں ہوسکتے۔ ہم اپنے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ آج کا طالب علم سل پسند ہوگیا ہے اور اسکول کالج میں زیادہ حاضر رہنے کے بجائے ٹیوشن پڑھنے کے لئے جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ یہاں ان تمام باتوں کا

جواب یہ ہے کہ جناب والا کہ ہمارے بڑوں نے اپنے بزرگوں سے تو بہت اچھی طرح پڑھ لیا لیکن جب یہ خود بڑے بنے تو نوجوانوں کے لے صحیح تعلیمی نظام بھی نہ بنا سکے۔ جہاں تک بنے بنائے نوٹس کو ترجیح دینے کی بات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی سال ۱۲ مہینے کا ہونے کے بجائے صرف ۶ یا ۷ مہینے کا ہوتا ہے اس مختصر ترین عرصے میں یا تو طالب علم اپنے نوٹس بنالے یا اپنی کتاب کو پوری طرح پڑھ لے۔ ان باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ آج کے طالب علم کو اس راہ پر ڈالنے والے ہمارے بزرگ اور اساتذہ ہی ہیں جو کہ اپنی جماعت میں اپنے مضمون کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ وہ مضمون طالب علم کے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔

ان اساتذہ نے طالب علموں کے اور اپنے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ قائم کر رکھا ہے کہ طالب علم ان سے وہ چیز دوبارہ سمجھانے کو نہیں کہہ سکتا۔ تمام طالب علم صرف ان اساتذہ کے سمجھانے پر یس سر میں اپنی گردن ہلانا جانتے ہیں۔ یہ اساتذہ اپنا کورس اتنا آہستہ مکمل کراتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم ان کے آسرے پر بیٹھا رہے تو اس کا امتحان میں فیل ہوجانا یقینی ہے کیونکہ امتحانی پرچہ پوری کتاب سے بنتا ہے۔ یہ اساتذہ SELF STUDY پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ جناب والا! اگر طالب علم اتنے عالم و فاضل ہوجائیں کہ اپنے آپ ہی پڑھنے اور سمجھنے لگیں تو انہیں اسکول اور کالج جانے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہ رہے۔

جناب والا! یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ٹیوشن پڑھانے والے زیادہ تر اساتذہ خود بھی طالب علم ہوتے ہیں اور یونیورسٹیوں میں اپنی تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں اس لئے یہ طالب علموں کے مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور طالب علموں کو اچھا سمجھانے ساتھ ساتھ دوستانہ ماحول میں پڑھاتے ہیں۔

ٹیوشن سینٹر یا ٹیوشن کی رحمت کے حوالے سے آخر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ

لو جان بیچ کر بھی علم و ہنر ملے
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

جن ساتھیوں کے مضامین ہمیں موصول ہوئے

شہزاد خان کستوری، کراچی۔ سہیل ریاض اسلام آباد، رفعت شازیہ، کراچی۔ پرنس عرفان بن حسین، کراچی۔ حافظ سعدیہ رضوانہ، پشاور۔ سیدہ کاشفہ نقوی، کراچی۔ محمد ادریس داؤد، پشاور۔ محمد افضل ساگر مچھوی، مچھ۔ شبنم غفار، کراچی۔ عبدالمجید انجم، جھنگ شہر۔ یاسر آفاق، لاہور۔ محمد اکبر رشید، کمرو ٹرپکا۔ نصرت شمشاد، کراچی۔ عالم شفیع ہمدم، جھنگ۔ ضیاء الرحمان تنزخیل۔ سید بشارت حسین بخاری،

رحیم یار خان۔ طارق مصطفیٰ، پشاور۔ محمد نعیم جاوید، مظفر گڑھ۔ ارم نواز، لاہور۔ ندیم حیدر رضوی، کراچی۔ سید شہریار علی بخاری، رحیم یار خان۔ محبوب علی شاہین، سوئی۔ عاطف حسن صدیقی، کراچی۔ زاہدہ امین ناگوری، عمر کوٹ۔ احمد رضا سید، لاہور۔ صبا قادر، کراچی۔ انیلا ناز عمر، کراچی۔ محمد راشد ارشد حسین قریشی، کراچی۔ راحیل رفیق، کراچی۔ محمد ندیم انصاری، کراچی۔ شازیہ حسن، ملکہ ہانس۔ پلوشہ خان، عبدالحکیم۔ ملیحہ عبدالمتین، کراچی۔ سیدہ حریم جعفری، کراچی۔ محمد سلیم بخش، کراچی۔ صدف شفیق، حیدر آباد۔ عابد انور شاہد، کراچی۔ نعمان غوری، کراچی۔ حسیب احمد، کراچی۔ کاظم ذہین، کراچی۔ راجہ پرویز، گجرات۔ محمد نوید سعید، لاہور۔ ذیشان اظہر، رحیم یار خان۔ عمرانہ جبیں، کراچی۔ درثمین، کراچی۔ طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔ محمد اظہر اقبال کندی، میانوالی، برشامہ شبیر بیگ، لاہور۔ محمد عثمان، اٹک۔ سائرہ فاطمہ، کراچی۔ افشین علی (؟) زویا افضال، کراچی۔ ثمرین ناز، کراچی۔ نثار زاق، لاہور۔ نوشابہ اکرم، رحیم یار خان۔ فہد آفتاب، کراچی۔ فوزیہ کنول، اوکاڑہ۔ بینش سمر خان (؟)۔ محمد عمر عالم خان، کراچی۔ شازیہ صدیقی، کراچی۔ سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی۔ ندیم ظفر زیدی، کراچی۔ نثار احمد بلوچ، پنجگور۔ مدیحہ حسین، فیصل آباد۔ غلام نبی شال، مظفر آباد آزاد کشمیر۔ ریحان احمد خان، کراچی۔ طارق محمود، راولپنڈی۔ محمد کاشان خان یوسف زئی، کراچی۔ ایم رضوان محمود گھانچی، کراچی۔ محمد طاہر مجیب، اٹک۔ ثمرین قادر، کراچی۔ پروین عبدالرب، کراچی۔ حسیب الحسن، کھاریاں۔ فرحان احمد خان غوری، کراچی۔ عائشہ خان، لاہور۔ غلام فرید، گجرانوالہ۔ زین ذوالفقار، لاہور۔ فاطمہ سمیرا، کراچی۔ ناصر حفیظ، ملتان۔ محمد رحمت اللہ بشیر، گجرات۔ شہر بانو، تیمور، ثنا بینہ، شہریار، رحیم یار خان۔ محمد عثمان خان، پشاور۔ شگفتہ صدیقی، کراچی۔ ریاض راہی برڑو، ٹنڈو محمد خان۔ تم علی ذوالفقاوی، شکردرہ۔ عبدالقدیر انڈہڑ۔ شیر نواز گل۔ پشاور۔ ثانیہ صلاح الدین، حیدر آباد۔

کیا آپ ہمیں اسٹیکرز کا آرڈر دے چکے ہیں؟

اگر آپ نے ادارہ آنکھ مچولی کو دعاؤں کے اسٹیکرز کا سیٹ منگوانے کے لئے آرڈر نہیں دیا تو یہ کام پہلی فرصت میں کر لیجئے۔ کیونکہ اسٹیکرز کے نئے سیٹ چھپ کر آچکے ہیں۔ دیدہ زیب طباعت۔ وقت کی ضرورت۔

۱۲ اسٹیکرز کا ھدیہ..... صرف =/۳۶ روپے

منگوانے کا پتا:

سرکولیشن منیجر: ماہنامہ آنکھ مچولی I۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵۔ فون 4942857 4948210

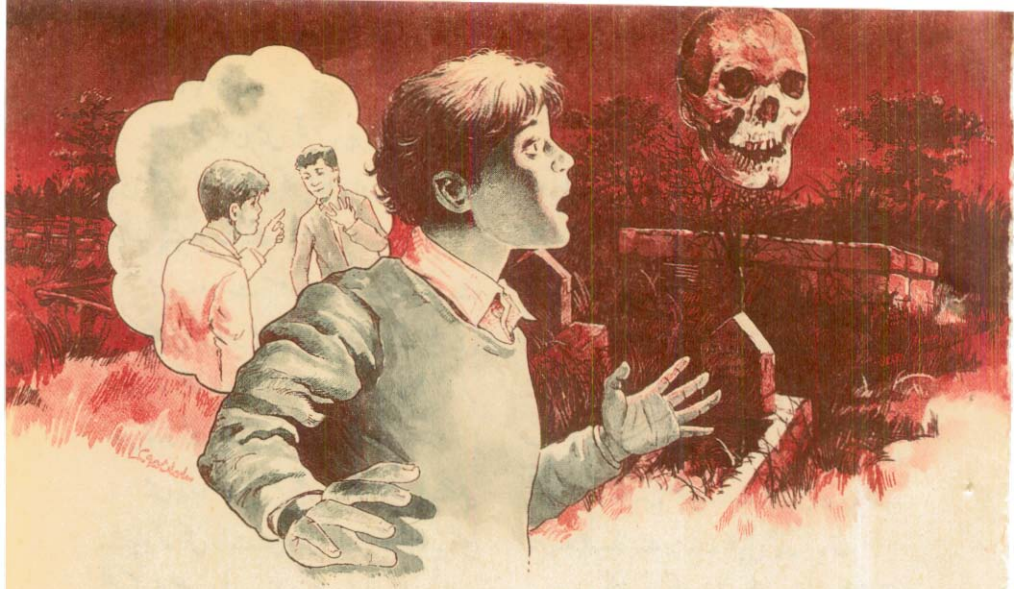

دادا، کنواں اور کھوپڑی

منصور احمد عکسی

سردیوں کی راتوں میں جب سب گھر والے انگیٹھی کے سامنے ہاتھ تاپنے بیٹھتے ہیں تو بچے بوڑھوں سے ان کی زندگی کا واقعہ سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

ایک دفعہ سردیوں کی رات کو ہم سب دادا جان کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور ان سے کوئی اچھا سا واقعہ سنانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ دادا نے ہمیں خاموش بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر یوں گویا ہوئے۔

"جب میری عمر کوئی چودہ پندرہ سال تھی اور اس وقت ہم یہاں سے دور ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں میرا ایک ہم عمر دوست بھی تھا جس کا نام مسعود تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے گاؤں سے دور ایک اجاڑ اور سنسان قبرستان تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں آسیب رہتے ہیں اس قبرستان

کا استعمال لوگوں نے چھوڑ دیا تھا اور دوسرا قبرستان بنالیا تھا۔

اس قبرستان میں قبریں ہر طرف ادھڑی پڑی تھیں اور انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔

میرے دوست مسعود نے ایک دفعہ مجھ سے شرط لگادی کہ اگر میں اس قبرستان کے بیچ میں موجود سوکھے کنویں کو رات کے وقت ہاتھ لگا کر آؤں تو وہ مجھے پچاس روپے دے گا۔

میں بدروحوں پر کم یقین رکھتا تھا اس لئے یہ طے پایا کہ کل رات میں وہاں جاؤں گا شرط یہ بھی تھی کہ لالٹین وغیرہ ساتھ نہیں لے جانا ہے اس رات اتفاق دیکھئے کہ آسمان پر کالے بادل چھاگئے اور تیز ہوا کے جھکڑ چلنے شروع ہوگئے۔

میں نے مسعود کی منت سماجت کی کہ میں وہاں کل رات جانا چاہتا ہوں مگر وہ نہ مانا۔ میں بھی موقع گنوانا نہ چاہتا تھا اس لئے قبرستان کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ قبرستان چونکہ گاؤں سے دور تھا اس لئے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بڑھ رہا تھا رات کی خاموشی میں دور کہیں گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

چند لمحوں بعد میں قبرستان کے سامنے تھا۔ قبرستان کے بڑے بڑے درخت ہوا میں جھول رہے تھے۔ ہوا کے گزرنے سے ان کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہورہی تھی۔

میں دل کو مضبوط کر کے قبرستان میں داخل ہوگیا اسی لمحے میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ اٹھ کر جب میں نے چیز کو غور سے دیکھا تو وہ انسانی کھوپڑی تھی۔ خوف سے میرے جسم میں سردی کی لہر سرایت کر گئی۔ لیکن میں اٹھ کر آگے بڑھنے لگا۔ قبروں کے گڑھے پانی سے بھرنے لگے تھے اور ہر طرف پھسلن ہورہی تھی اس لئے میں احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے چہرے سے برسات کا پانی ٹپک رہا تھا۔

اب مجھے کچھ کچھ خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ ہر طرف مردوں کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری پڑیں تھیں۔ میرا دم اس ماحول میں گھٹ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو میں نے واپس جانے کی ٹھانی لیکن پھر ہمت کر کے آگے بڑھنے لگا۔ میں جب اس قبرستان کے بیچ میں پہنچا تو کنواں سات آٹھ قدم مجھ سے دور تھا۔ میں اسے ہاتھ لگانے کے لئے آگے بڑھا لیکن مجھے اپنے جسم میں خوف کی سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور آنکھیں اندھیرے میں پھٹنے کے قریب تھیں۔ اسی لمحے اچانک میرے حلق سے روح فرسا چیخ بلند ہوئی اور تاریک ماحول میں سنسناتی چلی گئی اور میں پیچھے مڑ کر بدحواسی کے عالم میں واپس بھاگنے لگا۔

کیونکہ میں نے ایک انسانی کھوپڑی کو ہوا میں معلق دیکھا تھا جو ہوا کی وجہ سے اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ مجھے اپنا سانس گلے میں اٹکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اسی لمحے میرا پاؤں پھسلا اور میں ایک کھلی ہوئی قبر کے گڑھے میں جا گرا۔ گندے پانی میں میرا جسم انسانی ڈھانچے کے اوپر جا پڑا اور میں گھبرا کر باہر نکلا اور واپس کھڑکی کی طرف دوڑنے لگا۔

چند لمحوں بعد میں اپنے کمرے میں تھا۔ میرا جسم ابھی تک لرز رہا تھا۔ اس رات تو مجھے نیند ہی نہ آئی۔ اس واقعہ کی وجہ سے میں تین دن تک بخار میں مبتلا رہا۔

چند مہینوں بعد مجھے مسعود نے بتایا کہ یہ اس کی حرکت تھی۔ اس نے دن کو وہاں جا کر ایک لمبی اور کالے رنگ کی لکڑی کنویں کے قریب گاڑ دی اور ایک کھوپڑی اس لکڑی کے اوپری سرے پر رکھ دی۔ میری نظر اس کھوپڑی پر پڑی، وہ لکڑی مجھے نظر نہ آئی اور میں کھوپڑی کو ہوا میں معلق سمجھ بیٹھا۔

اب بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دل و دماغ کی اضافی قوت
کے لئے مُربّہ سیب چاندی کے
ورق میں لپیٹ کر کھائیے

احمد کا

مُربّہ سیب

انتہائی مقوی

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریروں کا کالم

"ہمت والے کبوتر" دانش جواہر، کندہ کوٹ۔ "آسمان نیلا کیوں ہے" "آنکھ مچولی" محمد عامر علی، کراچی۔ "حمد" "مہنگائی" "شرارت" "دوستی" احمر شریف نگار، اوکاڑہ "آخری لطیفہ" رابعہ زاہد، لاہور "روشن قدم" محمد فاروق انجم، فیصل آباد۔ "تم خوش قسمت ہو" تسکین سحر(؟) "بلاعنوان" رؤف ایاز، سرگودھا۔ "اپریل فول اور سرپرائز" عمیر الاسلام، کوہاٹ۔ "تم عظیم ہو" منیر احمد، ڈی آئی خان۔ "وطن پر قربان" محمد نعیم (؟) "رونی کی تلاش" فیصل اسلام، ساہیوال۔ "سوتیلی ماں" حفیظ اللہ طارق، کمالیہ۔ "عظیم بیٹا" محمد حیات، ضلع لودہراں۔ "کرکٹر میں بن جاؤں گا" شاہین برکات، کراچی۔ "ایک اسلامی واقعہ" (؟) "مستقبل کا سفر" عمار مطلوب، رحیم یار خان۔ "عید" فوزیہ بانو، کراچی۔ "پہچان" ساجد خان، کراچی۔ "کاش ایسا ہوتا" حمیرا ناز، گوجرانوالہ۔ "نیو ائیر روشن راہیں" فرزانہ صابر، صادق آباد۔ "نصیحت" اجمل خان کراچی۔ "جنازہ" مس کاظمی، راولپنڈی۔ "دوستی" عاصمہ عظیم، راولپنڈی۔ "رانگ نمبر کا کمال" محمد فیصل شیخ، فیصل آباد۔ عبدالرحمٰن گلبہار، پشاور۔ "رسول اللہ کے آنسو" شہر بانو بخاری، لاہور۔ "ہمیں تو شرارت اچھی لگتی ہے" (؟) "وعدہ" عمران خان، حیدر آباد۔ "دوست" عثمان ارشد، اسلام آباد۔ "شرارت کا نتیجہ" عائشہ ارشد، اسلام آباد۔ "بے نام کہانی" اظہر شبیر، اسلام آباد۔ "گدھا آخر گدھا ہے۔" "سردی کا موسم" یاسمین اختر، گاؤں ڈنڈوت۔ "عقلمند خلیفہ" فہد آفتاب، کراچی۔ "دنیا" روبینہ انور، لاہور کینٹ۔ "دہشت گرد" عبدالولی، کراچی۔ "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" قیصر حمید نجم، جھنگ صدر۔ "نواب بہادر یار جنگ" میاں محمد کاشف سعید، کراچی۔ "ایک سارس اور لومڑ" عدیل ستار، کراچی۔ "دو گھر کے بکھیڑے" ایک قصہ ایک کہانی "عرفان محمد حسین، کراچی۔ "چوری پکڑی گئی" امجد اسلام، ایبٹ آباد۔ "مجاہد مشرق" عطاء اللہ بھٹو گھونکی۔ "عمرو عیار اور سات باغ" (؟) "جسے اللہ رکھے" (؟) "صبح کا بھولا" نشاط رینہ، ملتان۔ "محبت" منور حسین، گجرات۔ "حضرت ایوب کا صبر و شکر" غزالہ سلیم (؟) "الہ دین کا چراغ" مصطفیٰ عباسی، کراچی۔ "اچھی باتیں" صائمہ بتول (؟) "ناقابل فراموش سالگرہ" اویس یوسف زئی، اٹک۔ "برائی کا انجام" قاسم بن نظر، کراچی۔ "غلطی" شانی خان، کراچی۔ "زمین جنبد نہ جنبد" ارشاد احمد بھٹی، میرہزار، مظفر گڑھ۔ "خاص نمبر" (نظم) محصنہ خلیل، میرپور (آزاد کشمیر) "وعدہ" عامر اسلم (؟) "سبق" شبانہ رشید، کراچی۔ "محبت کے سائے" عبدالحمید نیازی، میانوالی۔ "شرارت مہنگی پڑی" (؟) "نہلے پہ دہلا" عبدالمجید انجم، جھنگ شہر۔ "گوشت خور پودے" (؟) "کہا نہیں تھا" (؟) "سفید چاند" نسرین نسیم سحر، جھنگ شہر۔ "علم ریاضی میں مسلمانوں کی خدمات" محمد طاہر، اٹک۔ "یہ کیا ہو رہا ہے" ذکیہ زیدی، راولپنڈی۔

انعامی لطیفہ

ایک بوڑھی عورت نیند نہ آنے کے مرض میں گرفتار تھی۔ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر وہ ایک ہپناٹیزم کے ماہر کے پاس گئیں۔ وہ بے چارہ بھی انہیں بٹھا کر بہت دیر تک "آپ سو رہی ہیں، آپ کو نیند آ رہی ہے۔" وغیرہ کہتا رہا مگر بات نہیں بنی۔ بالآخر اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں خاتون میں آپ کو سلانے میں ناکام رہا۔" اس بات پر بوڑھی عورت نے کہا "خیر تم بالکل ناکام بھی نہیں ہوئے۔ کم از کم میری ٹانگیں سو گئی ہیں۔"

مرسلہ: محمد حسن عارف خان، کراچی

گاہک (دکاندار سے) "وہ پین کتنے کا ہے۔"

دکاندار "ایک پین پانچ روپے کا دو پین نو روپے کے"

"یہ لو پانچ روپے اور ایک پین دے دو۔"

"یہ لو ۴ روپے!" پیچھے سے آواز آئی۔ "دوسرا پین مجھے دے دو۔"

مرسلہ: جنید اختر، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک کنجوس شخص نے ایک ٹوپی بیس سال پہلے خریدی تھی جو وہ ہر وقت پہنے رکھتا تھا وہ

انتہائی میلی ہو چکی تھی اس کے دوست ہر وقت کہتے تھے کہ

"بھئی بیس سال پہن لی ہے اب نئی خرید لو۔"

کنجوس آدمی نے کچھ دن سوچا اور پھر اسی دکان پر گیا جہاں سے بیس سال پہلے ٹوپی خریدی تھی۔ کہنے لگا "لو بھئی میں آج پھر نئی ٹوپی خریدنے آگیا ہوں۔"

مرسلہ : فخرالدین ظفر، کنری پاک

☆ --- ☆ --- ☆

اکرم (ارشد سے) یار میرا جوتا بہت کاٹتا ہے۔

راشد : کتے کی کھال کا بنا ہو گا۔

مرسلہ : شاہد الرحمان خٹک، جامشورو

☆ --- ☆ --- ☆

اشتہاری مجرم شیدے نے ایک دیہاتی کسان کے دروازے پر دستک دی۔ کسان باہر نکلا تو شیدے نے کہا : "میرے پاس چار سو روپے کا نوٹ ہے کیا تم مجھے اس کا کھلا دے سکتے ہو؟"

کسان بولا : "میرے پاس تین سو روپے ہیں۔ مجھ سے وہ لے کر چار سو روپے کا نوٹ دے دو۔"

شیدے نے یہ سوچ کر کہ نقلی چار سو روپے کے نوٹ سے اصلی تین سو روپے بہتر ہیں، کسان کو پیسے لانے کے لئے کہا۔ کسان تین منٹ بعد آیا اور بولا : "یہ لو"۔ شیدے نے اپنے ہاتھ میں ان دو نوٹوں کو دیکھا جو کسان نے اسے دیئے تھے تو پتہ چلا کہ وہ دونوں نوٹ ایک سو پچاس پچاس روپے کے نوٹ تھے!

مرسلہ : عمر سلمان، اٹک

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا "امی! ابو کتنے بوڑھے معلوم ہوتے ہیں بالکل دادا کی طرح اور آپ کتنی خوبصورت ہیں بالکل سمارٹ اور نوجوان۔" ماں نے خوش ہو کر پرس میں ہاتھ ڈالا اور پانچ کا نوٹ نکال کر بیٹے کو دیا۔ بچے نے منہ بناتے ہوئے کہا : "لیکن ابو نے تو دس روپے دیئے تھے۔"

مرسلہ : شفیق الاسلام، مینگورہ

☆ --- ☆ --- ☆

ایک وکیل نے اپنے بچے کو جھوٹ بولنے کے جرم میں سزا دی۔ بچہ دیر تک روتا رہا۔ جب رو چکا تو اس نے باپ سے پوچھا۔ "ابا جان! یہ تو بتائیے کہ جھوٹ بولنے پر مجھے کب تک سزا ملا کرے گی اور کس دن اس قابل ہوں گا کہ آپ کی طرح جھوٹ بولنے پر مجھے پیسے ملیں۔"

مرسلہ : رخشندہ چوہدری، لاہور

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بچہ اپنے دوست سے : بتاؤ گیارہویں جماعت کو فرسٹ ایئر کیوں کہتے ہیں؟

دوسرا بچہ : کیونکہ وہ جوانی کا پہلا سال ہوتا ہے۔

پہلا بچہ : اور اگر گیارہویں کے تمام طالب علم

پچاس سال کے ہوں تو؟

دوسرا بچہ: تب بھی اسے فرسٹ ایئر ہی کہیں گے۔

پہلا بچہ: (حیرت سے) وہ کیوں؟

دوسرا بچہ: کیوں کہ وہ بڑھاپے کا پہلا سال جو ہوگا۔

مرسلہ : صائمہ اشرف، فتح جنگ

☆ --- ☆ --- ☆

ایک پاکستانی چین گیا۔ باتوں باتوں میں اس نے اپنے دوست کو بتایا کہ اسے خرگوش کا گوشت بہت پسند ہے۔ چینی نے خرگوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پوچھنے پر پاکستانی نے بتایا کہ خرگوش ایک چھوٹا سا اور بہت پیارا سا جانور ہے اور اس کے لمبے لمبے کان ہوتے ہیں۔ یہ نشانیاں سن کر چینی نے پاکستانی کو بتایا کہ اس کے گھر میں بہت سے خرگوش ہیں۔اس نے پاکستانی کو کھانے پر بلایا۔ وقت مقررہ پر پاکستانی چینی کے گھر پہنچا اور دونوں نے خوب سیر ہو کر خرگوش کا گوشت کھایا۔ کھانے کے بعد چینی نے بتایا کہ وہ ان خرگوشوں سے بہت تنگ تھا اور ان کے شور کے باعث سو بھی نہیں سکتا تھا۔ پاکستانی نے حیرت سے کہا "مسٹر تن سو، خرگوش تو بالکل بھی آواز نہیں نکالتا۔" مسٹر تن سو نے تردید کرتے ہوئے کہا "ارے نہیں مسٹر جبران! یہ خرگوش تو ہر وقت "میاؤں میاؤں" کی آواز نکالتے رہتے تھے۔"

مرسلہ : دانیال یوسف، گجرات

☆ --- ☆ --- ☆

ایک بادشاہ نے کسی شاعر کو ایک مریل سا گھوڑا انعام میں دیا۔ گھوڑا اسی رات اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دوسرے دن شاعر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا : "گھوڑا کیسا ہے؟" شاعر نے کہا : ؟جناب! گھوڑا اتنا تیز رفتار تھا کہ ایک ہی رات میں اس جہان سے اس جہان پہنچ گیا۔"

مرسلہ : سید وقار عظیم، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک دن ملا نصرالدین نے ایک دعوت میں گئے۔ کھانا کھا کر اپنی جیب سے رومال نکال کر پلیٹ اور چمچہ صاف کرنے لگے۔ ایک آدمی نے ملا جی سے کہا "یہ آپ کیوں صاف کر رہے ہیں یہ تو ملازم لوگ خود صاف کر لیں گے۔"

ملا جی بولے : "پاگل میری جیب خراب ہو جائے گی اس لئے صاف کر رہا ہوں۔"

مرسلہ : فوزیہ علوی، پٹارو

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب نے ڈائیونگ بورڈ سے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگائی، پھر کراہتے ہوئے باہر نکلے اور بڑبڑانے لگے "کاش جمعہ آج ہوتا

.....کاش جمعہ آج ہوتا....." یہ کہتے ہوئے دوبارہ بورڈ کی طرف سے چڑھے دوبارہ چھلانگ لگائی۔ پہلے سے زیادہ کراہتے ہوئے نکلے۔ کاش آج جمعہ ہوتا.....کاش آج جمعہ ہوتا۔

کچھ دور کھڑے ایک صاحب نے جب تیسری مرتبہ انہیں یہ کرتے دیکھا اور وہی الفاظ دہراتے ہوئے سنا تو پوچھا "اگر جمعہ ہوتا تو کیا ہوتا؟"

"جمعے کے جمعے سوئمنگ پول پانی سے بھر جاتا ہے۔" انہوں نے ٹانگیں سہلاتے ہوئے کہا۔

مرسلہ : غوثیہ ادریس، کراچی

☆ --- ☆ --- ☆

ایک صاحب دوستوں کی محفل میں اپنے خاندان کو دنیا کا قدیم ترین خاندان ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ہمارا خاندان دنیا کا قدیم ترین خاندان ہے اس خاندان کی تاریخ پانچ جلدوں میں محفوظ ہے۔ تم ہمارے خاندان کی قدامت کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہو کہ ہماری خاندانی تاریخ کی تیسری جلد میں ایک جگہ لکھا ہے :

"اور یہ وہ وقت تھا جب دنیا معرض وجود میں آئی۔"

انہوں نے بہت اعتماد کے ساتھ کہا۔

مرسلہ : سمیرا مگسی، کوئٹہ

☆ --- ☆ --- ☆

مارک ٹوین چیزیں مستعار (ادھار) لے کر واپس نہ کرنے میں بدنام تھا۔ ایک دن اس نے اپنے پڑوسی سے کوئی کتاب مانگی تو اس نے کہا "ضرور لے لو لیکن میں نے اصول بنایا ہے کہ میری کتاب صرف میرے گھر کے احاطے میں بیٹھ کر پڑھی جائے۔" چند دنوں بعد ہی پڑوسی مارک ٹوئین سے گھاس کاٹنے کی مشین مانگنے آیا اس نے جواب دیا "بصد شوق لو، لیکن میرا اصول ہے کہ وہ صرف میرے گھر کے احاطے میں استعمال کی جائے گی۔"

مرسلہ : طارق علی یوسفی، حیدر آباد

☆ --- ☆ --- ☆

ایک وکیل صاحب اپنے پہلے مقدمہ میں کامیابی حاصل کر کے گھر لوٹتے وقت اس یادگار دن کی نشانی کے لئے اپنی ایک فوٹو بھی کھنچوا کر لائے اور گھر آکر اپنی بیوی سے اپنی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے تصویر دکھا کر کہا "کیسا پوز ہے؟" (تصویر میں وکیل صاحب بہت ہی اسٹائل سے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے) بیگم نے کہا "ٹھیک ہے لیکن آپ کے پیشہ کی مناسبت سے نہیں ہے کیونکہ آپ کے ہاتھ کو تو دوسروں کی جیب میں ہونا چاہئے۔"

مرسلہ : آمنہ لطیف، لاہور

☆ --- ☆ --- ☆

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

ذلیخان سولنگی، گڈو سندھ۔ اکتوبر کے آنکھ مچولی کا سرورق دیکھتے ہی بے اختیار منہ سے نکلا "آفت قیامت" پلیز! آپ آنکھ مچولی کے صفحے بڑھادیں کیونکہ آپ نے قیمت بڑھادی ہے۔ **شیروز عظیم، سکھر** رسالہ ملتے ہی جلدی سے کھولا کہ شاید میری تحریر چھپ گئی ہو لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ صرف پرانے لکھنے والوں کو اپنے رسالے میں موقع دیتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ ○ بھئی یہ پرانے لکھنے والے بھی کبھی نئے رہے ہوں گے۔ فرق یہ ہے کہ پرانے لکھنے والے ہمت جلدی نہیں ہارتے تھے۔ **منصور علی پٹھان، جیکب آباد۔** میں نے کتنے پیار سے آپ کو خط لکھا تھا مگر آپ نے شائع نہیں کیا۔ کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ ○ بھلا آپ جیسے پیار کرنے والوں سے کون ناراض ہو سکتا ہے؟ **شاہد الرحمٰن چوہدری، سرگودھا۔** میں آپ کو چند اقوال زریں اور معلومات بھیج رہا ہوں۔ کیا یہ خوفناک نمبر میں چھپ جائیں گی؟ ○ دیکھئے آپ کا خط تو چھپ ہی گیا۔ **حسینی عباس، جھنگ** کراچی کے پس منظر میں ایک مکالمہ "انسان انسان کو کھا رہا ہے" بھیج رہا ہوں۔ ○ مکالمہ اچھا ہے، شائع ہو جائے گا۔ (نامعلوم) **رشید پور** آپ کی تصویر دیکھ کر بچے ڈر

جاتے ہیں۔ خوف ناک نمبر کو مزید خوفناک بنانے کے لئے اپنی تصویر شائع کردیں۔ ○ آپ تو پہلے ہی ڈر گئے کہ مارے ڈر کے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ **سید جمال حیدر، گوجرانوالہ**! اخبار میں آپ کے علاقے پی آئی بی کالونی کے بارے میں پڑھ کر شدید تشویش ہوئی۔ خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں اور پورے کراچی کو اپنی امان میں رکھے۔ ○ آمین! **ساجد نور، پسنی** بھائی صاحب۔ آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کا دل کیوں دکھاتے رہتے ہیں۔ ویسے آپ کو معلوم ہے دل چیز ہے کیا؟ ○ ۔ دل تو بڑی قیمتی چیز ہے۔ اللہ نہ کرے کہ ہم کبھی کسی کا دل دکھائیں۔ **طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ** آنکھ مچولی میں میرے لطیفے کو انعامی قرار دیا گیا لیکن شمارہ نہ ستمبر کا ملا اور نہ اکتوبر کا۔ ○ ذرا سی دیر ہوگئی معذرت **نوید الحسن تابش، سانگلہ ہل** آنکھ مچولی کے تازہ شمارے کا ہم بڑی بے تابی نگاہی سے انتظار کرتے ہیں لیکن تازہ شمارہ آٹھ یا دس تاریخ سے پہلے نہیں ملتا۔ ○ ۔ اسی شکایت کا جواب دیا جا چکا ہے۔ **محمد عدیل دانش، لانڈھی کراچی** یہ میرا نواں خط ہے۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے 'بہت محنت سے اسے خوفناک نمبر میں چھاپ دیجئے۔ ○ بھئی آپ کی نظم تو مزے کی ہے لیکن آپ کی امی برا مان جائیں گی کیونکہ آپ نے لکھا ہے کہ آپ جب گنجے تھے تو امی سر پر تیل لگاتی تھیں اور یہ کہ وہ رات کے نو بجے ہی ڈانٹ کر سونے کے لئے کہا کرتی تھیں۔ نظم میں ایسی باتیں کب لکھتے ہیں۔ **نوید الحسن تابش، محمد احمد رضا چشتی، سانگلہ ہل** افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے یہ رسالہ بڑی مشکل سے اور بہت دیر بعد ملتا ہے۔ ○ آپ اتنی دور بھی تو رہتے ہیں۔ ویسے رسالے کی اشاعت میں کچھ تاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ **ایم ندیم اقبال، منڈی بہاء الدین** اس مرتبہ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ ہر کہانی بہترین تھی۔ قلمی دوستی کا کالم شروع کیجئے۔ "ماہ رواں کی پہلی بات" سے آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ **فخر الدین ظفر، کنری** پھر بڑی ناامیدی سے لطیفہ بھیج رہا ہوں اور آپ یہ کہہ کر چھپ کرادیں گے کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ ○ اتنی ناامیدی سے آپ لطیفے بھیج رہے ہیں۔ یہ تو خود ایک لطیفہ ہے۔ **رانا محمد نعمان لطیف، اوکاڑہ**۔ خوفناک نمبر' کی طرح آپ کو آزادی اور عید میلاد النبیؐ کے موقع پر بھی خاص نمبر شائع کرنا چاہئے تھا۔ **زبیدہ ضمیر، جام پور**۔ اکتوبر کا شمارہ اور خاص طور پر سرورق بہت پسند آیا۔ **غوثیہ ادریس، کراچی**۔ میں آنکھ مچولی کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس کا طریقہ بتا دیجئے۔ ○ سالانہ خریداری کا اشتہار پڑھ لیجئے۔ **شمیلہ خان، کراچی** انکل! میری نظم "قلفی والا آیا" اور "سیفٹی الارم" قابل اشاعت ہے یا نہیں، ضرور جواب دیجئے۔ ○ شاعری کرنے کے لئے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ٹھیک ہے نا! **محمد وسیم عالم، مقبول شہید آباد** آنکھ مچولی کا مطالعہ تو میں کافی عرصے سے کر رہا ہوں مگر شامل پہلی بار ہو رہا ہوں۔ امید ہے میری نظم کو خوفناک نمبر میں جگہ دیں گے۔ ○ بھئی نظم

سے تو بالکل ڈر نہیں لگا۔ کوئی اور تحریر بھیجئے۔ **اکمل شاکر، پسنی مکران** میں خوفناک نمبر، کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ آنکھ مچولی کے گزشتہ خوفناک نمبر خوف سے بالکل خالی نہ تھے۔ یہ نمبر یقیناً" پہلے سے بھی اچھا ثابت ہوگا۔

○ یقیناً" شمارہ دیکھ کر آپ نے تڑپنا بند کردیا ہوگا۔ خدا کرے یہ شمارہ آپ کو پسند آئے۔ **آصف محمود، عقیل، بورے والا** برائے مہربانی ہمیں اپنے دفتر کا ایک عدد لیٹر پیڈ ارسال کردیں تاکہ آئندہ زندگی کے لئے آپ سے تعلق رکھ سکیں۔ ○ بھئی تعلق رکھنے کے لئے آپ نے بڑی مشکل شرط رکھ دی ہے۔ دفتر کا لیٹر پیڈ دفتر کے استعمال کے لئے ہوتا ہے، کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔ **دلیپ کمار شاد، بیلہ بلوچستان** آپ آنکھ مچولی میں ہر ماہ باقاعدگی سے کھیل کے متعلق کچھ شائع کریں کیونکہ بہت سے قارئین کھیلوں کے بہت شوقین ہیں۔ ○ ہاں بھئی کھلنڈرے قارئین کے لئے کچھ نہ کھیل سے متعلق چھپتا ہی رہتا ہے۔ **راحت صلاح الدین** مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک کوئی اچھی کہانی نہیں لکھ پائی ہوں۔ ویسے یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ آپ میری ہر اچھی بری تحریر برداشت کرجاتے ہیں۔ ○ راحت بہن! آپ نے کافی انکسار سے کام لیا ہے۔ آپ تو بہت اچھا لکھتی ہیں۔ **محمد ہشام، راولپنڈی کینٹ** آپ کا ماہنامہ "اندھیری سرنگ میں روشنی کی ایک کرن" کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دسمبر کا شمارہ آپ "ساتھ مشرقی پاکستان" پر نکالیے۔ "مقتول بچے" نمبر اگلے سال کے اوائل میں جاری کیا جائے تو بہت بہتر رہے گا۔ **جواد شفیق شیخ، فیصل آباد** پچھلے سال نومبر میں محمد عقیل صابر کی کہانی "پہلی کمائی" شائع ہوئی تھی۔ ابھی چند روز پہلے ایک پرانے ڈائجسٹ میں وہی کہانی میں نے پڑھی۔ آپ خود فیصلہ کریں کہ محمد عقیل صابر صاحب کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایک چھپی ہوئی کہانی اپنے نام سے بھیجیں۔ ○ محمد عقیل صابر سے ادارہ اس سلسلے میں بازپرس کرچکا ہے اور آئندہ کے لئے ان کی تحریر پر پابندی لگادی گئی ہے۔ ویسے غالباً" وہ خود بھی لکھنا چھوڑ چکے ہیں۔ ..... **سعیدہ طاہرہ، قبولہ شریف۔** آنکھ مچولی کے خاص نمبر میں "جمائی" کے موضوع پر بتایا گیا ہے کہ جمائی لینے سے جسم اور ذہن چاق و چوبند اور تندرست ہوجاتا ہے حالاں کہ ایسا نہیں۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے: "جہاں تک جمائی کا تعلق ہے یہ شیطان کی جانب سے ہے۔" حضرت زید بن اصمؓ کی روایت ہے کہ "حضورؐ نے کبھی جمائی نہیں لی۔" جمائی آنے سے تو جسم کا خود کار نظام ڈھیلا پڑجاتا ہے اور انسان بوجھ اور گرانی محسوس کرتا ہے۔ **عمران شمس الدین، ٹنڈو آدم۔** میں نے آپ کو تین چار خطوط تحریر کئے لیکن آپ نے ہمیشہ ردی کی ٹوکری کی نذر کئے۔ آخری دفعہ کچھ اقوال بھیج رہا ہوں۔ ○ ..... اچھے بھائی! چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کی تحریر آنکھ مچولی کے معیار کے مطابق ہوئی تو ضرور جگہ پائے گی۔ **راجہ پرویز، گجرات۔** میں زیادہ تر اسلامی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں، آنکھ مچولی پڑھنے کا اتفاق ہوا بہت ہی اچھا لگا۔ آپ میرا خط چھاپیں گے ناں؟

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 2577392 - 95 (4 Lines)

جہاں چلے، رواں چلے

اس رات کا قصہ

شہناز بانو

"میں کہاں ہوں؟"

میں نے ہوش میں آکر اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

سامنے نگاہ پڑی تو ایک بے حد شفیق سے باریش بزرگ کو بیٹھے ہوئے پایا۔ "گھبراؤ مت بیٹا، تم ایک محفوظ جگہ پر ہو۔ میں ایک حکیم ہوں اور تم میرے مطب پر ہو۔" انہوں نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میں یہاں تک کیسے آیا؟" میں نے ان سے پوچھا اور اٹھنے کی کوشش کی، مگر کمر اور بازوؤں میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور میں وہیں لیٹ گیا۔

بیٹا میں روزانہ جنگل میں جڑی بوٹیاں ڈھونڈنے جاتا ہوں، مجھے مریضوں کی دوائیں بنانے کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔ رات بڑی شدید بارش تھی اور جس بوٹی کی تلاش میں گیا تھا

وہ بارش کے بعد ملتی ہے' میں اسے تلاش کرتے کرتے جنگل میں کافی اندر تک چلا گیا تھا۔ جب میری نگاہ تمہارے اوپر پڑی تو میں ٹھٹھک گیا' تم بری طرح زخمی تھے اور تمہارے زخموں سے خون بہہ کر جم گیا تھا' میں سمجھا کہ کوئی کسی کو مار کر یہاں اس کی لاش پھینک گیا ہے' قریب جاکر دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو زندہ ہے۔ سو میں تمہیں یہاں اٹھا لایا۔ میں نے تمہارے زخموں پر دوا لگادی ہے۔ انشاء اللہ تمہارے زخم جلد ہی بھر جائیں گے۔ اچھا اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کس طرح اتنے زخمی ہوگئے؟" انہوں نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد مجھ سے دریافت کیا۔

"پہلے آپ یہ بتایئے کہ "سلطان پور" یہاں سے کتنی دور ہے۔ میرے چچا وہاں کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں بلکہ وہیں جارہا تھا۔" میں نے انہیں ابھی کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔

"سلطان پور ساتھ ہی کا گاؤں ہے۔ میں وہاں کسی کو بھیج کر تمہارے زخمی ہونے کی اطلاع کروادیتا ہوں۔ ہاں البتہ تم شام تک ضرور آرام کرو۔" انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور پھر میں اپنے اوپر گزرنے والے بھیانک واقعات کے بارے میں سوچنے لگا' جن کا خیال آتے ہی خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

چند گھنٹے بعد میرے چچا وغیرہ آگئے اور مجھے اپنے ساتھ سلطان پور لے گئے' دادی جان تو مجھے دیکھ کر بے حد پریشان ہوگئیں۔

رات سب میرے گرد جمع ہوگئے۔ سب لوگ میرے زخموں کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ میں نے ان لوگوں کے اصرار پر بتایا' "میں ہر بات سچ سچ بتاؤں گا اور یقین کرنا نہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بتانا شروع کیا۔

"بات یہ تھی' چھوٹے چاچو جب آپ کا فون آیا کہ دادی جان بیمار ہیں اور مجھے بہت یاد کررہی ہیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ ابھی اور اسی وقت جاؤں گا۔

میں امی جان سے ضد کر کے اور اجازت لے کر روانہ ہوا' رات کو سردی بھی بہت تھی اور موسم کے آثار اچھے نہیں تھے' امی جان نے مجھے تنبیہہ بھی کی تھی مگر میں نہ مانا' اور شام کے وقت روانہ ہوگیا۔

یہ تو آپ کو پتا ہے کہ آپ کے گھر کا شارٹ کٹ راستہ گھنے جنگل میں سے ہو کر گزرتا ہے' جلدی پہنچنے کے لئے میں نے سیدھی سادھی سڑک کو چھوڑ کر جنگل والا راستہ اختیار کیا۔ جنگل میں ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی جس پر ایک موٹر سائیکل باآسانی گزر سکتی تھی۔ برف کی سی

ٹھنڈک تھی۔ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے برف ہڈیوں میں اتر رہی ہو۔میں نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے موٹر بائیک پر جمائے ہوئے تھے۔ میری موٹر بائیک کی اسپیڈ اتنی تھی جیسے ہوا سے باتیں کر رہی ہو۔

"بادل بہت گہرے ہو رہے ہیں۔لگتا ہے بہت زور کی بارش آئے گی"میں یہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ میری بائیک کی رفتار سست پڑ گئی اور پھر گھر گھر کی آواز کے ساتھ ہی بند بھی ہو گئی۔ میں پریشان ہو گیا کہ یہ کیا ہوا۔ گاڑی کو خوب اچھی طرح دیکھا بھالا مگر خرابی سمجھ میں نہیں آئی۔

میں شدید سردی اور خطرناک بادلوں سے ویسے بھی پریشان ہو رہا تھا کہ یکایک ایک خوفناک آواز کے ساتھ بادل گرج اٹھے، بجلی چمکنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

یا اللہ یہ کیا مصیبت ہو گئی، دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا میں شدید بارش سے بچنے کے لئے ایک درخت کی پناہ میں چلا گیا۔ مگر اس شدید بارش سے وہ درخت بھی مجھے پناہ دینے میں ناکام رہا اور اس شدید سردی میں میں بُری طرح بارش سے بھیگ چکا تھا۔

تیز اور برفانی ہواؤں کے چلنے سے بارش سے بھیگی درختوں کی ٹہنیاں ہلتیں تو اس میں سے ایسی آوازیں آتیں جیسے بہت ساری بد روحیں نوحہ کر رہی ہوں۔ میں سردی اور خوف سے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"یا اللہ میری مدد فرما، میں کیا کروں"۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے امی جان منع کر رہی تھیں کہ موسم کے آثار اچھے نہیں ہیں، آج مت جاؤ، مگر چونکہ میں نے ان کا کہنا نہ مانا لہٰذا مجھے اس کی سزا ملی ہے۔یا اللہ اب میں کبھی بھی اپنی امی کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ میں پریشان اور نادم کھڑا ہوا اللہ سے توبہ کر رہا تھا کہ اچانک تھوڑے سے فاصلے پر مجھے روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔

ایک اچھے خیال کے تحت میری آنکھوں میں چمک آگئی اور میں اپنی پریشانی بھول گیا۔

شاید یہ کسی کا گھر ہے یا کسی فقیر کی کٹیا ہو گی۔ کچھ بھی ہو، مجھے تو رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ تو ملے گا۔یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں تیز تیز قدموں سے اس روشنی کی جانب بڑھا۔

قریب گیا تو پتہ چلا کہ وہ تو کوئی بہت پرانی حویلی ہے بلکہ اسے تو حویلی کا کھنڈر کہنا مناسب ہو گا۔

روشنی نظر آنے کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی ذی روح موجود ہے۔میں نے خوش ہو کر سوچا اور اس ہیبت ناک ویران حویلی کے آہنی دیو ہیکل دروازے پر دستک دے ڈالی۔

میری پہلی دستک پر کوئی نہیں آیا تو میں نے

بے چین ہو کر زور زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کردیا۔

کوئی ہے! ارے کوئی ہے! مہربانی کر کے دروازہ کھولئے، دیکھیں میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ یہاں بہت بارش اور سردی ہے، مہربانی کریں، میں بے چین ہو کر چیخ اٹھا۔

یکایک کسی کے زور زور سے قدم اٹھانے کی آواز سنائی دی اور ایک خوفناک چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی الفاظ میرے منہ میں ہی رہ گئے۔ سامنے دروازے پر سفید لباس میں ایک انتہائی دراز قامت عورت کھڑی تھی، جس کے سرخ ہونٹ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کہ خون لگا ہو۔ اس کے سیاہ بال گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ وہ ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑی تھی۔ چند لمحے اسی طرح گزرے، پھر اس خاموشی کو اس کی مکروہ آواز نے توڑا۔

"کون ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو۔" اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بڑی سختی سے میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں .....وہ میں ..... مسافر ہوں، یہاں سے گزر رہا تھا تو میری بائیک خراب ہوگئی۔ باہر بہت سردی، ہوا اور بارش ہے۔ میں یہاں صبح تک کے لئے پناہ چاہتا ہوں۔"

"کون آیا ہے؟"

اس عورت کے پیچھے قدموں کی آواز کے ساتھ ایک عجیب کھڑکھڑاتی ہوئی آواز ابھری مجھے ایسا لگا جیسے ایک گھڑے میں بہت سارے پتھر ڈال کر ہلا ڈالے ہوں۔

اس مرد کی شکل بھی عورت کی طرح عجیب سی تھی، اس نے بھی سفید لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ عجیب سا بے نور کالا سیاہ چہرہ تھا، اور سب سے عجیب اس آنکھیں تھیں۔ آنکھوں کی جگہ لگ رہا تھا جیسے دو انگارے دہک رہے ہیں۔

"دیکھو "بلرام" ہمارے گھر میں مہمان آیا ہے، آج تو ہم اس کی دعوت کریں گے۔" وہ عورت اس خوفناک مرد کو دیکھ کر مسکرائی تو اس کے ہونٹوں کے کناروں سے دو نوکیلے دانت باہر آگئے۔ اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دہشت کی ایک لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اف خدایا کس قدر مکروہ شکل ہے ان دونوں کی، میں نے سوچا شاید وہ لوگ ہندو تھے، اس لئے کہ اس عورت نے مرد کو "بلرام" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"آؤ آؤ اندر آجاؤ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ صورت حال ایسی ہوگئی تھی کہ میرے پاس اس پر اسرار حویلی میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مرتا کیا نہ

کرتا، سہمے سہمے انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

"آج بہت عرصہ کے بعد ہمارے ہاں مہمان آیا ہے، آج تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہے ناں بلرام، ہی .....ہی.....ہی۔" وہ عجیب انداز میں سر ہلا ہلا کر ہنس رہی تھی۔

"آؤ اس پر بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی اور مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ "اس پر.....!!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں تو اور کس پر؟" وہ پھر عجیب انداز میں ہنس پڑی۔

اس کمرے کی فضا میں عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا پراسرار ماحول تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بڑے عرصے کے بعد اس کمرے کو کھولا گیا ہو، بڑی گھٹن اور سیلن کا احساس ہو رہا تھا۔

میں اس کرسی کے ایک کونے پر ذرا سا ٹک گیا اس لئے کہ اگر پوری طرح بیٹھتا تو احتجاجاً وہ کرسی زمین بوس ہو جاتی۔ میں نے یونہی گردن کو گھما کر اس کمرے کا چاروں طرف کا جائزہ لیا۔

سامنے دیوار پر ایک پرانا فریم آویزاں تھا۔ جس پر جمی دبیز مٹی کی تہہ نے اس میں موجود تصویر کو چھپا دیا تھا۔

دوسری طرف دیوار پر ایک شیر کی کھال تھی یا پتہ نہیں کیا تھا، اس نے منہ میں ایک لڑکی کو دبایا ہوا تھا اور وہ بری طرح چیخ رہی تھی اور شیر کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر ایک جھرجھری لی۔

سامنے میز پر ایک پیالہ رکھا ہوا تھا اور اس میں ایک کالے رنگ کا سیال مادہ بھرا ہوا تھا اور سخت ناگوار بو آ رہی تھی۔

سامنے ایک پرانے صوفے پر وہ بھیانک آدمی براجمان تھا جوں ہی میری نگاہ اس پر پڑی وہ مجھے دیکھ کر بڑے بے ڈھنگے انداز میں مسکرایا۔ جس سے اس کا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا۔ اس کے ذرا فاصلہ پر وہ عورت بیٹھی مجھے گھور گھور کر دیکھ کر رہی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے باہر سے بھی زیادہ سردی اندر ہے۔ "میں یہ کپڑے بدلنا چاہتا ہوں مہربانی کر کے مجھے کوئی دوسرے کپڑے عنایت فرما دیجئے۔" میں نے اس عورت کو مخاطب کر کے کہا۔

اچھا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لکڑی کی الماری کو کھولا، الماری کے پٹ کھلتے ہی کئی بڑی بڑی چمگادڑیں اس میں سے پھڑپھڑاتی ہوئیں باہر نکل آئیں اور سامنے چھت کے ساتھ الٹی لٹک گئیں۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

مجھے خوفزدہ دیکھ کر وہ مرد زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی گھوڑا ہنہنایا ہو۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو ایسا لگا جیسے انسانی جسم پر گھوڑے کا منہ لگا ہو میں مزید خوفزدہ ہو گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مجھے اس طرح گھور گھور کر" وہ پھر ہنہنایا۔

"کچھ نہیں....." میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اس عورت نے مجھے ایک انتہائی غلیظ کپڑا نکال کر دیا جس میں سے سخت تعفن اٹھ رہا تھا" لو یہ پہن لو۔"

میں نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ابکائی کو روکا اور وہ کپڑا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں کہاں پر لیٹوں، کپڑے کو اپنے آپ سے مزید دور کر کے میں نے اس سے پوچھا۔

اوپر ..... اس نے انتہائی خوش ہو کر انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس کے اس وقت اتنا خوش ہونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اس کمرے سے نکل کر صحن کی جانب آیا تو سامنے ایک کوٹھری کا بوسیدہ سا زینہ نظر آیا۔

میں نے زینہ کی طرف قدم بڑھایا اور ایک سیاہ رنگ کی بلی میاؤں کرتی ہوئی میرے سامنے آگئی۔ میں نے اپنے قدم روک لئے۔

"جاؤ جاؤ یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔" وہ عورت بولی۔

میرے قدموں کی آواز سے احتجاجاً" زینہ بری طرح چرچرا رہا تھا۔ کچھ بھیانک قسم کی چمگادڑیں اس کے نیچے سے نکل کر بھاگیں۔

آخر کار میں اوپر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس عورت کا دیا ہوا کپڑا میں نے ناگواری سے ایک طرف پھینک دیا۔

اور اس کمرے میں بھی ویسی ہی سیلن، ٹھنڈ اور گھٹن سی تھی۔ ابھی تک جو واقعات پیش آرہے تھے۔ میں ان سب سے سخت ہراساں ہو رہا تھا۔ سب کچھ عجیب سا تھا۔ یہ کس قسم کے لوگ ہیں اور کتنی بدبو ہے یہاں، ایسا لگ رہا تھا، جیسے بہت ساری گندگی سڑ گئی ہو۔

میں اس غلیظ سے بستر پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ دوبارہ قدموں کی آواز ابھری۔

میں نے دیکھا کہ وہ عورت ہاتھ میں وہی پیالہ لئے ہوئے چلی آرہی ہے۔ "میں نے سوچا تمہیں سخت سردی لگ رہی ہے میں تمہارے لئے یہ مشروب لے کر آئی ہوں اس سے تمہاری سردی ختم ہو جائے گی۔" اس نے میرے ہاتھ میں پیالہ تھما دیا، جو میں نے اس سے لے کر فوراً" میز پر رکھ دیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ "اس گھر میں اتنی بدبو کیوں ہے؟"

"بدبو!" اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ تمہارا وہم ہے۔"

"اور ہاں یہ جو صاحب ہیں کیا وہ آپ کے شوہر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ میرے ہی پتی ہیں۔"

ابھی میں اس سے کوئی اور بات کرتا کہ اس کا شوہر چلا آیا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑی تو میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ وہی انسانی جسم پر گھوڑے کا چہرہ.....

میں نے گھبرا کر اس عورت کی طرف دیکھا۔ "وہ..... ان کا چہرہ کیسا ہوگیا؟" "کیوں کیا ہوا ان کے چہرے کو دیکھو ادھر دیکھو میرا چہرہ بھی تو ایسا ہی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر بولی۔

میں نے اس عورت کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو اس کے چہرہ کی جگہ بھی گھوڑے کا چہرہ تھا۔

میں نے چیخ کر اس کمرے سے نکل کر جانا چاہا تو اس آدمی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ارے کہاں جارہے ہو؟ ہم نے بڑی محنت سے تمہارے لئے جو مشروب تیار کیا ہے وہ تو پیتے جاؤ۔

یہ کہہ کر مرد نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور اس عورت نے وہ پیالہ زبردستی میرے منہ سے لگا دیا۔

پیالے کے قریب آتے ہی میری ناک سے سڑے ہوئے خون کی سخت ناگوار بو ٹکرائی میں نے ہاتھ مار کر اس عورت کے ہاتھ سے وہ پیالہ گرا دیا۔ اور وہاں سے بھاگنا چاہا۔

"تم ایسے نہیں جاسکتے۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ پہلے تمہاری تھوڑی سی خاطر تواضع کی جائے پھر ہم اپنی دعوت کریں گے۔ مگر تم تو بھاگ رہے ہو۔ یہ کہہ اس عورت نے مجھے پکڑ لیا۔ اس مرد نے ہاتھ فضا میں بلند کیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی آگئی۔

آج تو بڑا مزہ آئے گا۔ بہت عرصہ ہوا نہ تو کسی کا خون ملا ہے پینے کو اور نہ گوشت ملا ہے کھانے کو۔ بڑا مزہ آئے گا۔ بڑا مزا آئے گا۔ وہ چڑیل بری طرح قہقہے لگا رہی تھی۔

میں نے بڑی جدوجہد سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا اور نیچے بھاگا۔ وہ دونوں میرے پیچھے بھاگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں انتہائی بھیانک شکلوں میں تبدیل ہوچکے تھے۔ ان کی باچھوں سے تازہ تازہ خون بہہ کر ان کے سفید کپڑوں کو رنگین بنا رہا تھا۔

جتنی دیر مجھے باہر کا دروازہ کھولنے میں لگی اتنی دیر میں وہ آدمی اپنا کام کرچکا تھا اس کی کلہاڑی سے میرا شانہ زخمی ہوگیا تھا میں نے جیسے

ہی اس منحوس کھنڈر حویلی سے قدم باہر نکالا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"یاحی یا قیوم برحمتک استغیث" اس سے پہلے میں نے دعا پڑھنے کی کوشش کی تو مجھے دعا یاد نہیں آرہی تھی۔ اب حویلی سے باہر نکلتے ہی مجھے سب دعائیں یاد آگئیں اور میں ان کا ورد کرتے ہوئے' تیز تیز بھاگتا جارہا تھا۔

اور میرے پیچھے سے ان منحوس بدروحوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"ارے ہم بہت عرصے سے بھوکے اور پیاسے ہیں ہماری بھوک اور پیاس تو مٹاتے جاؤ۔"

مجھے یاد نہیں میں کتنا اور کہاں تک بھاگا۔ حالانکہ میری کمر میں سخت تکلیف ہورہی تھی۔ مگر میں پھر بھی بھاگ رہا تھا۔ جب ہمت جواب دے گئی تو تھک کر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔"

سب لوگ دم بخود میری کہانی سن رہے تھے۔ اور چاچو کی چھوٹی منی کا منہ تو اس طرح کھلا ہوا تھا کہ اگر مکھیاں بھی گھس جاتیں تو اس کو پتہ نہیں چلتا۔ "ارے تم اپنا منہ بند کرلو نہیں تو مکھی گھس جائے گی۔" میں نے ہنس کر کہا تو اس نے شرما کر سر جھکالیا۔

"ہاں بیٹا بعض اوقات رات کے اندھیرے میں شیطانی بد روحیں اسی طرح لوگوں کو پریشان کرتی ہیں۔ مگر جو اللہ کے کلام کا ورد رکھتے ہیں۔ یہ شیاطین ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" چچا جان نے میرا بخار دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے ایمان کہیں کا! آیا تھا بیمار دادی کو دیکھنے اور خود بیمار بن بیٹھا۔" دادی جان نے پیار سے ایک چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں یہ بتا کہ تو نے گھر سے نکلتے وقت کیا دعا پڑھی تھی۔ وہ یہ والی دعا

بسم اللہ توکلت علی اللہ۔ دادی جان نے پوچھا۔

میں نے شرمندہ ہو کر سر جھکالیا۔

یہ بلائیں اسی لئے تو پیچھے لگ گئیں۔ اسی لئے ہزار دفعہ کہا ہے کہ اللہ کے نام کے ساتھ باہر قدم نکالا کرو۔" دادی جان نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد چچا جان کے ہاری بھی موٹر بائیک ٹریکٹر پر رکھ کر لے آئے۔ اور ہاں انہوں نے ایک عجیب سی خبر سنائی کہ "سارا جنگل چھان مارا ہے لیکن اس جنگل میں کہیں بھی ویران حویلی یا کھنڈر نہیں ہے۔

قدرتی موئسچرائزر

Aloe Vera کے ساتھ

ایلوویرا

کیپری کا ملائم جھاگ نرمی سے آپ کی جلد کو صاف کرتا ہے اور اس میں موجود خصوصی ایلوویرا موئسچرائزر جلد کی قدرتی نمی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ریگولر کے علاوہ تین حسین رنگوں اور منفرد خوشبوؤں ۔ Sandalwood ۔ Floral ۔ Gardenia میں دستیاب۔ گھر کے ہر فرد کا انتخاب

جلد کی حفاظت، جلد کی نفاست

PRESTIGE

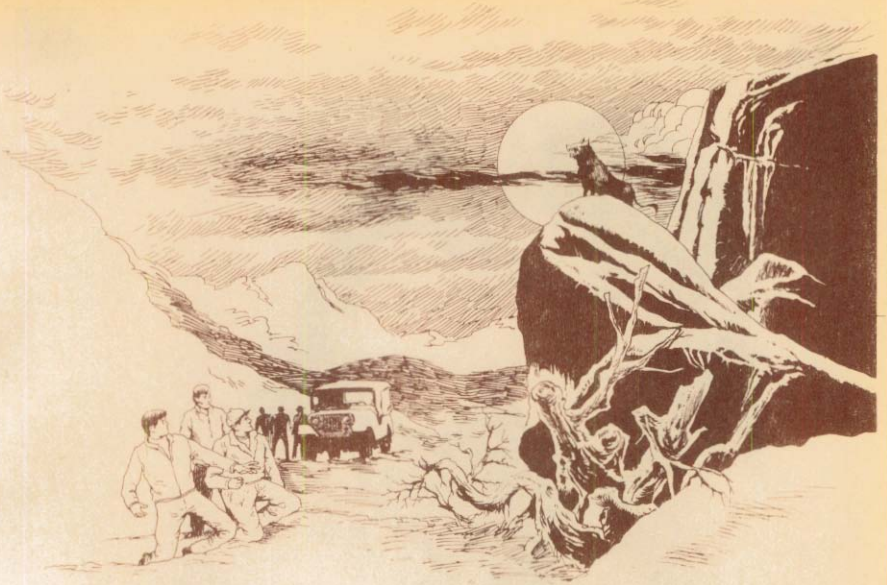

وہ بھیانک رات

عثمان بن سلیم

اچانک وین کے بریک چرچرائے اور وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ "کیا بات ہے؟" "گاڑی کیوں روک دی؟" کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ "لگتا ہے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔" وین کے ڈرائیور نے گردن پیچھے موڑ کر جواب دیا۔ اب سب لڑکے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے تھے پھر ایک ایک کر کے سب وین سے نیچے اتر آئے۔

فیاض اور اس کے دوستوں کا چند روز قبل پکنک منانے کا پروگرام بنا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس مرتبہ پکنک نئے انداز سے منائی جائے۔ "تو پھر شکار کا پروگرام کیسا رہے گا؟" یہ تجویز مہتاب نے پیش کی تھی اور یہ بات سب کے دل کو لگی تھی پروگرام بنا سب نے اپنے طور پر تیاری کی اور گھر والوں سے اجازت لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں ماہر شکاری تو کوئی بھی نہ تھا بس یہ تھا کہ

تفریح اچھی رہی۔

جس جگہ یہ لوگ جارہے تھے وہاں چھوٹے موٹے پرندوں کا شکار ملتا تھا اس جگہ تک پہنچنے کے لئے ابھی ایک گھنٹے کا راستہ باقی تھا۔ ڈرائیور شیر خان نے انہیں یہی بتایا تھا۔

ڈرائیور دوسرا ٹائر تبدیل کرنے لگا۔ ایک دو لڑکے ٹائر تبدیل کرنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ تقریباً" پندرہ منٹ کے بعد وہ دوبارہ چلنے کے لئے تیار تھے۔ مطلوبہ جگہ پہنچنے کے بعد تمام دن انہوں نے خوب انجوائے کیا۔ شکار کھیلے۔ اپنے کیے ہوئے شکار کو پکا کر کھایا بھی۔ غرض یہ کہ انہوں نے پکنک کا خوب لطف اٹھایا۔

دن اب آہستہ آہستہ ڈھل رہا تھا۔ سب لڑکے بے حد تھک چکے تھے۔ لڑکوں نے تمام سامان وین میں رکھا اور چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔

"اوہو" "یہ کیا ہوا؟" اچانک انہیں ڈرائیور کی پریشان آواز سنائی دی۔ "کیوں کیا ہوا؟" کئی لڑکوں نے ایک ساتھ پوچھا۔"دوسرا ٹائر بھی پنکچر ہوگیا۔" ڈرائیور نے پریشان ہو کر کہا۔ اوہ..... ان کے منہ سے نکلا۔ "یار اب کیا ہوگا۔" مہتاب نے گھبرا کر کہا۔ جواب میں کوئی کچھ نہ بولا۔

سب ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

"یہ تو مسئلہ خراب ہوگیا شیر خان۔ اب کیا کیا جائے؟" فیاض نے ڈرائیور سے پوچھا۔ شیر خان ڈرائیور کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ "یہاں سے دو میل دور ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ وہاں پر ٹائروں کے پنکچر بن سکتے ہیں لیکن وہ دکان اس وقت بند ہو چکی ہوگی۔" "اوہ..... تو کیا اب رات ہمیں یہیں گزارنی پڑے گی؟" یوسف نے پریشان ہو کر کہا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔" شیر خان نے کہا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں چل کر دیکھ ہی لیں شاید دکان کھلی مل جائے۔" مہتاب نے کہا۔ "لیکن اب اندھیرا پھیل چکا ہے اور اندھیرے میں دو میل کا سفر پیدل طے کرنا مناسب نہیں۔ ہم اس وقت شہر میں نہیں بلکہ جنگل میں ہیں۔" شیر خان بولا۔ "لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس جنگل میں درندے نہیں ہیں۔" شیر خان نے انہیں تسلی دی۔ کیونکہ وہ محسوس کررہا تھا کہ سب لڑکے اندرونی طور پر خوف زدہ ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس جنگل میں درندے موجود ہیں گو ان کی تعداد کوئی اتنی زیادہ نہیں لیکن خطرہ بہرحال تھا۔ وہ کوئی پہلی دفعہ اس جگہ نہیں آیا تھا۔ اس سے قبل بھی وہ کئی شکاریوں کو یہاں لایا تھا۔ اب اسے افسوس ہورہا تھا کہ وہ ان لڑکوں کو یہاں کیوں لایا۔ اگر خدانخواستہ کسی کو کچھ ہوگیا تو وہ ان کے والدین کو

کیا جواب دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے خوف نے آگھیرا۔

"کیا سوچنے لگے شیر خان؟" مہتاب نے اسے ٹہوکا دیا۔ شیر خان چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کچھ نہیں میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی اس طرف آنکلے تو ہم اس سے مدد لے لیں گے۔ لیکن اس وقت یہاں کون آئے گا؟" اب چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ صرف وین کے اندر کی چھوٹی لائٹ جل رہی تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ کچھ لڑکے وین کی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور کچھ وین کے باہر چادر بچھائے بیٹھے تھے۔ ماحول پر سناٹا طاری تھا.....

"کیا رات بھر جاگنے کا پروگرام ہے؟" شیر خان نے وین کے باہر بیٹھے لڑکوں سے کہا۔

"تو پھر کیا کریں اب یہاں ہمارے لئے کوئی بستر تو لگانے سے رہا۔" فیاض نے کہا۔

"دو لڑکے میرے ساتھ آؤ اللہ نے چاہا رات گزارنے کا ٹھکانا تو مل ہی جائے گا۔" شیر خان نے کہا۔ یہ تجویز لڑکوں کو پسند آئی کیونکہ اس وقت سب ہی آرام کرنے کے موڈ میں تھے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ مہتاب اور جلیل شیر خان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ شیر خان نے اپنی ٹارچ روشن کرلی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ جلیل چلتے چلتے رک گیا۔

"ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" مہتاب نے پوچھا۔

"ہم اس وقت جنگل میں ہیں اور ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے میں ذرا اپنی شکاری رائفل لے آؤں۔" جلیل نے کہا اور واپس وین کی طرف چل دیا۔

چند ہی لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو رائفلیں تھیں۔

"لگتا ہے تم خوفزدہ ہو۔" مہتاب نے کہا۔

"اب تم جو بھی سمجھو۔" اس نے ایک رائفل مہتاب کو دیتے ہوئے کہا۔

تینوں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ماحول پر دہشت ناک خاموشی مسلط تھی۔ صرف جھینگروں کے بولنے کی آواز آرہی تھی یا پھر ان کے چلنے سے خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز پیدا ہورہی تھی۔ شیر خان کی ٹارچ مسلسل حرکت میں تھی وہ اسے دائیں بائیں گھماتا چل رہا تھا۔ اچانک وہ بولا : "لڑکو دیکھو وہ سامنے کوئی غار معلوم ہوتا ہے...." شیر خان کی آواز میں جوش تھا۔

"کہاں؟" جلیل اور مہتاب نے ایک ساتھ پوچھا۔

پھر ٹارچ کی روشنی کی سمت دیکھنے لگے۔ دائیں طرف انہیں بڑے بڑے پتھر دکھائی دیے۔ پتھروں کے درمیان ایک خلا سا تھا۔ "ارے یہ تو غار ہی لگتا ہے آؤ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔" شیر خان نے کہا اور ٹارچ کی روشنی کی رہنمائی میں غار کے اندر داخل ہوگیا۔ مہتاب اور جلیل اس کے پیچھے تھے۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ غار میں وہ آہستہ آہستہ اندر آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ جگہ خاصی کشادہ تھی۔ اور اندر ہوا کا بھی گزر تھا۔

"میرے خیال میں رات گزارنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور نہیں ہوسکتی"۔ شیر خان نے کہا۔

"آؤ واپس چل کر باقی لوگوں کو بھی لے آتے ہیں۔" اپنے ٹھکانے پر آکر انہوں نے لڑکوں کو خوشخبری سنائی۔ وہ چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ انہوں نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھالیں اور وین کے دروازے اچھی طرح لاک کر کے شیر خان کی رہنمائی میں چل دیئے۔ لڑکے اندرونی طور پر خوفزدہ تھے لیکن ہر ایک کی کوشش یہی تھی کہ اس کا خوف کسی دوسرے پر ظاہر نہ ہو۔ چند ہی منٹ بعد وہ غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اب شیر خان کے علاوہ فیاض اور یوسف کے ہاتھ میں بھی ٹارچیں تھیں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ عین اس وقت انہیں ایک غراہٹ سی سنائی دی اور سب کے دل اچھل کر حلق میں آگئے۔ لڑکوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے۔ خود شیر خان کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کرپائے تھے کہ کیا کریں اچانک ایک کتے کا پلا بھاگتا ہوا ان کے سامنے سے گزر گیا اور سب نے سکھ کی سانس لی۔

"اس نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔" شکیل نے لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"واقعی میں تو سمجھا تھا کہ شیر آگیا ہے۔" یوسف نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ڈرے ہوئے تو سب ہی تھے اس لئے کسی نے مزید کوئی بات نہ کی۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے غار کا مکمل جائزہ لے لیا جائے۔" شکیل نے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے ہمیں یہاں صرف رات گزارنی ہے اور بس۔" مہتاب نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن پیارے بھائی یہ جنگل کا حصہ ہے اور ایسی جگہوں پر عموماً جانور اپنی پناہ گاہ بنالیتے ہیں کیا معلوم کوئی جانور گہری نیند سو رہا ہو اور پھر بعد میں ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنے۔"

شکیل کی بات بھی درست تھی۔

"شکیل ٹھیک کہتا ہے ہمیں جائزہ لینا چاہئے

اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" شیر خان نے شکیل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کیوں شیر خان کا دل کسی ان دیکھے خوف سے دھڑک رہا تھا۔پورا گروپ ہی ایک ساتھ غار میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ان کی آنکھیں اب ماحول سے کسی حد تک مانوس ہو چکی تھیں۔ اور پھر تین بڑی اور زیادہ روشنی والی ٹارچوں نے غار کو خاصا روشن کردیا تھا۔ "ارے یہ کیا چیز پڑی ہے؟" سناٹے میں فیاض کی آواز ابھری۔ٹارچ کی روشنی بھی اسی چیز پر پڑ رہی تھی شیر خان نے جھک کر اسے اٹھایا اور پھر اسے جھٹکا سا لگا۔باقی لڑکوں کے بھی رنگ فق ہوگئے۔شیر خان نے گھبرا کر اسے پھینک دیا۔وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی"۔ لگتا ہے کوئی شکاری یہاں پناہ لینے آیا ہوگا اور خود کسی درندے کا شکار ہوگیا ہوگا"۔ شیر خان نے کہا۔ سب لڑکے اب بے حد خوفزدہ تھے۔ "لیکن شیر خان تم نے تو کہا تھا کہ اس جنگل میں درندے نہیں ہیں۔" شکیل نے پوچھا اور شیر خان نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ غار کے اس حصے سے بے انتہا بدبو آرہی تھی اور دماغ میں گھس رہی تھی۔

"میرے خیال میں یہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔" یوسف نے کہا۔

"لگتا ہے یہ کسی درندے کی کمین گاہ ہے۔ باقی رات ہمیں اپنی وین میں ہی جاگ کر گزار لینی چاہئے"۔

"مم - مم .... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے...." مہتاب نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

اس کی گرفت اپنی رائفل پر مضبوط تھی کہ کہیں اس سے کوئی چھین نہ لے۔ سب خاموش تھے،کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ایسے میں شیر خان بولا "ویسے میرے خیال میں تو یہاں رات گزارنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر تم لوگ رات وین میں گزارنا چاہو تو بھی ٹھیک ہے۔" کہنے کو تو شیر خان نے کہہ دیا تھا لیکن اس کی حالت بھی دوسروں سے مختلف نہ تھی۔ وہ ایک پختہ عمر اور تجربہ کار آدمی تھا لیکن تھا تو وہ بھی آخر انسان.....۔

غار کے اندر اس طرح ایک انسانی کھوپڑی کا پایا جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہ کسی درندے کی کمین گاہ ہو۔

یوسف ٹھیک کہتا ہے۔یہاں تو ایک لمحہ رکنا بھی محال لگ رہا ہے بدبو سے دماغ پھٹا جارہا ہے۔ "سس .... سس ...." "کیا ہوا شکیل؟ کیا بات ہے۔" سب لڑکے اپنی باتیں بھول کر شکیل کی طرف متوجہ ہوگئے۔وہ ہاتھ سے دائیں طرف اشارہ کررہا تھا اور اس کے چہرے پر خوف چھایا ہوا تھا۔لڑکوں نے دائیں طرف دیکھا ایک سانپ

آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اپنے بل سے باہر نکل رہا تھا۔ "لاؤ رائفل دو مجھے۔" شیر خان نے سخت لہجے میں کہا اور ایک لڑکے نے رائفل اس کی طرف بڑھا دی۔ شاید کسی لڑکے کا پیر انجانے میں سانپ کے بل کے سوراخ پر لگا تھا اور سانپ اپنے آرام میں اس دخل اندازی کرنے والے کو دیکھنے کے لئے باہر آرہا تھا۔ "ٹارچ کی روشنی اس طرف کرو۔" شیر خان نے کہا اور پھر نشانہ باندھ کر ایک فائر جھونک دیا۔ سانپ اچھل کر ایک طرف جا گرا۔ اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ "اب ہمیں یہاں رکنا نہیں چاہئے۔" شیر خان نے کہا اور غار کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ بمشکل غار کے دہانے تک ہی پہنچے ہوں گے کہ غرغراہٹ سی سنائی دی اور پھر کوئی چیز عین غار کے دہانے پر آگئی۔ "رائفلیں سنبھال لو۔" سناٹے میں شیر خان کی آواز ابھری۔ غار میں داخل ہونے والا جنگلی ریچھ تھا جو غضب ناک انداز میں ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے نوکیلے دانت جھانک رہے تھے اور اس سے اس کا چہرہ مزید بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ چنگھاڑ رہا تھا اور آگے بڑھ رہا تھا۔ لڑکوں نے بد حواس ہو کر رائفلیں لوڈ کیں اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگے۔ ان کے دل اس قدر زور سے دھڑک رہے تھے گویا اپنی جگہ سے نکل کر ابھی باہر آجائیں گے۔

"فائر کرو۔" شیر خان کی آواز گونجی۔ اس کی آواز میں ایسا جوش تھا کہ لڑکوں نے ایک ساتھ فائر کھول دیا۔ شیر خان نے بھی فائر کیا۔ "رکنا نہیں فائر کرتے رہو۔" فائر کے ہوتے ہی ریچھ کی غضبناک آواز ماحول کو مکروہ کرنے لگی۔ وہ جنونی کیفیت میں آگے بڑھنے لگا۔ لڑکوں نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ اب ریچھ ان کے خاصا قریب آگیا تھا۔ گولیاں کم ہی نشانے پر بیٹھ رہی تھیں۔ شیر خان نے صورت حال دیکھ کر رائفل لاٹھی کے انداز میں گھمائی۔ غصے میں بپھرے ریچھ نے اسے پکڑ لیا اور اپنے پنجے اس کی گردن پر جما دیے۔ شیر خان کو موت کے منہ میں دیکھ کر لڑکوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فیاض نے ہمت کی اور آہستہ سے گھوم کر ریچھ کی پشت کی طرف آگیا۔ اپنی ٹانگ پر بندھا ہوا خنجر اس نے نکال لیا۔ خنجر کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر اس نے ریچھ کی پیٹھ پر بھرپور انداز میں وار کیا۔ غار میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور ریچھ کی گرفت شیر خان پر ڈھیلی پڑ گئی۔ فیاض اب چند قدم دور جا کھڑا ہوا تھا اور اس نے رائفل بھی لوڈ کر لی تھی۔ جوں ہی ریچھ اس کی طرف گھوما اس نے اللہ کا نام لے کر فائر کر دیا۔ اتفاق ہی تھا کہ رائفل سے نکلی گولی عین ریچھ کے سینے پر لگی۔ کئی گولیاں پہلے ہی اپنا کام کر چکی تھی اور ریچھ کے بدن سے

خون بہہ رہا تھا اس گولی نے مزید کام دکھایا اور ریچھ آہستہ آہستہ گرنے لگا۔ سب لوگ فاصلے پر کھڑے اس کا انجام دیکھ رہے تھے کچھ ہی دیر بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

اللہ نے کرم کیا تھا کہ کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔شیر خان کے گلے پر بھی معمولی زخم آئے تھے۔ گرتے پڑتے وہ اپنی وین تک پہنچے۔ اب ایک ایک لمحہ ان پر پہاڑ بن کر گزر رہا تھا۔ ہر لمحہ یہی خوف محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اب کوئی درندہ آجائے گا۔پوری رات وہ لوگ ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکس بیٹھے رہے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ چند گھنٹوں بعد شیر خان کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔

صبحِ کاذب کے آثار نمودار ہوتے ہی فیاض، مہتاب اور شیر خان پنکچر ٹائر لے کر روانہ ہو گئے۔ تقریباً" دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ان کی واپسی ہوئی اور پھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جنگل کی حدود سے نکل کر سب کی جان میں جان آئی۔

انڈے کو پانی کے بیچ میں ساکن کرنا

اعتماد کامران یوسفی

انڈے کی یہ خاصیت ہے۔ کہ اگر وہ صحیح ہو تو پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ اور اگر خراب ہو تو پانی کے اوپر تیرتا ہے۔ لیکن ہم جو ٹرک (Tric) آج آپ کو بتا رہے ہیں، اس سے آپ انڈے کو پانی کے عین درمیان میں ساکن کر سکتے ہیں۔

طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک جگ میں اس کے نصف کا تعین کر کے پانی ڈالیں۔ پھر اس پانی میں نمک کی ایک کثیر تعداد ملا دیں کچھ دیر بعد جب نمک پانی میں اچھی طرح حل ہو جائے تو اس میں ایک صحیح انڈا ڈال دیں آپ دیکھیں گے کہ انڈا پانی کے اوپر تیر رہا ہے۔ پھر آپ جگ میں اوپر سے نہایت احتیاط کے ساتھ ایک کنارے سے پانی ڈالیں۔ جب جگ پانی سے بھر جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ انڈا پانی کے درمیان میں ساکن ہے۔ یہ پانی تقریباً ۱۲ گھنٹوں تک آپس میں نہیں ملتا۔

وجہ یہ ہے کہ نمکین پانی میں چیزیں کم ڈوبتی ہیں اور عام پانی میں جلدی۔ اس لئے انڈا آسانی سے درمیان میں ساکن ہو جائے گا۔

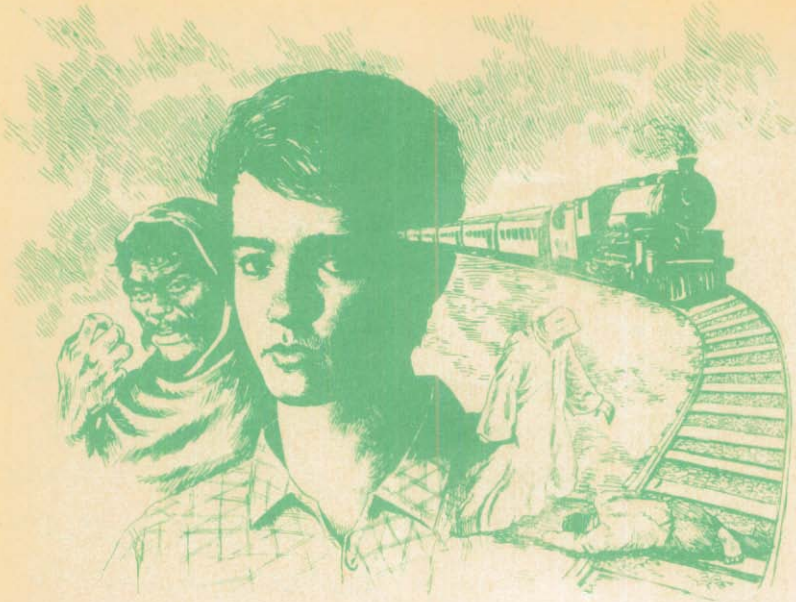

غیبی امداد

علی اکمل تصور

مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اور پھر ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ تاریکی کی بھیانک چادر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی میں سسک کر رہ گیا۔ میری ٹانگوں نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

میرے پورے وجود میں درد کی لہر کسی کرنٹ کی طرح دوڑ رہی تھی۔ میں نے کراہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میری حرکت کے ساتھ ہی میرے کانوں سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے

لڑکھڑانے کی آواز ٹکرائی اور پھر میرا ہاتھ کسی چیز پر آکر جم گیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکیں تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے اس چیز کو برف جیسا ٹھنڈا اور پتھر جیسا ٹھوس پایا تھا۔

"مم ..... میں کہاں ہوں .....؟" میں نے جیسے خود سے سوال پوچھا اور پھر جیسے ایک ہی لمحے میں لاشعور سے شعور تک کے تمام مرحلے طے ہوگئے۔

یہ آج صبح کی بات تھی۔ میں اپنی کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے انگلش کے پروفیسر دھیمی آواز میں لیکچر دے رہے تھے اور میں نوٹس تیار کررہا تھا۔ ایسے میں ہمارے اسکول کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا لفافہ تھا۔

یہ لفافہ دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ میرے گاؤں سے آنے والے تمام خطوط ایسے ہی لفافوں میں آتے تھے۔ پھر ہمارے پروفیسر کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"فخر..... تمہارے نام خط آیا ہے....." میں خاموشی سے اٹھا اور پھر ان سے لفافہ وصول کرلیا۔ اپنی نشست پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے میں لفافے کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ اس خط پر ایک دن پہلے کی مہر لگی ہوئی تھی۔ مجھے چپراسی کی سستی پر پہلے تو غصہ آیا لیکن پھر میں پروفیسر صاحب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

پیریڈ ختم ہونے پر ہی میں نے لفافہ چاک کیا اور پھر میری امی کی لکھائی میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

پیارے بیٹے فخر

جیتے رہو.....

تمہارے ابو کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسکول سے چھٹی لے کر فوراً گھر چلے آؤ اور ہاں پریشان مت ہونا۔ وہ خیریت سے ہیں۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

..... تمہاری امی

امی کا خط پڑھتے ہی میرے ذہن میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے چھٹی کی درخواست جمع کروائی اور پھر ہوسٹل میں سے اپنا ضروری سامان سمیٹ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا۔

ٹرین کو ایک گھنٹے کے بعد روانہ ہونا تھا۔ میں ٹکٹ خرید کر انتظار گاہ میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے پاس ایک سوٹ کیس تھا اور جیب میں حسب ضرورت نقدی تھی۔ ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

"ابو کو کیا ہوا ..... وہ کیوں بیمار ہوئے ..... جانے اب وہ کیسے ہیں.....؟"

سوالات تو موجود تھے لیکن کوئی جواب نہیں

تھا۔ اور میری بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔

"اے اللہ میری زندگی کو کم کردے لیکن میرے ابو کو سلامت رکھنا....." میرے دل سے بس یہی ایک خاموش دعا نکل رہی تھی۔

"انہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔ اس محبت کے لئے انہوں نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ مجھے گھر سے دور شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ یہیں میرے رہنے سہنے کا انتظام کیا۔ اور خود وہاں تنہا رہ گئے۔ میرے مستقبل کے لئے انہیں یہ تنہائی بھی گوارا تھی اور اب وہ بیمار تھے۔ اور میرا گاؤں شہر سے بہت دور تھا۔ میں باوجود خواہش کے وقت سے پہلے گاؤں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"مسافر حضرات متوجہ ہوں....." میں نے غور سے اعلان سنا اور پھر اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے پلیٹ فارم نمبر چار پر چلا آیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آچکی تھی اور مسافر ایک دوسرے کو دھکے دیتے اپنی اپنی نشستیں ڈھونڈ رہے تھے۔

آٹھ نمبر کے ڈبے میں میری سیٹ تھی۔ دس منٹ بعد میں اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ مقررہ وقت پر ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ چھوٹے بڑے اسٹیشن آتے رہے اور میں لاتعلق سا بیٹھا رہا۔

ٹھیک آٹھ گھنٹے بعد ٹرین میرے مطلوبہ اسٹیشن پر رک گئی۔ میں اپنا سامان سنبھالتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آیا اور پھر ٹکٹ گھر سے اپنے گاؤں کا ٹکٹ خرید لیا۔ میرے گاؤں جانے والی گاڑی کو یہیں سے روانہ ہونا تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں چائے کا ایک کپ پینے کے بعد پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔

"اے بابو..... تم کچھ پریشان لگتے ہو.....؟" ایک وزنی سی آواز مجھے اپنے قریب سے سنائی دی۔ اور میں چونک پڑا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا وزنی جسم کا مالک ایک آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ توے کی مانند سیاہ تھا۔ اور سفید دانت چمک رہے تھے۔

"میں..... نہیں تو....." میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"بابو آپ کو کدھر جانا ہے.....؟" اس کا انداز پولیس والوں جیسا تھا۔

"میرے گاؤں جانے والی گاڑی آنے والی ہے۔ اس کا انتظار کررہا ہوں....."

میں نے خود پر قابو پالیا تھا اور اب میرا لہجہ مضبوط تھا۔ میری بات سن کر وہ کندھے اچکاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ لیکن جانے کیوں مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میرا انتظار طویل

ہوتا چلا جارہا تھا۔ گاڑی شاید لیٹ ہو چکی تھی۔ ساڑھے نو بجے پلیٹ فارم پر ہلچل کے آثار نظر آئے۔ اور پھر ٹرین حرکت کرتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رک گئی۔ میں جلدی سے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ ساری گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دو منٹ بعد گاڑی اگلے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی اور میں مسافروں کے درمیان پھنسا ہوا وقت گزارنے کے لئے گنتی گننے لگا۔ یہ میری عادت بن چکی ہے۔ گنتی گننے کے دوران جہاں سے میں بھول جاتا تھا۔ وہیں سے دوبارہ گننا شروع کردیتا تھا۔ وقت اپنی لگی بندھی رفتار کے مطابق گزر رہا تھا۔

پھر جیسے مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے اس آدمی کو مسافروں کے درمیان دیکھا تھا۔ جس سے میری ملاقات پلیٹ فارم پر ہوئی تھی اور جس کا رنگ توے جیسا سیاہ تھا۔

میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی تھی۔ خطرے کی گھنٹی میرے چاروں طرف بج رہی تھی۔ میں نے متلاشی نظروں سے ڈبے میں موجود تمام مسافروں کا جائزہ لیا۔ لیکن اب کی بار وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ میری آنکھوں نے ہرگز دھوکا نہیں کھایا تھا اور اب میں خود کو خطرے میں محسوس کررہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے تمام حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ گاڑی چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور یہ اسٹیشن میرے گاؤں کی طرح چھوٹا سا تھا اور پھر شاید میں واحد مسافر تھا جو اس اسٹیشن پر اترنے والا تھا اور رات کے ایک بجے گاڑی سے اترنے کے بعد میں غیر محفوظ تھا۔

میرا ذہن تمام حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ میں گاڑی میں بیٹھا سفر کرتا رہوں۔ لیکن میرے ابو بیمار تھے۔ جانے ان کی حالت کیسی تھی؟ میں خود کو ایک دوراہے پر محسوس کررہا تھا۔ پھر میرا سر جھک گیا۔

"اے میرے اللہ..... میرا واحد سہارا تو ہے۔ مجھے اپنی پناہ میں رکھنا....." دعا کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے لیکن دل مطمئن ہوگیا۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں تھا۔

ٹھیک ایک بجے ٹرین میرے اسٹیشن پر آکر ٹھہر گئی۔ میں مسافروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میں اس اسٹیشن پر اترنے والا واحد مسافر تھا۔ اطمینان والی بات یہ تھی کہ وہ سیاہ رنگ والا خوف ناک آدمی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

پھر ٹرین پٹریوں پر سرکنے لگی۔ اور چند لمحوں بعد آگے نکل گئی۔ میں نے اطمینان سے بھرپور سانس لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے قدموں

کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہی سیاہ رنگ والا آدمی میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کے سفید دانت بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ میرے سامنے کردیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود لوہے کا راڈ میرے سر کے پچھلے حصے سے ٹکرایا اور پھر میں غافل ہوتا چلا گیا۔

اور اب.... اب میں مدہوشی کی کیفیت سے باہر نکل رہا تھا۔ میرا پورا وجود کسی پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا۔ میرے لئے حرکت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لٹیرے نے مجھے بہت بے دردی سے پیٹا تھا۔

پھر دور سے مجھے ایک آواز سنائی دی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ٹرین کا انجن وسل دے رہا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اس پلیٹ فارم پر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں مطمئن ہو گیا اس اسٹیشن پر گاڑی کے رکتے ہی کوئی نہ کوئی مسافر میری مدد ضرور کرے گا۔ ذہن میں اس تصور کا پیدا ہونا ہی تھا کہ ایک بار پھر میرے دماغ پر غنودگی سی چھانے لگی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

ٹرین کا انجن وسل پر وسل دے رہا تھا انجن کی ہیڈلائٹس تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے میری آنکھوں سے ٹکرا رہی تھی اور میری آنکھیں بند ہوتی چلی جارہی تھیں۔

ایسے میں اچانک ہی تازہ گلاب کی مہک میرے چاروں طرف پھیل گئی۔ میں چونک پڑا۔ پھر ایک نرم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "تم خطرے میں ہو۔ اپنی مدد خود کرو....." اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ساتھ دو کروٹیں بدلیں۔ لوہے کی سرد پٹری میرے وجود کے نیچے سے نکل گئی۔ اور پھر ٹرین کی تکلیف دہ آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ "ٹھکا.... ٹھک.... ٹھکا.... ٹھک....."

ٹرین گزر گئی۔ لیکن تازہ گلاب کی مہک ابھی تک میرے آس پاس موجود تھی۔ پھر میرے شعور نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

اگلی صبح میری آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ میرے ابو بھی اسی ہسپتال میں موجود تھے اور خیریت سے تھے۔ اور اب سب گھر والے میرے لئے پریشان تھے۔

میں نے انہیں ساری کہانی سنادی۔ اتنے میں میرے بڑے بھائی کے ہمراہ ایک انسپکٹر ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ میرے بھائی کے ہاتھوں میں میرا سوٹ کیس موجود تھا جو کل رات وہ لٹیرا لے کر بھاگ گیا تھا۔ اتنی جلدی سوٹ کیس مل جانے پر سبھی حیران تھے۔ پھر پولیس انسپکٹر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

دلچسپ معلومات

☆ بلجیم میں ننگے پاؤں چلنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔

☆ یونان کے ایک جزیرہ کے لوگ صابن کی بجائے مٹی سے نہاتے ہیں۔

☆ ویسٹ انڈیز میں چیچپی نامی درخت پایا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی کو آگ لگانے سے اٹھنے والا دھواں اگر آنکھوں کو لگ جائے تو آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔

☆ دنیا کی طویل ترین مسکراہٹ کا ریکارڈ کینیڈا کی بارہ سالہ لڑکی نے قائم کیا۔ جو ۱۰ گھنٹے ۵ منٹ تھا۔

☆ دنیا کا سب سے بڑا دسترخوان شکاگو میں ۱۸۸۸ء میں لگایا گیا۔ جس پر بیک وقت ستر ہ ہزار آدمی کھانا کھا سکتے تھے۔ اس کی لمبائی دو کلو میٹر تھی۔

☆ چلی میں مرغیاں نیلے رنگ کے انڈے دیتی ہیں۔

☆ سری لنکا کے مغرب میں آدم کی پہاڑیوں پر سورج غروب ہونے سے پہلے سات رنگ لاتا ہے۔

"کل رات آپ کے گاؤں سے تھوڑی دور ٹرین کے حادثے میں ایک آدمی ہلاک ہو گیا۔ اس کے پاس سے یہ سوٹ کیس ملا ہے۔ آپ کے بڑے بھائی کے مطابق یہ آپ کا ہے....."

"جی ہاں سر....." میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"سر آپ اس آدمی کا حلیہ بتائیں گے....."

"ہاں .....وہ خاصا صحت مند آدمی ہے۔ رنگ سیاہ اور....."

"ہاں.....ہاں.....یہی وہ آدمی ہے جس نے مجھے زخمی کیا....." میں انسپکٹر کی بات کاٹتے ہوئے چیخ پڑا۔ انسپکٹر ضروری کارروائی کرنے کے بعد چلا گیا اور میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ پھر میرے کانوں سے میرے ہی الفاظ ٹکرائے۔

"اے میرے اللہ .....میرا واحد سہارا تو ہے۔ مجھے اپنی پناہ میں رکھنا.....

اس کے ساتھ ہی میرے کانوں سے ایک میٹھی سی آواز ٹکرائی۔

"تم خطرے میں ہو۔ اپنی مدد خود کرو....."

اور پھر مجھے ایک بار پھر گلاب کے تازہ پھولوں کی مہک اپنے قریب سے اٹھتی محسوس ہوئی۔

جس آواز نے مجھے نئی زندگی عطا کی تھی۔ اسی آواز نے اس لٹیرے کے انجام کا بندوبست بھی کیا تھا۔

"اے اللہ تیرا شکر ہے....." میرے ہونٹوں نے نرمی سے یہ جملہ ادا کیا اور پھر میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

کہانی انسان کی

اسحاق منصوری

(پانچویں قسط)

ظالم بادشاہ کے ڈر سے ماں نے اپنے بچے حنیؑ کو ایک صندوق میں بند کر کے سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ لہریں صندوق کو جزیرہ وقواق کے گھنے جنگل میں چھوڑ آئیں۔ یہاں ایک ہرنی نے اس بچے کو اپنے گم شدہ بچے کی جگہ پرورش کرنا شروع کیا۔ وہ اسے اپنا دودھ پلاتی، گرمی سردی سے بچاتی اور پیار و محبت سے چومتی چاٹتی۔ بچہ بھی ہرنی سے بہت پیار کرتا اور ہر دم اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے جنگل کے دوسرے جانوروں کو بھی دیکھا۔ وہ ان سب کی آوازوں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا۔ اسے بعض جانور اچھے لگتے لیکن اس کی دوستی سب سے زیادہ ہرنی کے ساتھ ہی تھی۔ جب حنیؑ کافی بڑا ہو گیا تو ایک دن اچانک ہرنی مر گئی۔ حنیؑ بڑا حیران ہوا۔ اس نے ہرنی کے مرنے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے اس کا آپریشن کر ڈالا۔ اسے معلوم ہوا کہ دل دھڑکنا بند کر دے تو جاندار مر جاتا ہے۔ اور دل اس وقت دھڑکتا ہے جب اس میں روح ہو۔ ہرنی کے مرنے کے بعد حنیؑ جزیرے کی سیر کو نکلا۔ تب ایک دن اس نے آگ کو دیکھا۔ اس نے آگ پر ایک مچھلی کو بھون کر کھایا۔ بہت مزا آیا۔ یوں وہ گوشت کھانے کا عادی ہو گیا۔ جزیرے کی سیر کے دوران حنیؑ کے تجربات اور غور و فکر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

(اب آپ آگے پڑھئے)

جمادات کی خصوصیات : حی نے ان چیزوں کو دیکھا جن میں ظاہری خواص نہیں پائے جاتے نہ وہ غذا حاصل کرتی ہیں اور نہ ہی وہ گھٹتے بڑھتے ہیں جیسے پتھر، مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ اس نے دیکھا کہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی لمبائی، چوڑائی محدود ہے۔ اس میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس میں سے بعض چیزیں رنگ دار اور بعض کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ کچھ چیزیں گرم اور کچھ چیزیں ٹھنڈی ہیں۔ یہ بات بھی اس کے مشاہدہ میں آئی کہ گرم چیزیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں اور ٹھنڈی چیزیں گرم۔ پانی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور بھاپ پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جلنے والی چیزیں انگارے اور راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ شعلے اور دھواں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں دھواں اگر کسی پتھر سے ٹکرائے تو اس پر اپنے نشانات، چھوڑ دیتا ہے اس نے سوچا کہ سب کے سب اصل میں ایک ہی ہیں۔ ان کی شکلیں مختلف ہیں اور ان کی خصوصیات مختلف ہیں لیکن ان سب کے باوجود حیوانات، نباتات اور جمادات میں کچھ مشترکہ صفات پائی جاتی ہیں۔

مشترکہ صفات : ایک مدت تک حی کے خیالات یہی رہے۔ پھر اس نے زندہ اور مردہ چیزوں پر غور کیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سب چیزوں میں ایک چیز مشترک ہے یا تو یہ اوپر کی طرف جاتی ہیں جیسے آگ اور دھواں وغیرہ۔ جب کہ پانی یا پتھر یا حیوانات کے اعضا یا نباتات کے مختلف حصے یہ سب چیزیں نیچے کی طرف حرکت کرتی تھیں۔ زمین کی سخت سطح پر پہنچ کر یہ سب چیزیں رک جاتی ہیں۔ یہ سب چیزیں زمین پھاڑ نہیں سکتی۔ اگر یہ زمین پھاڑ سکتیں تو مزید حرکت کرتی رہتیں۔ کیوں کہ جن چیزوں کو نیچے پھینکا جاتا ہے وہ مڑتی مڑاتی اور گرتی گراتی آخری حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی طرح اوپر جانے والی چیزیں جب تک ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو وہ اوپر ہی جاتی رہتی ہیں۔ بسا اوقات دائیں بائیں مڑ کر بھی اوپر نکل جاتی ہیں۔

حی نے اس بات کا بھی تجربہ کیا کہ کسی کھال یا مشک میں اگر ہوا بھری جائے پھر اس کا منہ بند کر کے اسے پانی کے نیچے لے جایا جائے تو جب بھی وہ مشک پانی کے اوپر آنے کی کوشش کرے گی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کی سطح پر آجاتی ہے۔ اب وہ ہوا کی طرح سے نہیں اڑتی۔

پانی کی خصوصیات : اب حی نے پانی پر غور کرنا شروع کیا اس نے دیکھا کہ جب پانی جم جاتا ہے تو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اس جمی ہوئی حالت میں پانی نیچے کی طرف جاتا ہے۔ جب پانی کو گرم کر لیا جائے۔ آگ پر رکھ کر یا سورج کی گرمی سے گرم ہو جائے تو اس کی ٹھنڈک ختم ہو

جاتی ہے۔ لیکن اب بھی نیچے کی طرف جانے کی خصوصیت باقی رہتی ہے لیکن پانی جب بہت زیادہ گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے تو اس کی خصوصیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب وہ نیچے جانے کے بجائے اوپر کی طرف جاتا ہے۔

موجودات کا منبع : آخر کار حی اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر موجود چیز کو کسی وجود بخشنے والے نے وجود بخشا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ان تمام چیزوں کے خالق کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے بار بار انفرادی طور پر تمام اشیا پر غور کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں اس نے سوچا کہ ان تمام چیزوں میں کوئی ایک بہت بڑی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان تمام چیزوں میں بے شمار تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ پانی کو اگر حرارت مل جائے تو وہ بھاپ بن کر اوپر کی طرف اڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح انسانی جسم بھی مختلف کام انجام دیتا ہے کبھی اس پر غصے کی کیفیت ہوتی ہے کبھی پیار و محبت کی۔ کبھی وہ صحت مند ہے تو کبھی بیمار۔ ان سب چیزوں کو قابو میں رکھنے میں یقیناً کوئی زبردست قوت ان کے پیچھے ہے۔

اسی طرح اپنی ذہانت، غور و فکر، مشاہدات، تجربات کے نتیجے میں حی اللہ پر ایمان لانے کی منزل پر پہنچ گیا کہ وہی تمام مخلوقات کا خالق ہے یہ دنیا، یہ چرند پرند، حیوان، درندے، پہاڑ، کوہسار، دریا غرض یہ کہ سب کچھ اسی نے بنایا ہے۔

پچاس سال کے بعد : اب حی پچاس سال کا ہو چکا تھا لیکن اس میں غور و فکر کی عادت اب بھی باقی تھی بلکہ وہ اپنے سوچنے کی عادت کی وجہ سے اچھا خاصا فلسفی، اور سمجھ دار آدمی بن گیا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ جس جزیرے میں حی ابن یقظان پہنچا تھا اس کے قریب ہی ایک اور جزیرہ تھا وہاں کے لوگ اللہ کی عبادت کرتے تھے اور اس کی فرماں برداری کرتے تھے۔ اس جزیرے میں دین کی صحیح تعلیمات پہنچ چکی تھیں۔ اللہ کے رسولؐ اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات پر یہ لوگ ایمان لا چکے تھے۔ یہ دین اس جزیرے میں مسلسل پھیل رہا تھا اور اس کے اثرات دن بہ دن بڑھتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن اس جزیرے کا بادشاہ بھی مسلمان ہو گیا۔ اس نے جزیرے کے تمام لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جس پر جزیرے کے تمام لوگ خوشی خوشی مسلمان ہو گئے۔ اس جزیرے، میں دو نیک نوجوان رہتے تھے ایک کا نام "اسال" اور دوسرے کا نام "سلامان" تھا۔ یہ دونوں نوجوان بھی مسلمان ہوئے۔ دونوں اسلام پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ شریعت کے تمام احکامات کا خیال کرتے اور شریعت کے تمام فرائض

پابندی سے انجام دیتے۔ دین نے جن کاموں سے منع فرمایا ان کے قریب بھی نہ جاتے اس طرح یہ دونوں دین کی باریکیوں کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ اسال دین کی پوشیدہ، باطنی اور روحانی باتوں کی گہرائیوں میں جانے کی کوشش کرتا۔ وہ دین کے اسرار و رموز کو سمجھنے لگا تھا۔ اور اس کی پوشیدہ باریکیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا دوست اسال کے ظاہری الفاظ کا خیال کرتا اور اس کی پابندی کرتا تھا البتہ اس کے اسرار و رموز کی گہرائیوں میں جانے سے وہ دور رہتا تھا۔ وہ بہت زیادہ سوچ بچار بھی نہیں کرتا تھا۔ یہ دونوں دین میں مخلص تھے۔ اللہ کی عبادت نہایت خشوع و خضوع سے کرتے تھے۔ اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتے اپنی خواہشات نفسانی اور لغو خیالات پر قابو رکھتے تھے۔

اسال کو تنہائی پسند تھی۔ وہ لوگوں سے دور رہنا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ اسی طرح کامیابی اور نجات مل سکتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں سلامان کی رائے مختلف تھی وہ لوگوں سے میل ملاپ کو ترجیح دیتا تھا اور اجتماعیت کو پسند کرتا تھا۔ اس کے خیال میں اسی طرح کامیابی نصیب ہو سکتی تھی اسے ان پڑھ و جاہل لوگوں کو دین سمجھانے کا موقع مل گیا تھا۔ انہیں نیکی کا راستہ دکھانے اور گناہوں کے برے نتائج سے ڈرایا جائے انہیں ہدایت کا راستہ سمجھایا جائے اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکالا جائے۔

اسال نے تنہائی اختیار کرلی۔ کیوں کہ اس کے مزاج میں ہمیشہ غور و فکر کی عادت تھی اس کی یہ خواہش خلوت اور تنہائی میں بھی پوری ہو سکتی تھی البتہ سلامان نے اجتماعیت کو اختیار کیا کیوں کہ اس کے مزاج میں اسرار و رموز کی گہرائیوں میں ڈوبنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ بہت زیادہ غور و فکر سے بہت زیادہ دور رہنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں عام انسانوں کے درمیان رہ کر دین کا کام کرنے میں انسان ہر قسم کے وساوس سے دور رہتا ہے۔ اس کے دل میں غلط خیالات نہیں آتے اور شیطانی حملوں سے پناہ مل جاتی ہے۔

جدائی : اسال اور سلامان میں جو اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ ایک انفرادیت پسند تھا دوسرا اجتماعیت پسند تھا۔ یہی ان دونوں میں جدائی کا سبب بن گیا۔ اسال نے جب قریبی جزیرے کے بارے میں سنا۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں جی رہتا تھا۔ یہاں کی سرسبزی اور شادابی یہاں کی خوشگوار آب و ہوا کے بارے میں اسے کچھ معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اس جزیرے میں اسے اپنی مرضی کی تنہائی حاصل ہو جائے گی۔ وہاں رہ کر وہ آسانی سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا ہے اب اس نے مصمم فیصلہ کرلیا کہ اس

جزیرے کی طرف کوچ کر جائے تاکہ لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنی پوری زندگی سکون و اطمینان سے گزارے۔

اسال کی روانگی : اسال نے اپنا سارا مال و اسباب جمع کیا اور اس جزیرے پہنچنے کے لئے ایک کشتی کرائے پر لی۔ اس کے بعد جو دولت اس کے پاس بچ گئی تھی۔ وہ اس نے غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی۔ اپنے دوست سلامان سے الوداعی ملاقات کی اور کشتی پر سوار ہو گیا پھر ملاح اس جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسال کو ملاح نے اس جزیرے کے ساحل پر اتارا۔ وہاں اسے چھوڑ کر وہ واپس ہو گیا۔

درویش کی زندگی : اسال اس جزیرے میں اللہ تبارک تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا۔ اس کی عظمت اور پاکیزگی بیان کرتا تھا۔ اللہ تبارک تعالیٰ کی صفات اور بلند اور ارفع و اعلیٰ کمالات پر غور کرتا رہتا اس کا تعلق اللہ سے کبھی نہیں ٹوٹا۔ اس کا دل ہمیشہ یادِ ربانی میں مصروف و مگن رہتا۔ اس کے دل و دماغ میں کبھی برے خیالات پیدا نہ ہوتے جب کبھی اسے بھوک لگتی تو وہ اس جزیرے کے پھل کھا لیتا یا کسی جانور کا شکار کر لیتا جس کے ذریعہ وہ اپنی بھوک کو مٹا لیتا اور پھر اسی طرح سے اللہ کی عبادت میں مگن ہو جاتا۔

وہ بڑی خوشیوں اور مسرتوں میں تھا اپنے رب کی عبادت اور اپنے خالق سے ہر وقت دعاؤں اور مناجات میں مصروف رہنے کی وجہ سے اسے نہایت سکون اور اطمینان کی دولت حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں رہتے ہوئے وہ روزانہ اللہ کے لطف و کرم، اس کی رحمتوں اور برکتوں اور اس کی بے پایاں عنایت کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ اس کا رب کس طرح اس کی خوراک اور ضروریات کی تکمیل کر رہا ہے۔ اب اس کا یقین اور پختہ ہو گیا اور ایمان کی دولت سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہونے لگیں۔ اب حی اپنے فلسفیانہ خیالات میں غرق رہتا۔ اپنے باریک افکار اور نظریات کی گہرائیوں میں ڈوبا رہتا اسے اپنی اس فلسفیانہ سوچ بچار سے صرف تھوڑی دیر کے لئے الگ ہونے کا موقع ملتا تھا جب وہ قریب میں موجود کوئی بھی خوراک حاصل کرنے کے لئے اٹھتا تھا۔ جس کے حصول کے لئے اسال جزیرے میں گھومتا تھا اسے وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا اور نہ ہی وہاں انسانی زندگی کے کوئی آثار موجود تھے یہ دیکھ کر اسال کو بہت خوشی ہوئی کیوں کہ وہ تو تنہائی کا شوقین تھا اور انسانوں کی بھیڑ سے دور رہنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔

اچانک ملاقات : ایک مرتبہ ایسا

ہوا کہ حی اپنی غذا کی تلاش میں گھوم رہا تھا اور اسال سے الگ تھلگ رہ کر اللہ کی عبادت کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنا گھر چھوڑ کر انسانوں سے دور اس جزیرے میں آگیا اس نے سوچا کہ اگر میں نے اس آدمی سے ملاقات کی تو اس وقت جو تنہائی اور خلوت مجھے میسر ہے وہ برباد ہو جائے گی اور میری تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا البتہ حی اسال کے بارے میں سوچتا رہا کہ یہ کیسی انوکھی چیز ہے کیوں کہ وہ اس سے پہلے جتنے جانوروں کو دیکھ چکا تھا ان سب سے یہ مختلف تھا۔

اسال کا فرار : اسال نے اون اور بالوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے حی نے سوچا کہ دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی اس کا قدرتی لباس ہے جو اس کے جسم پر پیدا ہوا ہے حی کافی دیر تک اسے حیرانی اور تعجب سے دیکھتا رہا۔ البتہ اسال موقع پاتے ہی وہاں سے فرار ہو گیا' اس نے سوچا کہ یہ آدمی اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل نہ کر دے۔

تحقیق و جستجو' اور چیزوں کی حقیقت تک پہنچنا حی کی طبیعت کا جز بن چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اسال بہت تیز دوڑ رہا ہے۔ وہ اسال کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پھر حی آہستہ چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے رہ کر درختوں میں چھپ گیا اب اسال نے یہ سوچا کہ جو آدمی اس کے پیچھے آرہا تھا وہ واپس چلا گیا ہے۔

اسال کی عبادت: اسال پھر عبادت میں مشغول ہو گیا' نماز پڑھتا۔ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا' دعائیں مانگتا' اپنے گناہوں پر روتا اور خوب گڑگڑاتا تھا۔ اس خشوع و خضوع کی کیفیت میں اسے کسی چیز کی بھی خبر نہ رہی۔ جب حی اس کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن اسال کو اس کا احساس نہیں تھا۔ حی نے اسے نماز پڑھتے دیکھا اس کی تلاوت کی میٹھی آواز سنی اس کو دعائیں مانگتے دیکھا اور گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تو اسے یہ سب باتیں بہت اچھی لگیں۔ اس نے اس کی خوبصورت آواز سنی اس کے جو کلمات سنے اس میں ایک ترتیب اور وزن موجود تھا۔ ایسی آواز اس نے آج تک کسی جانور سے نہیں سنی تھی۔ اس نے اس اجنبی کی صورت پر غور کیا اسے ایسا لگا کہ وہ دونوں ایک جیسے ہی ہیں۔ جب اس کے لباس پر بہت زیادہ غور کیا تو اسے پتہ چلا کہ اس اجنبی نے میری طرح کوئی لباس بنا کر پہن لیا ہے۔ یہ اون اور بال اس قدرتی لباس کا حصہ نہیں۔ حی نے سوچا کہ کوئی بہت بڑی چیز ہے شاید یہ ان تینوں میں سے ہے۔ جنہیں علم ہوتا ہے اب تو اسال سے ملاقات کے لئے اس کا شوق اور بڑھ گیا اس نے سوچا کہ اسال کے پاس جو کچھ ہے اسے دیکھنا چاہئے وہ رو کیوں رہا تھا اور عبادت کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

خوفناک اونٹ

محمد سلیم امام (متحدہ عرب امارات)

سرورِ کائنات، اللہ کے محبوب اس کے پیارے رسولؐ نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔ ابو جہل نے پیارے رسولؐ کو نماز پڑھتے اور ایک خدا کی بندگی کرتے پایا تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ اس نے قریشِ مکہ سے کہا۔ "محمدؐ ہمارے آباو اجداد کی بدگوئی، ہماری عقلوں کی تخفیف اور ہمارے معبودوں کی توہین سے باز نہیں آتا اس لئے میں نے اللہ سے یہ عہد کیا ہے کہ ایک بھاری پتھر سے محمدؐ کا سر کچل دوں۔ جب وہ سجدہ کرے گا تو میں یہ پتھر اس کے سر پر دے ماروں گا لیکن تم لوگوں کو اس کے بعد بنو عبد مناف کے غضب سے میری حفاظت کرنا ہوگی۔" قریش مکہ نے کہا۔ "واللہ! ہم تمہیں کسی بھی معاملے میں بے یار مددگار نہیں چھوڑ سکتے تمہارے جی میں جو آئے کرو۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں تشریف لے گئے تو ابو جہل نے ایک بھاری پتھر اُٹھایا اور آپؐ کی جانب بڑھا لیکن جب آپؐ کے قریب پہنچا تو شکست خوردہ حالت میں واپس بھاگا۔ اس کا رنگ فق تھا اور وہ اس قدر مرعوب تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پتھر پر چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ بمشکل ہاتھ سے پتھر پھینک سکا۔ قریش کے کچھ لوگ اُٹھ کر اس کے پاس آئے اور کہنے لگے "ابو الحکم! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم نے پتھر کیوں نہیں مارا؟ ابو جہل نے کہا۔ "میں وہی کرنے جا رہا تھا لیکن جب محمدؐ کے قریب پہنچا تو وہاں ایک بھیانک اونٹ کو کھڑا پایا۔ میں نے ایسا خوفناک اونٹ آج تک نہیں دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ اگر میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو مجھے نہ چھوڑے گا۔"

ابن اسحاقؒ کہتے ہیں مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ بھیانک اونٹ جبرائیلِ امین تھے۔ ابو جہل اور قریب آتا تو اسے چبا ڈالتے۔

ڈراسٹک بلا

محمد اصغر احمد خان (کراچی)

"میں آگے نہیں جا سکتا ...!!" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"وہ خوفناک بلا قریب میں ہی کہیں موجود ہے ...... یہ دیکھئے
اس کے پاؤں کے نشان ...!!" میں نے زمین پر جھکتے ہوئے اس
نشان کو دیکھا اور خوف کی ایک سرد لہر مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی
میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

افسر تھا۔ وہ ایک لالچی شخص تھا۔ ممیوں کی منتقلی اس کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ قیمتی ممیاں دیکھ کر اس کی طبیعت ڈانوڈول ہوگئی۔ ایک ممی جو کہ بادشاہ کی کنیز تھی' اس کا دل اس پر آگیا۔ ابھی ممیوں کی گنتی نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس نے دل ہی دل میں پروگرام بنایا کہ کنیز ممی کو عمارت کے تہہ خانے میں چھپادے گا۔ جب بقیہ ممیاں گنتی کے بعد عجائب گھر بھیج دی جائیں گی اور اس کے ساتھی سپاہیوں کو عمارت سے ہٹادیا جائے گا تو وہ تہہ خانے سے کنیز ممی کو نکال لے جائے گا اور یورپ کے کسی اچھے عجائب گھر میں اسے مہنگے داموں بیچ کر بقیہ زندگی عیش و عشرت سے بسر کرے گا۔

دوپہر میں جب سارے سپاہی کھانا کھانے ہوٹل میں چلے گئے تو وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بناکر عمارت میں ہی رُک گیا۔ عمارت کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد وہ اس کمرے میں پہنچا جہاں کنیز ممی کو فرعون بادشاہ کے تابوت کے قریب رکھا گیا تھا۔ کنیز ممی کو دیکھ کر اس کی

آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور راتوں رات امیر بن جانے کا خواب آنکھوں میں مچلنے لگا۔

کمرے میں بہت اندھیرا تھا۔ میجر کک نے ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی کنیز ممی کے دیوار کے ساتھ لگے تابوت پر ڈالی تو اسے کچھ ڈرسا محسوس ہوا اسے یوں لگا جیسے ممی کی آنکھیں ہل رہی ہوں۔ "شاید یہ میرا وہم ہے؟" کک نے سوچا پھر اس نے آگے بڑھ کر ممی کے جسم کو ہاتھ لگایا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ممی کا جسم گرم تھا اور وہ سانسیں لے رہی تھی۔ "کیا ممی دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے؟" اس نے ڈر کر سوچا "نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے دوبارہ ٹارچ کی روشنی ممی پر ڈالی۔ ممی تابوت میں بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ "میں بھی کتنا ڈرپوک ہوں ایک بے جان ممی سے ڈر رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میجر کک نے کنیز ممی کی قیمتی چوڑیوں پر ہاتھ پھیرا۔ اسی وقت کمرہ "چٹاخ" کی آواز سے گونج اُٹھا۔ ممی کا تھپڑ میجر کک کے رُخسار پر پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ممی کا بھوت تابوت سے باہر نکل آیا۔

اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہورہی تھیں اور ماتھے پر شکنیں تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی میجر کے سر پر دے ماری..... "بھبھ..... بھبھ..... بھوت..... بھوت!! خوف سے میجر کی بُری حالت ہوگئی۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا' گھبراہٹ میں جلتی ہوئی ٹارچ اس کے کانپتے ہاتھ سے چھوٹ گئی پھر کھلے دروازے سے اس نے باہر نکلنا چاہا تو دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ کنیز ممی کا بھوت تابوت سے باہر نکل آیا تھا اور سفید رنگ کے ہالے میں تیر رہا تھا پھر بھوت دھیرے دھیرے میجر کی طرف بڑھنے لگا.....!!

سپاہی کھانا کھانے کے بعد واپس آئے تو عمارت کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا عمارت سے تمام ممیاں غائب ہیں جب کہ میجر کک فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ سپاہیوں نے اسے سیدھا کیا تو اس کے بائیں رخسار پر پانچ انگلیوں کا نشان نظر آیا۔ ایک سپاہی نے اس کی نبض چیک کی۔ نبض ڈوب چکی تھی اور وہ آدھ گھنٹے پہلے مرچکا تھا۔

کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا.....!!

بے حد خوفزدہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کوئی ڈریگن ہے۔

میں ڈریگن کے پاؤں کے نشانات دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ہی سامنے جھاڑیاں ہلیں اور جھاڑیوں کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتی ہوئی وہ خوفناک بلا سامنے آگئی۔ وہ زور زور سے غُرّا رہی تھی۔ مقامی آدمی تو اسے دیکھتے ہی بُری طرح خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اب اس بلا کے سامنے میں اکیلا کھڑا تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سمٹ کر جیسے کنپٹیوں میں چڑھ آیا تھا۔ "اتنی جلدی اس سے سامنا ہوجائے گا۔" یہ میں نے سوچا نہیں تھا میں نے جلدی سے بندوق لوڈ کی اس سے پہلے کہ میں اس کا نشانہ لے کر فائر کرتا اس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔

میرے پاس گولی چلانے کے لئے بالکل وقت نہ تھا۔ اس کے زور دار حملے سے بچنے کے لئے میں نے بائیں طرف چھلانگ لگادی اور نرم نرم برف پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لُڑھکتے لُڑھکتے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا کہ وہ بلا بھی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی میری طرف بڑھی چلی آرہی تھی۔ برف کے ڈھلوان حصے میں پہنچتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بلا بھی میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ میرے چہرے پر پسینے پھوٹ رہے تھے اور پیٹ میں انتڑیاں جیسے بل کھارہی تھیں کیوں کہ اب بندوق میرے ہاتھوں میں نہیں تھی۔ قلابازیاں کھاتے ہوئے بندوق ہاتھ سے نکل گئی تھی اور ڈھلوان کے عین درمیان پڑی تھی۔ خوف اور گھبراہٹ نے مجھ پر حملہ کردیا تھا لیکن میں نے حواس بحال رکھے۔

بلا غُرّاتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہوئی اور میں نے جُھکائی دے کر اس کے حملے سے خود کو بچایا۔ وہ ایک دھماکے سے برف پر گری اور کچی برف جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ پاؤں برف میں دھنس رہے تھے اور چلنا مشکل ہورہا تھا لیکن میں بندوق تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ڈھلوان سطح کے عین درمیان جہاں بندوق پڑی تھی میں جلدی جلدی اوپر چڑھنے لگا۔ مجھے اوپر چڑھتا دیکھ کر بلا بری طرح غُرّانے لگی پھر جسم سے برف جھاڑ کر اُٹھی اور دھم دھم برف میں پاؤں مارتی اوپر آنے لگی۔ اوپر سطح تک آنے میں اس کی رفتار مجھ سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں گھبراہٹ میں کئی دفعہ گرا لیکن اٹھ کر دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔ ڈھلوان سطح کے اوپر چڑھنا خاصا مشکل کام تھا لیکن موت کو دیکھ کر میں اس مشکل کام کو جلدی جلدی طے کررہا تھا۔

بلا جلد ہی میرے قریب پہنچ گئی اور اس کا ایک زور دار ہاتھ میرے منہ پر پڑا۔ میں اُلٹ کر

بائیں طرف گرا۔ اسی وقت بلا نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میں نے اسے اپنے جسم پر گرتے دیکھا اور اتنی ہی تیزی سے میں نے خود کو وہاں سے ہٹالیا۔

ایک دھماکے سے بلا برف میں دھنس گئی۔ برف ٹوٹنے کے شور میں بلا کے غُرّانے کا شور بھی سُنائی دیا۔

میں بلا سے کچھ ہی فاصلے پر پڑا تھا گرم گرم خون میرے گالوں سے بہتا ہوا ہونٹوں تک اپنا نمکین ذائقہ پہنچا رہا تھا۔

بلا چاروں شانے چت برف میں دھنسی پڑی تھی اور باہر نکلنے کے لئے زور لگا رہی تھی۔ میں نے اس صورتحال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈھلوان سطح پر دوبارہ چڑھنا شروع کردیا۔ میرے آگے بڑھنے والے قدم لحہ بہ لحہ مجھے بندوق سے قریب کررہے تھے اور پھر میں پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بندوق تک پہنچ ہی گیا۔

میرے ہاتھ جیسے ہی بندوق سے ٹکرائے بلا نے قریب پہنچ کر میری ٹانگیں پکڑلیں اور ٹانگوں کو اپنے شکنجے جیسے ہاتھوں میں جکڑ کر دبانے لگی۔ "اُف میرے خدا!" میں چیخ اُٹھا۔ میری ٹانگیں جیسے ٹوٹ رہی تھیں۔ میں نے بندوق تھام کر اس کا دستہ زور سے اس کے سر پر رسید کیا اور وہ پیچھے اُلٹ گئی لیکن میری ٹانگیں اس نے نہیں چھوڑی تھیں۔ میں نے تکلیف کی شدت کے باوجود بندوق کو ڈنڈے کی طرح ہوا میں گھُمایا۔ بلا نے اپنا منہ ایک طرف کیا لیکن بندوق کا دستہ اس کے منہ پر ہی پڑا۔ اس کی ناک سے سرخ سرخ خون اُبل پڑا۔ میری ٹانگیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں اور وہ چیختی ہوئی ڈھلوان سطح پر لڑھک گئی۔ اس تھوڑے سے وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک چیخ مار کر برف پر گر گیا۔ ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ میں نے گھٹنوں کے بل برف پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور درد کی لاتعداد ٹیسوں نے میری چیخیں نکال دیں میں پھر برف پر لڑھک گیا۔ لڑھکتے ہوئے تکلیف کے عالم میں میں نے دیکھا۔ بلا ڈھلوان سطح پر گرنے کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اپنی خون میں لت پت خوفناک شکل کے ساتھ غُرّاتی ہوئی میرے قریب آرہی تھی۔

میں نے اس کی غُراہٹ اپنے بہت قریب محسوس کی اور ہمّت کر کے گھٹنوں کے بل کھڑا ہوگیا۔ سرد ہوا کے جھونکے مجھ سے ٹکرائے، خوف اور کمزوری مجھ پر غالب آنے لگی لیکن بلا کے ہاتھوں موت کے خوف نے مجھے بندوق تھام کر اس کا نشانہ لینے پر مجبور کردیا۔ بلا میرے قریب آچکی تھی۔

میں نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اس کے سر کا نشانہ لیا اور بندوق کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور کھوپڑی پھاڑتی ہوئی برف میں کہیں دھنس گئی۔ میں نے بڑی ہمّت سے دوسری گولی چلائی جو اس کے گردن میں لگی اور یہ دیکھے بغیر کہ وہ مرگئی ہے یا زندہ ہے، میں برف پر گر پڑا۔ نیم غنودگی کے عالم میں میں نے دیکھا بلا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پڑی تڑپ رہی تھی اور سخت جان کنی کے عالم میں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے مسٹر برٹن کی آواز اور کچھ لوگوں کی باتوں کا شور سنائی دیا۔ وہ ڈھلوان سطح سے میری ہی طرف آرہے تھے۔

"میں نے کہا تھا ناں مسٹر شیر دل ایک بہادر شکاری ہیں۔ وہ اس بلا کو مار دیں گے جو لوگوں کا دل نکال کر کھا جاتی ہے اور دیکھو یہ بلا نہیں ایک ریچھ ہے، خوفناک ریچھ عام ریچھوں سے کتنا بڑا ہے یہ۔ اس کے جسم کی پیمائش کرنی پڑے گی۔"

میں نے مسٹر برٹن کی آواز سنی۔ "ارے مسٹر شیر دل تو زخمی ہوگئے ہیں۔ ایمرجنسی اسٹریچر لاؤ انہیں اسٹریچر پر لے جانا ہوگا۔" کسی اور کی آواز بھی سنائی دی۔

اسٹریچر کے آنے تک میں زخموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو چکا تھا لیکن دل کو یہ اطمینان تھا کہ ڈریم لینڈ کی بلا میرے ہاتھوں انجام کو پہنچ چکی ہے!!

ختم

ہٹلر

ایک مرتبہ جرمنی کا ہٹلر سرحدی علاقے میں کسی دعوت میں گیا۔ کھانے کے دوران اس کے ہاتھ سے مرغی کی ایک ٹانگ نیچے جاگری، فوراً ہی قریب موجود کتا بھاگ کر مُرغی کی ٹانگ کی طرف لپکا، ہٹلر نے طنزیہ کہا کہ "کوئی انگلش کتا معلوم ہوتا ہے؟"

پاس کھڑے ہوئے گارڈ نے فوراً کہا "نہیں سر یہاں سارے جرمن کتے ہیں، بس سر ذرا غیر مہذب ہیں آپ بے فکر رہیں۔"

مرسلہ: فوزیہ اسحاق کراچی

میسولینی

اٹلی کے حکمران مسولینی کی کار خراب ہوگئی اور اسے رُکنا پڑا اس نے کار وہیں چھوڑی اور سینما ہال میں داخل ہوگیا، فلم کے اختتام پر مسولینی کی تصویر دکھائی گئی، سب لوگ احترام میں کھڑے ہوگئے لیکن مسولینی بیٹھا رہا سینما کا مالک بھاگا بھاگا آیا اور مسولینی سے کہنے لگا "ہمارے احساسات مسولینی کے بارے میں آپ جیسے ہی ہیں، مگر ہم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ منافقت سے کھڑے ہو جائیں۔" مرسلہ: عابدہ امتیاز

تم کو بلا رہی ہیں کشمیر کی ہوائیں

انتخاب: عارفہ شارق (کراچی)

کشمیر کی ہوائیں دُھواں دُھواں فضائیں
تم کو جگا رہی ہیں تم کو بُلا رہی ہیں

زخموں سے چُور مائیں جلتی ہوئی ردائیں
تم کو جگا رہی ہیں تم کو بُلا رہی ہیں

آنسو بھری نگاہیں انسانیت کی آہیں
بچّوں کی یہ صدائیں بہنوں کی یہ دُعائیں

تم کو جگا رہی ہیں تم کو بُلا رہی ہیں

خوفناک علاج کیسے ختم ہوا

دردناک انسانی چیخیں سن کر دل لرزہ جارہا تھا۔ دکان کے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا اور فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلتی جارہی تھی!!

محمد طاہر ناز انصاری (جہلم)

یہ ۱۸۳۱ء کی بات ہے۔ایک لوہار کی دکان کے سامنے بہت بڑا ہجوم ہے .....دوکان سے انسانی چیخیں اور گوشت کے جلنے کی بو آرہی ہے.....یہاں کتے یا بھیڑیئے کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے ..... علاج پرانے زمانے کا ہے اور طریقہ بہت خوفناک ہے کہ لوہار لوہے کو گرم کر کے متاثرہ جگہ پر داغتا ہے تاکہ جراثیم مرجائیں۔ اس المناک علاج کی وجہ سے کئی لوگ جان دے دیتے ہیں لیکن اس کے علاوہ چارہ نہیں .....اسی ہجوم میں ایک بچہ بھی کھڑا یہ خوفناک علاج دیکھ رہا تھا..... جب بچہ گھر پہنچا تو اس نے اپنے ابو سے پوچھا "کتے اور بھیڑیئے انسانوں کو کیوں کاٹتے ہیں؟" ..... باپ نے لاپروائی سے جواب دیا "کتوں اور بھیڑیوں کے نتھنوں میں بھوت گھس جاتے ہیں!!" اتنا کہہ کر باپ تو کام میں مشغول ہوگیا جب کہ بچہ کچھ سوچنے لگا۔ رہ رہ کر اس کی نگاہوں کے سامنے وہ خوفناک منظر پھرنے لگا تھا جب ایک چھوٹے سے بچے کی ٹانگ کو لوہار گرم گرم لوہے سے داغ رہا تھا اور بچہ تکلیف سے بری طرح چلا رہا تھا۔ اس کے کانوں

میں اب تک اس بچے کی چیخ و پکار کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ "جانوروں کے کاٹے کا کیا کوئی آسان علاج نہیں؟" وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔ یہ بچہ پاسچر تھا جو پیرس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا ..... اس کے باپ کا نام "نیومین" تھا جو ایک افسر تھا..... پاسچر بچپن ہی سے نہایت ذہین اور عقلمند تھا۔ سبق کے دوران وہ بار بار سوال پوچھتا۔ استاد اس کی عادت سے بیزار تھے بلکہ ایک دن تو سائنس کے استاد نے کہہ دیا کہ "سوال کرنا میرا کام ہے تمہارا کام نہیں!!" حساب اور سائنس اس کے پسندیدہ مضامین تھے ..... اعلیٰ تعلیم کے لئے جب وہ پیرس چلا گیا تو ماں باپ کی یاد نے اتنا ستایا کہ وہ پیرس سے تعلیم چھوڑ کر واپس آگیا..... پاسچر نے پہلے مصور اور پھر مدرس بننے کی کوشش کی لیکن ناکامی کے بعد اس نے پیرس جا کر اپنی تعلیم شروع کر دی..... وہاں وہ ایک استاد کی باتیں سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے کیمیادان بننے کا ارادہ کیا اور پھر وہ علم کیمیا کے مطالعے میں غرق ہو گیا..... پھر اچانک ۲۶ سال کی عمر میں اس نے ایک ایسا انکشاف کیا کہ بڑے بڑے سائنس دان حیران رہ گئے..... وہ انکشاف یہ تھا کہ یو کاس اور چونے کو ملانے سے جو تیزاب بنتا ہے اس کی دو نہیں چار قسمیں ہوتی ہیں..... اس انکشاف نے اسے بہت ہی نامور سائنس دانوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔

۱۸۶۵ء میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے پاسچر کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ جنوبی فرانس کا علاقہ ریشم کی صنعت کے لئے مشہور ہے..... اس سال اچانک ریشم کے کیڑے مرنے لگے تو لوگوں نے پاسچر سے فریاد کی کہ وہ ان کو بچانے کے لئے کچھ کرے۔ پہلے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے آج تک ریشم کے کیڑے دیکھے تک نہیں میں ان کا علاج کیسے کروں..... پھر ایک استاد کی اپیل پر وہ آمادہ ہو گیا۔ اس نے دن رات ایک کر کے معلومات حاصل کیں اور چھ ماہ کے اندر اندر اس بیماری کا کامیاب علاج دریافت کر کے گاؤں واپس لوٹا تو لوگوں نے پاسچر زندہ باد کے نعرے لگائے..... اسی دوران مویشیوں میں ایک وبا پھوٹ پڑی جسے طحائی بخار کہتے ہیں..... تمام کسان پاسچر کے پاس آئے کہ ان کے مویشیوں کو جان لیوا مرض سے جان چھڑائے ..... پاسچر اور اس کے ساتھیوں نے اس کے علاج کی ٹھان لی اور دو سال کی سخت محنت کے بعد آخر ۱۸۸۰ء میں اس نے ویکسین ایجاد کی جس سے طحائی بخار کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ پاسچر نے جراثیم کو مارنے کے لئے جراثیم ہی سے کام لیا یہ انیسویں صدی کی سب سے بڑی ایجاد تھی..... اس کی وجہ

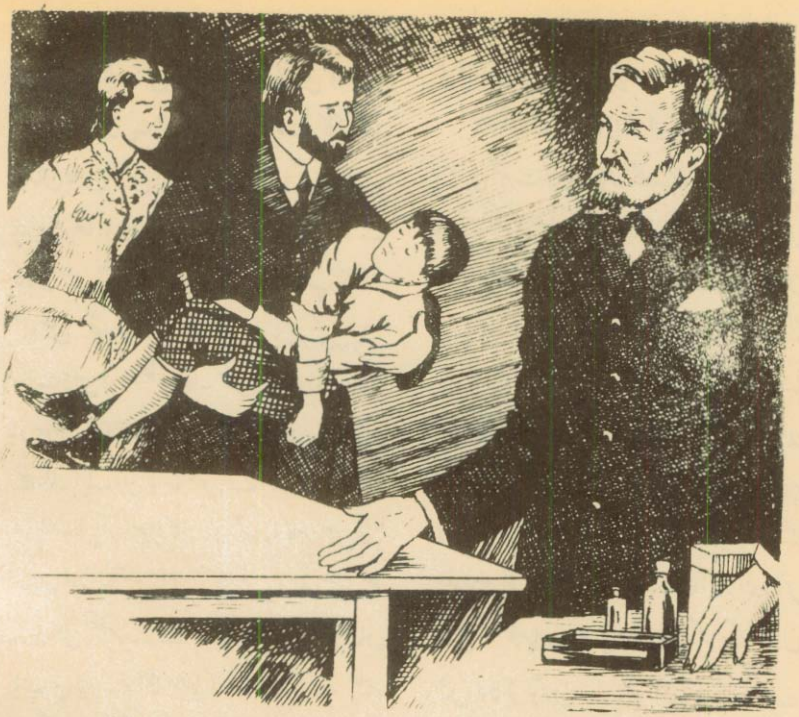

سے اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی۔ فرانس کے باشندوں نے خاص کر انسانوں نے اسے اپنا نجات دہندہ قرار دیا اور شاہ فرانس نے اسے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا اور امید ظاہر کی کہ فرانس کا یہ عظیم باشندہ انسانیت کی فلاح کے لئے اپنی تحقیق جاری رکھے گا۔ پاسچر کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بچپن میں اس نے بچوں اور کسانوں کی خوفناک چیخیں سن کر جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کے لئے اس نے اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مرکوز کرلی اور اس مقصد کے لئے اس نے ایک الگ تجربہ گاہ قائم کی..... فرانس کے کونے کونے سے کتے لاکر اکٹھے کئے اور پھر ان کے منہ سے شیشے کی نالیاں داخل کرتا۔ اسے مسلسل ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا مگر وہ ہمت نہ ہارا اور اپنے تجربات جاری رکھے..... آخر کار اس کی محنت رنگ لائی اور کامیابی نے اس کے قدم چومے..... ہوا یوں کہ ایک کتے کو جس کو اس نے ایک سخت ٹیکہ لگایا تھا باؤلا (پاگل) ہوگیا اور اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی..... آنکھیں سرخ ہوگئیں مگر وہ مرا نہیں اور کچھ دنوں بعد خود بخود

ٹھیک ہوگیا۔ چند دن بعد اس نے دوبارہ کتے کو ٹیکے لگائے ..... دوسرے روز یہ دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی کہ ٹیکے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بالکل ٹھیک ہے۔

اسی دوران ایک عورت اپنے ۹ سالہ بچے کو لے کر تجربہ گاہ میں داخل ہوئی۔ اس بچے پر ایک پاگل کتے نے چودہ وار کئے تھے..... اس کی حالت بہت خراب تھی۔ "میں اسے ظالم لوہار کے پاس نہیں لے گئی اس کی چیخیں مجھ سے دیکھی نہیں جائیں گی تم ہی کچھ کرو۔" ماں نے روتے ہوئے کہا۔ پاسچر نے ماں کو تسلی دی اور اپنے ایجاد کردہ ٹیکے کو بچے پر آزمانے کا فیصلہ کیا پھر اپنے ساتھیوں کے مشورے سے بچے کو ویکسین کا ٹیکہ لگایا جو کار آمد ثابت ہوا..... پس اس نے یکے بعد دیگرے تیرہ ٹیکے لگائے اور پندرھویں روز بچہ ہنستا کھیلتا اپنے گھر چلا گیا۔ اس کامیابی کے بعد پاسچر کا علاج دنیا بھر میں مشہور ہوگیا اور ہر جگہ یہی طریقہ علاج آزمایا جانے لگا۔

۱۸۹۵ء میں انسانیت کے اس عظیم سائنسدان کا اپنے آبائی گاؤں میں انتقال ہوگیا پاسچر مرتو گیا لیکن جانوروں کے کاٹے ہوئے لوگوں کو لوہاروں کے عذاب سے بچا گیا۔ اس کا یہ عظیم کارنامہ رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا!!

اہم معلومات

☆ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا اسلامی ملک سوڈان ہے۔

☆ رقبے کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اسلامی ملک الجزائر ہے۔

☆ رقبے کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر اسلامی ملک سعودی عرب اور چوتھے نمبر پر..... انڈونیشیا ہے۔

☆ آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا اسلامی ملک انڈونیشیا ہے۔

☆ آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اسلامی ملک بنگلہ دیش اور تیسرے نمبر پر اسلامی ملک پاکستان ہے۔

مرسلہ: دانش اختر، کراچی

جواہر پارے

○ زندگی ایک ہیرا ہے جسے تراشنا انسان کا کام ہے۔

○ انسانیت ایک بیش بہا خزانہ ہے اسے لباس میں نہیں انسان میں ڈھونڈو۔

○ جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے، وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ ورنہ تنہائی تمہاری بہترین ساتھی ہے۔

مرسلہ: قاسم بن نظر، کراچی

اندھے قیدی

ڈاکٹر تھامسن تہہ خانے میں قیدیوں کا بے ہنگم شور سن کر جلدی سے سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں داخل ہوا تو خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی کے پھٹی رہ گئیں۔ مسٹر جوزف کا پیٹ اور ڈنڈا ایک کونے میں پڑا تھا اور اندھے قیدی آپس میں جانوروں کی طرح غراتے ہوئے بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر جوزف کا گوشت کھا رہے تھے۔ کمرے میں جگہ جگہ گوشت کے لوتھڑے اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں یا وہ خون جو جوزف کے جسم سے بہا تھا.....!!

لعل بخش ، کراچی

پہلے پہل جب ڈاکٹر تھامسن کے چوکیدار نے انہیں دیکھا تھا تو خوف سے اس کا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آگیا بے حد ڈراؤنی شکل وصورت والے قیدی تھے وہ۔ چھوٹے چھوٹے جھاڑ جھنکار جیسے بال جو سر کے علاوہ جسم پر جگہ جگہ اُگ رہے تھے۔ چہرے پر موٹی سی پکوڑے جیسی ناک'..... کٹے پٹے موٹے موٹے ہونٹ جن میں سے نوکیلے دانت کبھی کبھی جھانکنے لگتے تو یوں لگتا جیسے وہ کسی کو کچا چبا جائیں گے۔ چہرے پر جابجا پھوڑے پھنسیاں تھیں جن سے ہر وقت خون اور پیپ بہتا رہتا لیکن ان کے چہرے پر سب سے زیادہ جو ڈراؤنی چیز تھی وہ تھیں ان کی آنکھیں..... گول پھٹی پھٹی آنکھوں جن میں قرنیہ نہیں تھا۔ وہ پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں اتنی ڈراؤنی تھیں کہ اگر کمزور دل کا آدمی نظر بھر کر آنکھوں کو دیکھ لیتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔

ڈاکٹر تھامسن ایک بہت بڑے سائنٹسٹ تھے اور انہوں نے علمِ کیمیا پر بہت سے کامیاب تجربے کر کے بڑی شہرت پائی تھی۔ ان کی تجربہ گاہ آبادی سے بہت دور ایک الگ تھلگ پہاڑی علاقے میں تھی جہاں وہ بڑے سکون' اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے تجربوں میں مصروف رہتے۔

کچھ ہی دن پہلے اخبار میں "ضرورت ہے ایک چوکیدار کی" کا اشتہار چھپا تھا جو مسٹر جوزف کی نظروں سے گزرا۔ مسٹر جوزف کسی زمانے میں باکسر رہ چکے تھے لیکن اب بوڑھے ہونے کی وجہ سے ان کی اولاد نے انہیں "اولڈ ہاؤس" میں داخل کرادیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کو بوڑھا محسوس نہیں کرتے تھے ان میں بہت دم خم تھا اور وہ اب بھی خود کو کسی کام میں مصروف رکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر تھامسن نے دس چوکیداروں کو مسترد کرنے کے بعد ان کا انتخاب کرلیا۔

مسٹر جوزف کا خیال تھا کہ ان کی ذمہ داری تجربہ گاہ کی حفاظت اور دیکھ بھال سے متعلق ہوگی لیکن جب مسٹر تھامسن نے رات کے کھانے پر ان کی ذمہ داری بتائی تو وہ تھوڑے سے پریشان ہوگئے۔ "گھبراؤ نہیں ..... بے شک وہ قیدی بہت خوفناک اور طاقتور ہیں لیکن وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ سب اندھے ہیں۔ میں نے ایک تجربے کے بعد انہیں اندھا کردیا ہے۔" اور پھر جب مسٹر جوزف نے تجربہ گاہ کے تہہ خانے میں ڈاکٹر کے ساتھ جاکر ان ساتوں قیدیوں کو دیکھا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ تہہ خانے کے مدہم بلب کی روشنی میں وہ ڈراؤنی صورتوں والے قیدی اندھے بھوت لگ رہے تھے۔ "یہ کبھی میرے گہرے دوست تھے اور میرے ساتھ مل کر ملک کی ترقی کے لئے ایک

اہم ایجاد پر کام کر رہے تھے جب ایجاد مکمل ہو گئی تو ان کے دل میں لالچ آ گیا اور انہوں نے یہ ایجاد دشمن ملک کو خفیہ طور پر فروخت کر دی۔ میں نے انہیں ان کی گھٹیا حرکت پر کچھ نہ کہا بس ایک دن ان کی دعوت کی اور مشروب میں ایک ایسا سیال ملا دیا جس کے پینے سے ان کے چہرے بگڑ گئے۔ اور یہ اندھے ہو گئے۔ میں نے انہیں دنیا ہی میں عبرت کا نمونہ بنا دیا ہے۔" ڈاکٹر تھامسن یہ کہہ کر ہنسا تو قیدی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے اور تہہ خانے میں ان کی خوفناک اور بے ہنگم آوازیں گونجنے لگیں۔

جوزف ان قیدیوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈنڈا ہر وقت موجود رہتا تھا۔ ڈاکٹر تھامسن کبھی کبھی آ کر قیدیوں کو دیکھ جاتے۔ جوزف ان قیدیوں کو کھلاتا پلاتا اور صبح شام انہیں ہوا خوری کے لئے باہر میدان میں لے جاتا۔ قیدیوں کے پاؤں میں باہر لے جاتے وقت بیڑیاں ڈال دی جاتیں جب وہ لڑکھڑاتے ہوئے چلتے تو بیڑیاں زمین پر رگڑا کھا کر بھیانک شور پیدا کرنے لگتیں۔ ڈاکٹر نے ان کے قریب جاتے وقت بہت ہوشیار رہنے کی ہدایت کی تھی لیکن اس دن جوزف سب بھول کر ہمدردی میں ناخن کترنے لگا۔ ابھی اس نے پہلے ہی قیدی کے ہاتھوں کے آخری ناخن کاٹے تھے کہ اس نے اس کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لی۔ جوزف گھبرا گیا۔ اس نے اس کی گرفت سے نکلنے کی بڑی کوشش کی لیکن کسی بے بس پرندے کی پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ اس کی چیخیں جسم میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس قیدی نے اس کی گردن اپنے طاقتور ہاتھوں سے الگ کر ڈالی پھر وہ زور زور سے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہنے لگا۔ اس کے بے ربط جملے اور بے ہنگم آواز کو سن کر اس کے ساتھی جوزف کے جسم پر ٹوٹ پڑے۔ اب کوئی اس کا ہاتھ توڑ کر چبا رہا تھا، کوئی اس کی ٹانگیں توڑ کر کھا رہا تھا تو کوئی اس کے دھڑ کے گوشت پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

ڈاکٹر تھامسن تہہ خانے میں قیدیوں کا بے ہنگم شور سن کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر کر اندر داخل ہوا تو اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مسٹر جوزف کا ہیٹ اور ڈنڈا ایک طرف پڑا تھا اور اندھے قیدی آپس میں جانوروں کی طرح غراتے ہوئے بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر جوزف کا گوشت کھا رہے تھے۔

کمرے میں جگہ جگہ گوشت کے لوتھڑے اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں یا وہ خون جو جوزف کے جسم سے بہا تھا.....!!

ممّی تابوت سے باہر نکل آئی

ریحانہ محبوب، کراچی

میجر کک نے ٹارچ کی روشنی دوبارہ ممّی کے چہرے پر ڈالی۔ اسے یوں لگا جیسے ممّی کی آنکھیں ہل رہی ہوں۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے ممّی کو چھوا۔ اس کا جسم گرم تھا اور وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی۔ پھر ممّی حرکت میں آئی ایک زوردار تھپڑ میجر کک کے گال پر پڑا۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں پیچھے ہٹا تو جلتی ہوئی ٹارچ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔

مصر کے ایک اہرام سے کچھ ممیاں دریافت ہوئی تھیں۔ وہاں کھدائی کا کام ہو رہا تھا۔ ممیوں کو اہرام سے نکال کر ایک عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ممیوں کی حفاظت کی ذمّہ داری چند سپاہیوں کے سپرد کی گئی۔ میجر کک ان کا

مسٹر شیر دل! "اب میں آگے نہیں جاسکتا۔" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" میں نے اپنے کندھے سے بندوق اُتار لی۔

"وہ خوفناک بلا یہیں کہیں قریب میں موجود ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ میرا دل نکال کر کھا جائے اور میں حساب والے دن بغیر دل کے اُٹھوں۔" اس کے لہجے کی بے چارگی اور دل کے بغیر اُٹھنے والی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔

"یہ دیکھئے! اس بلا کے پاؤں کا نشان۔"

میری ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ میں نے زمین پر جھکتے ہوئے اس نشان کو دیکھا اور خوف کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ گئی میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ کس کا نشان ہے؟

"صاحب! اب میں جاؤں میرا کام ختم ہو گیا ہے۔"

"تم اکیلے جاؤ گے تو وہ بلا تمہارا کام تمام کردے گی۔ ٹھہرو..... میرے ساتھ ہی چلنا۔" میں نے اس سے کہا' وہ ڈر گیا اور میرے ساتھ ساتھ بلا کے پاؤں کے مزید نشانات تلاش کرنے لگا۔

اس برفانی علاقے میں سخت سردی پڑ رہی تھی اور ہمیں خاصے گرم کپڑوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ یہ خوبصورت علاقہ قدرتی مناظر' برفانی پہاڑیوں اور سرسبز وادیوں میں گھرا ہوا تھا۔ برف باری کے دوران یہاں ہر چیز سفید نظر آنے لگتی تھی۔

قدرتی مناظر کی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے اس علاقے کا نام "ڈریم لینڈ" پڑ گیا تھا۔ ڈریم لینڈ .....واقعی خوابوں کی جنت تھی.....اور اس جنت میں ایک خوفناک بلا آگئی تھی بقول قصبے کے لوگوں کے جو انسانوں کا دل کھاتی تھی۔ اسی بلا کے علاج کے لئے مسٹر برٹن نے مجھے افریقہ کی مہم سے واپس بلوالیا تھا۔

دل چُرانے کا قصہ تو میں نے سُنا تھا اور ایک بار میرا دل بھی ایک اچھی بلا نے چوری کرلیا تھا لیکن یہ چیر پھاڑ کر دل نکال لینا اور پھر کھا جانا واقعی بڑا خوفناک کام تھا اور یہ کوئی خوفناک بلا ہی کر سکتی تھی۔

توہمات اور جلالانہ رسومات میں گھرے ہوئے اس قصبے کے لوگوں نے اس بلا کے بارے میں خاصی باتیں مشہور کردی تھیں اور اس سے

لگڑ بگھا اور ہاتھی

ضمیر احمد صدیقی، کراچی

اس کہانی کے مرکزی کردار اسی معاشرے میں اپنے فن کی آخری سانسیں گن رہے ہیں

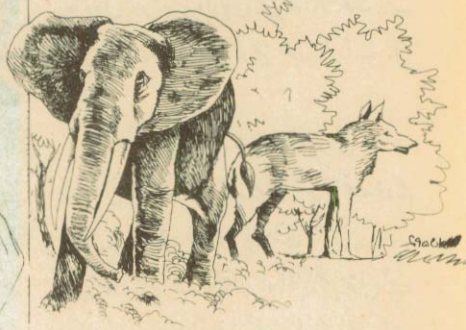

جس بچے کو کُرید کی بہت عادت تھی، وہ دادی اماں کی زبانی لگڑ بگھے اور ہاتھی کی کہانی سن کر کافی دنوں تک گم صُم رہا۔ پہلے پہل تو وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ لگڑ بگھا اور ہاتھی لوگوں سے الگ تھلگ اس لئے رہتے ہوں گے کہ وہ مغرور ہوں گے، انہیں اپنی طاقت اور جھوٹی عقل مندی پر ناز ہوگا اور وہ اسی چیز پر اِترائے اِترائے پھرتے ہوں گے جب دادی اماں نے کہانی میں یہ بھی بتایا کہ لگڑ بگھا کدو کی فصل تباہ کردیتا ہے اور ہاتھی مکئی کے پودے توڑ کر کھا جاتا ہے تو اسے ہاتھی اور لگڑ بگھے سے نفرت سی ہونے لگی۔ اس نے دونوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ تصویروں میں تو وہ بہت اچھے نظر آتے تھے لیکن حقیقت میں وہ ایسے تھے نہیں اور جو دوسروں کو نقصان پہنچانے میں لگا رہے وہ کبھی بھی اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک اور بات جو بچے کے دماغ میں کھٹکتی رہی تھی وہ یہ تھی کہ لگڑ بگھا اور ہاتھی جس میں سے ایک کو اپنی طاقت پر ناز اور دوسرے کو اپنی عقل مندی پر بڑا فخر ہے، لوگوں سے دور کیوں رہتے ہیں حالاں کہ بُری حرکتوں پر تو لوگ خود ان

سے دور رہتے ہوں گے اور ان کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہوں گے۔

اس نے اپنی بات دادا ابّا کے سامنے دہرائی۔ دادا ابّا نے پہلے تو اس کے گالوں کو پیار سے چوما..... پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، لگڑ بگھا اور ہاتھی لوگوں سے دور نہیں رہتے بلکہ لوگ ان دونوں کی بُری حرکتوں کی وجہ سے خود ان سے دور رہتے ہیں۔" دادا ابّا نے مزید کہا۔ "لگڑ بگھا اور ہاتھی انسانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔"

"انسانوں میں بھی..... وہ کیسے دادا ابّا؟ بچّے کا تجسس بڑھ گیا۔

"انسانوں میں بھی لگڑ بگھے اور ہاتھی جیسی طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں جو طاقت کے نشے میں خود کو دوسروں سے برتر سمجھتے ہیں، کوئی ان سے طاقت میں کم ہو تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں، دوسروں کے سامنے اسے نیچا دکھانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں، طنزیہ جملے کستے ہیں..... اور جو لوگ خود کو بہت عقل مند سمجھتے ہیں وہ درحقیقت عقل مند نہیں ہوتے وہ خود غرض اور چاپلوس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے قول و فعل میں بڑا تضاد ہوتا ہے اور ان کی جھوٹی عقل مندی کے پیچھے صرف اپنی ذات کا فائدہ چھپا ہوتا ہے۔" دادا ابّا اور بھی تفصیل میں جانا چاہتے تھے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بچّہ بُرے لوگوں سے بالکل نفرت کرنے لگے حالاں کہ بچّے نے بڑی نفرت سے کہا بھی۔ "دادا ابّا لگڑ بگھے اور ہاتھی جیسے لوگوں سے نفرت ہی کرنی چاہئے۔" "نہیں!" دادا ابّا بولے۔ "نفرت نہیں بلکہ انہیں آئینہ دکھانا چاہئے۔ آئینے میں انہیں اپنا اصلی چہرہ نظر آئے گا تو وہ ایک دن اچھا بننے کی کوشش کریں گے۔"

"دادا ابّا لیکن ہم اپنے بڑوں کو تو آئینہ نہیں دکھا سکتے۔ بڑے تو "بڑے" ہوتے ہیں۔" "بڑے بڑے ہوتے ہیں کوئی آسمان سے اُترے نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو آئینہ دکھانا چاہئے اور ہاں ان سے نفرت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ان کے لئے اللہ سے ہدایت کی دُعا مانگنا چاہئے۔"

دادا ابّا کی اس اچھی بات نے بچّے کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا۔ وضو کیا ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا تھا لیکن اس نے جائے نماز بچھائی، سر پر ٹوپی سجائی اور اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے لگا۔ "اے اللہ! لگڑ بگھے اور ہاتھی جیسے لوگوں کو ہدایت نصیب فرما، انہیں نیک بنا، اتنا نیک بنا کہ لوگ ان سے کبھی دور نہ رہیں۔"

ڈھول کی آواز اس قدر تیز اور بھیانک تھی کہ خوف سے دل لرزنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں موجود اشیا اُڑنے لگیں اور لکڑی کا بنا ہوا ریلنگ زوردار دھماکے سے ٹوٹ گیا پھر مارگریٹ کی کرسی زور زور سے ہلنے لگی اور وہ بری طرح چیخنے لگی..... پھر بھوت بھی نظر آ گیا۔ کالا بھجنگ بھوت۔ جس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پہلے تو وہ بچی کی کرسی ہلاتا رہا پھر گلے میں پڑا ڈھول بجانے لگا۔ "ڈھم ڈھم ڈھما ڈھم...!!"

سیّد محمد اسامہ، راولپنڈی

مسٹر جیمز اور ان کی بیگم مارتھا نے نیا گھر خریدا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں ڈرم والا بھوت رہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ایسی باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے تو ان سے کچھ ہی فاصلے پر ان کی اکلوتی بیٹی مارگریٹ کرسی پر بیٹھی بڑے مزے مزے سے "ورڈز ورتھ" کی نظم "دی نیم ٹری" گنگنا رہی تھی۔ مسز مارتھا نے کچھ ہی دیر پہلے کھانے کے برتن دھوئے تھے اور باورچی خانے سے گرم گرم سُوپ کا پیالہ لاکر مارگریٹ کے پیچھے پڑی میز پر رکھا تھا۔ ابھی وہ چاہتی تھیں کہ اُٹھ کر سُوپ کا پیالہ ڈائننگ ٹیبل پر لاکر رکھیں' ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور کمرے میں چند لمحوں کے لئے اندھیرا چھاگیا۔ اس اندھیرے میں کچھ دیر کے لئے کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ تقریباً" پندرہ سیکنڈ بعد کمرہ روشن ہوگیا اور ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ ڈھول بجنے کی آواز میں مارگریٹ کی چیخیں سر اُٹھا رہی تھیں۔ "ممی ممی..... بھوت میری کرسی ہلا رہا ہے.....!!"

بھوت بھی نظر آ گیا۔ کالا بھجنگ بھوت جس کی سُرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پہلے تو وہ بچّی کی کرسی ہلاتا رہا پھر گلے میں پڑا ڈھول بجانے لگا۔

"ڈھم ڈھم...... ڈاڈا...... ڈھم......!!" ڈھول کی آواز اس قدر تیز اور بھیانک تھی کہ اسے سُن کر دل لرزنے لگا' کمرے کی چیزیں اُڑنے لگیں اور لکڑی کا بنا ہوا سیڑھیوں کا ریلنگ چٹاخ پٹاخ کی آواز سے کئی جگہ سے ٹوٹ کر کمرے میں بکھر گیا۔ "ہائے میری بچی!" مسز مارتھا مارگریٹ کی چیخیں سُن کر بے قرار ہو گئیں۔ ان کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور دل خوف سے بُری طرح دھڑک رہا تھا مسٹر جیمز مارگریٹ کی طرف دوڑے تو ان کے قدموں میں پڑا جوتا ہوا میں اُڑتا ہوا اوپر اُٹھا اور دھڑا دھڑ ان کے سر پر پڑنے لگا۔ خوف دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔

یہ سارا ڈرامہ صرف ایک منٹ جاری رہا اور کچھ لمحوں کے لئے پھر اندھیرا چھا گیا۔ دوبارہ لائٹ آئی تو مسز مارتھا اور مسٹر جیمز نے دیکھا بھوت کمرے سے غائب تھا۔ سیڑھیوں کی ریلنگ بالکل صحیح حالت میں اپنی جگہ موجود تھی جبکہ مارتھا کرسی پر بیٹھی مزے مزے سے ورڈز ورتھ کی نظم گنگنا رہی تھی۔

مسٹر جیمز نے مسز مارتھا کی طرف دیکھا اور مسز مارتھا نے ان کی طرف۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت و خوف تیر رہا تھا۔ "تُک..... تُک..... تم نے ابھی کچھ محسوس کیا؟" مسز مارتھا نے ہکلا کر پوچھا۔ "ہاں...... بھبھ...... بھبھ..... بھوت..... وہی ڈرم والا بھوت!!" مسٹر جیمز کے لہجے میں بے حد خوف تھا۔ "مارگریٹ! میری بچّی! تم ٹھیک تو ہو۔" مسز مارتھا نے اس کے بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔ "جی ممی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" "تم نے ابھی کچھ دیکھا؟" مسٹر جیمز نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں تو ڈیڈ!" اس نے بڑے سکون سے کہا پھر اپنی گڑیا اُٹھا کر بولی۔ "ممی میں سونے جا رہی ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ گڑیا اُٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

مسز مارتھا اور مسٹر جیمز کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دونوں کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ مارگریٹ نے کچھ نہیں دیکھا۔ مسٹر جیمز نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو دبایا۔ ان کے سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ مسز مارگریٹ نے پیالے میں سُوپ نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کُھلا۔ مارگریٹ کا سر دروازے سے نظر آیا۔ وہ کہنے لگی "ڈیڈ بھوت تو بہت اچھا ہے۔ اس نے ہمیں نئے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔" وہ ایک لمحے کو رُکی پھر دوسرے ہی لمحے بولی اور ہاں وہ کہہ رہا تھا تمہارے ڈیڈ کے بال بہت بڑے ہیں۔ کل تک وہ حجام سے بال چھوٹے کروالیں ورنہ......!!

روح میرے ساتھی تھی

لوید اختر

"آپ روحوں پر کتنا یقین رکھتے ہیں؟ کیا آپ کبھی روحوں سے ہم کلام ہوئے ہیں؟"

"میری گفتگو اگر کبھی روحوں سے ہوئی ہوتی تو میں ضرور یقین کرتا کہ واقعی روح بھی چلتی پھرتی ہیں اور باتیں کرتی ہیں۔" میں نے مسٹر شہروز کی بات کے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ہماری گفتگو کوئی ڈرائنگ روم میں نہیں ہو رہی تھی۔، چلتی ہوئی ریل میں ہو رہی تھی۔

اس گفتگو سے پہلے میں دوسرے ڈبے میں تھا جہاں میری سیٹ بُک تھی لیکن اس ڈبے پر کچھ لڑاکا قسم کے لوگوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا تھا اور وہ لوگ میری سیٹ چھوڑنے پر قطعاً تیار نہ تھے اس سے پہلے کہ میرا ان سے جھگڑا ہو جاتا، ریلوے کے گارڈ مسٹر شہروز وہاں آگئے اور میری سیٹ وہاں سے کینسل کر کے اس سلیپر ڈبے میں لے آئے جو بالکل خالی پڑا تھا۔

گورے چٹے، نیلی مقناطیسی آنکھیں، سر کے بالوں میں سفیدی تیرتی ہوئی لیکن نہایت ہینڈسم شخصیت کے مالک..... گارڈ کی وردی میں نہایت جچتے ہوئے اور پھر دنیا بھر کی معلومات، باتوں کا دل موہ لینے والا انداز.....

میں ان کی باتیں سُن رہا تھا کہ انہوں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ نہایت نفیس سگریٹ، ایک منہ میں دبایا اور دوسرا میری طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ شہروز صاحب .....میں سگریٹ نہیں پیتا۔" "ارے پی کر تو دیکھیں یہ اس دنیا کے سگریٹ نہیں ہیں" انہوں نے مسکراتے ہوئے

کہا۔ "اچھا...... تو پھر کہاں کے ہیں؟" "یہ لیجئے دیکھئے اور بتایئے کہاں کے ہیں؟" میں ایک سگریٹ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا اس پر لکھا تھا "میڈ ان پرستان" "لگتا ہے کسی شرارتی سگریٹ کمپنی کا ہے۔" میں نے سگریٹ کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں واپس کردیا۔

باتیں ہوتی رہیں...... وقت گزرتا رہا...... رات کے بارہ بجے تو مسٹر شہروز نے اپنا اوور کوٹ سیٹ سے اُٹھا کر پہنا۔ "اچھا بھائی! میرا ڈیوٹی کا وقت ہوگیا ہے میں تو چلا۔" وہ سلیپر کے دروازے تک گئے اور پھر وہیں سے کہا۔ "بُرے لوگوں کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے اور اچھے لوگ اپنی نیکیوں اور لوگوں کی دعاؤں کی بدولت آفتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ------- اچھی روحیں بھی ان کی مدد کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں...... اچھا ...... اللہ حافظ!" اتنا کہہ کر انہوں نے سر پر کیپ لگایا اور ڈبے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ میں بہت گناہ گار انسان ہوں لیکن اللہ سے بہت ڈرتا ہوں اور میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ میری باتوں سے یا کسی بھی حرکت سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ .... میں مسٹر شہروز کے جملوں پر غور کرہی رہا تھا کہ ٹرین کو ایک جھٹکا لگا۔ کچھ دور جاکر ٹرین رُک گئی۔

تقریباً" ایک گھنٹے بعد گاڑی چلی تو ٹکٹ چیکر کی وردی میں ملبوس ایک شخص سلیپر ڈبے میں داخل ہوا "ٹرین کیوں رُک گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "حادثہ ہوگیا تھا۔" "کیسا حادثہ؟" آخری ڈبا پٹڑی سے اُتر گیا تھا اور اس میں سوار تمام افراد ہلاک ہوگئے۔ وہ سب ڈاکو تھے اور حیدر آباد جیل سے فرار ہو کر اس ڈبے میں سوار ہوئے تھے۔" ٹکٹ چیکر نے تفصیل بتائی۔ "اُف میرے خدا!" میں نے یہ سُن کر اپنا سر تھام لیا۔ "کیا ہوا جناب؟" "میں کچھ گھنٹے پہلے اسی ڈبے میں سوار تھا۔ ان ڈاکوؤں نے میری سیٹ پر قبضہ کررکھا تھا وہ تو اللہ بھلا کرے آپ کے شہروز صاحب کا کہ وہ عین جھگڑے کے وقت وہاں آگئے اور میری سیٹ وہاں سے کینسل کر کے یہاں سلیپر میں لے آئے۔"

انہیں تو مرے ہوئے بھی گیارہ سال ہوچکے ہیں۔ یقیناً"... آپ نے ان کی روح دیکھی ہوگی۔ اس سے پہلے بھی یہ روح کئی اچھے لوگوں کو حادثوں سے بچا چکی ہے۔" ٹکٹ چیکر کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس واقعہ سے پہلے میں روحوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن اب یقین ہوگیا ہے کہ روحیں بھی ہوتی ہیں جو نظر آتی ہیں اور اللہ سے ڈرنے والوں کی مدد بھی کرتی ہیں.......!!

رابعہ ابراہیم (کراچی)

کشمیر کا ننھا بھوت

موسم رات ہی سے خراب تھا۔ کبھی گھپ اندھیرا چھا جاتا، کبھی ہلکی ہلکی سی روشنی نکل آتی اور کبھی بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ساری وادی میں خاموشی تھی جو یقیناً "کسی آنے والے طوفان کا پتہ دے رہی تھی لیکن کشمیریوں کے لئے یہ موسمی طوفان کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے بڑے بڑے طوفان کشمیریوں کے گھروں پر آئے تھے جب ان کے باپ، بیٹے یا بھائی کی لاشیں گھر لائی جاتی تھیں۔

"مجھے امی کی بات مان لینی چاہئے تھی، پتہ نہیں کب طوفان آجائے....." عدیل یہی کچھ سوچتا ہوا اس چھوٹے سے پہاڑی سلسلے کی طرف

تیز موسلادھار بارش میں آسمانی بجلی بار بار چمک رہی تھی اور اس جلتی بجھتی بجلی کی روشنی میں بارود چلانے والے بھارتی سپاہی گرتے پڑتے، کیچڑ میں لت پت خوف سے چیختے چلاتے بگٹٹ بھاگے جارہے تھے۔ ان کی ماؤں نے کہا تھا کہ ویران اور اجاڑ جگہوں پر بھوت رہتے ہیں....!!

جارہا تھا جہاں سبزے سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی خوبصورت پہاڑیاں تھیں یہیں کچھ دن پہلے اس نے اپنے دوستوں علی اور قاسم کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا غار دریافت کیا تھا۔ تینوں پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ اب جبکہ چھٹیاں تھیں تو تینوں روز شام کو کھیلنے کے لئے پہاڑیوں والے غار میں آجاتے.... یہ غار آبادی سے کچھ ہی دور تھا۔

"عدیل! آج باہر جاکر کھیلنے کی ضرورت نہیں

جو کچھ امی نے کہا وہ اس نے نہیں سُنا کیونکہ فوراً باہر کھسک لیا تھا۔ "علی اور قاسم میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا اور اوپر پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اسے شام کے بجائے رات کا وقت لگ رہا تھا اس سے پہلے کہ طوفان شروع ہو وہ غار تک پہنچ ہی گیا۔ جیسے ہی اس نے اپنا پہلا قدم اندر رکھا باہر تیز ہواؤں کے جھکڑ شروع ہو گئے غار میں ہوا کا زور نہیں تھا لیکن وہ اندر داخل ہوتے ہی چونک گیا۔ اندر سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "اچھا تو علی اور قاسم پہنچ چکے ہیں، آج ان کے ساتھ ضرور کوئی شرارت کرنی چاہئے۔" یہ سوچ کر اس نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر اندر پھینکا اور خود غار کے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھُپ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ اس کے دونوں دوست ڈر کے مارے چیختے ہوئے باہر نکلیں گے مگر یہ کیا؟ وہ تو فوجی تھے انڈین آرمی کے دو فوجی جو بندوقیں اُٹھائے بڑے محتاط انداز میں ادھر ہی آ رہے تھے۔ "یقیناً" یہ مجھے پکڑلیں گے" اور پھر ..... آگے کا سوچ کر اس کا دل دہل گیا۔ اسے رہ رہ کر امی کا خیال آ رہا تھا۔ "جب میں گھر نہیں پہنچوں گا تو وہ کتنا پریشان ہوں گی اور جب میری لاش.....!!"

اس سے آگے سوچنے کی اسے ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ غار کے ایک اندھیرے کونے میں دبک گیا۔ انڈین آرمی کے دونوں سپاہی اس کے کچھ فاصلے پر ہی آ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں وہ چھُپا ہوا تھا لیکن اندھیرا ہونے کے باعث وہ اسے دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ عدیل انہیں قریب پا کر خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن وہ سپاہی تو اس سے زیادہ ڈر و خوف کا شکار تھے۔ "بلرام سنگھ! میں نے کہا تھا ناں کہ یہاں مت ٹھہرو یہ غار ٹھیک نہیں، اندر اس کی صفائی دیکھ کر تمہیں اندازہ نہیں ہوا، یقیناً" یہ مجاہدین کی غار ہے اور اب وہ شاید یہیں پہنچ چکے ہیں، اب ہماری خیر نہیں۔" ایک فوجی نے ڈرتے ڈرتے دھیمی آواز میں دوسرے فوجی سے کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

دوسرے فوجی کی آواز میں بھی خوف کی لرزش نمایاں تھی۔ عدیل نے دیکھا دونوں کے ہاتھ بندوق اُٹھانے کے باوجود کانپ رہے تھے۔ اسی وقت بجلی کڑکی اور بادل زور سے گرجا۔ دونوں فوجی ایک چیخ مار کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ عدیل کی تو ہنسی ہی نکل گئی۔ "ہوں ہوں ہوں.....ہاہاہا.....!!" اس نے بڑی مشکل سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا..... پھر بھی ہنسی غار میں گونج اٹھی۔ "تت تت ..... تم ..... تم نے آواز سُنی

اس غار میں مجاہدین نہیں بھوت ہے بھوت ..... نکلو یہاں سے، بھوت ہنس رہا ہے!!" ایک فوجی کی خوف میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "بھبھ ..... بھبھ بھوت.....باپ رے باپ بھگوان خیر کرے مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے ماتا کہتی تھی ویران اور اجاڑ جگہوں پر بُری روحیں اور بھوت بسیرا کرتے ہیں لیکن ہم یہاں سے نکلیں کیسے باہر تو طوفان آیا ہوا ہے۔!!" ایک فوجی کی گھبراہٹ میں ٹوپی گر پڑی بجلی چمکی تو اس کی گنجی ٹنڈ ننھے عدیل کو دکھائی دی۔ عدیل نے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھا کر اس کی ٹنڈ پر دے مارا۔ "ارے ماتا! مرگیا مرگیا بھوت نے مجھے مار ڈالا۔" وہ چیختا چلاتا گرتا پڑتا باہر بھاگا اس کے پیچھے اس کا دوسرا بزدل ساتھی بھاگ نکلا۔ بجلی زور سے کڑکی۔ کیچڑ میں لت پت، خوف سے آدھے ہوتے ہوئے سپاہیوں نے چند سیکنڈ کی روشنی میں بھاگتے بھاگتے دیکھا، غار کے سوراخ سے ایک سرخ و سفید ننھا بھوت جھانک رہا تھا اور..... زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

"ہاہاہاہا.... ہاہاہاہا.....!!"

وہ بارش سے بچنے کیلئے غار میں گھسے تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ وہاں کشمیر کا ایک ننھّا بھوت ان کا انتظار کر رہا ہے۔ کشمیر کا وہ ننھّا بھوت اُن کی بُزدلی پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ "ہاہا ہاہا..... ہاہاہاہا...!!"

دوستی

دنیا میں ہزار ہا قسم کے پھول موجود ہیں مگر لازوال مہک رکھنے والا پھول صرف دوستی کا ہے۔ جس سے نگاہیں خیرہ اور دل مسرور ہوتا ہے فی زمانہ بے لوث دوستی کمیاب اور نادر الوجود ہے۔ دوستی کے پھول کے دل میں نرم گداز اور حساس زمین میں کاشت کر کے خون جگر سے سینچا جاتا ہے۔ اس کی نشوونما کے لئے اعتماد، اعتبار، خلوص، چاہت بہترین کھاد کا کام دے سکتے ہیں۔ مہروفا، محبت و ایثار، ہمدردی و انکساری کی لطیف اور مرطوب آب وہوا میں یہ پھول خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اسے شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کی بادسموم سے محفوظ رکھیں ورنہ حسد، بغض اور کینہ جیسے امراض اسے تباہ و برباد کردیں گے اور محبت کی دلکش پتیاں سوکھ جائیں گی، بے جان ٹہنیاں تلخ یادوں کی مانند رہ جائیں گی اس طرح ہم دنیا کی انمول ترین دولت سے محروم ہوجائیں گے!!!

مرسلہ: صدف اسمٰعیل

تندرستی ہزار نعمت ہے

حنا ناز، کراچی

اسکولوں کے اکثر بچے مضمون لکھنے سے گھبراتے ہیں۔ ایسے گھبرائے ہوئے بچوں کے دلوں میں سے مضمون نویسی کا ڈر نکالنے کے لئے "آنکھ مچولی" نے آسان، عام فہم زبان میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے جسے اسکولوں ہی کے بچے لکھیں گے۔

اس سلسلے کا تیسرا مضمون پیش خدمت ہے جسے چوتھی جماعت کی ہونہار طالبہ حنا ناز نے لکھا ہے۔

انسان کے پاس لاکھ دولت ہو، تندرستی نہ ہو تو سب بے کار ہے۔ ایک تندرست فقیر کو جو راحت اور چین حاصل ہوتا ہے وہ ایک بیمار مالدار کو نصیب نہیں ہوتا۔

ہر فرد کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے اور اس کی حفاظت کرنی چاہئے۔ تندرستی اللہ کی نعمت ہے۔ تندرستی کے اصولوں کی پابندی کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بعض لوگ شروع میں ہی بیماری کی پرواہ نہیں کرتے۔ مرض بڑھ جاتا ہے اور بعد میں انہیں بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ ذرا سی بھی بیماری ہو تو اس کا فوراً علاج کرنا چاہئے۔

تندرستی کے لئے ورزش لازمی ہے۔ ورزش سے بدن کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں اور خون کا دوران دُرست رہتا ہے۔ ایک دن چھوڑ کر غسل بھی کرنا چاہئے اس سے بدن کا میل دور ہوتا ہے اور مسامات کھل جاتے ہیں۔

صحت مند رہنے میں غذا بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غذا موزوں اور مناسب ہونی چاہئے۔ گوشت کے بجائے سبزیاں اور دالیں کھانی چاہئیں۔ ان میں بہت زیادہ لحمیات ہوتے ہیں۔ سڑے گلے پھل اور بازار کی چٹپٹی کھلی ہوئی چیزیں جن پر گرد اُڑتی اور مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں، ہرگز نہیں کھانی چاہئیں۔

یاد رکھئے! ایک صحت مند جسم میں ہی ایک صحت مند دماغ ہوتا ہے۔ صحت مند قومیں زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ آگے جبکہ تندرستی سے محروم بیمار قومیں ہمیشہ پیچھے رہتی ہیں۔

تندرستی اللہ کی دی ہوئی نعمت اور دولت ہے اور ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہئے اور اس کی قدر کرنی چاہئے.....!!

ٹی وی

ہمارا مستقبل تاریک کر رہا ہے!!

.....میڈیا معاشرے میں ایک طاقتور ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی طاقت ذہنوں کو مُتاثر کرتی ہے اور اس کے ذریعے کوئی بھی پیغام بڑی تیزی اور سرعت سے لوگوں تک پہنچتا ہے۔ ٹی وی جو میڈیا کا ایک حصہ ہے' پاکستان میں اسلامی روایات' شائستگی' وقار' ادب لحاظ اور اخلاقی قدروں کو پامال کر رہا ہے۔

اس سے پیش کئے جانے والے ڈراموں اور بے ہودہ موسیقی کے پروگرامات میں مغربی نظریات' بے حیائی' مخلوط طرز زندگی اور مغربی تقلید پسندی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے جس سے معاشرے میں بے چینی اور بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔

ٹی وی کی بھیڑ چال والی پالیسی پاکستان کے نوجوانوں کے ذہنوں کو خراب کر رہی ہے' ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پاکستان کا مستقبل تاریک کیا جا رہا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کے اسلامی ممالک ایسی خوفناک صورتحال سے دوچار ہیں۔ مُسلم نوجوانوں میں بے حیائی' مخلوطِ طرز زندگی اور مغربی تقلید کے جراثیم پھیلا کر ان کے ذہنوں اور جسموں کو مفلوج کیا جا رہا ہے' ان کے اندر سے جہادی روح نکالی جا رہی ہے اور انہیں چلتی پھرتی لاشوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

محمد شہزاد خان کستوری گورنمنٹ ڈی جے سائنس کالج کے ہونہار طالب علم ہیں۔ فارغ اوقات میں لکھتے لکھاتے ہیں۔ آنکھ مچولی میں ان کی اکثر تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ آنکھ مچولی کے خوفناک نمبر کے لئے انہوں نے خاص طور پر یہ سروے کیا جو یقیناً "ایک محنت طلبہ مرحلہ تھا۔

اس سروے کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنا نہ بھولئے گا.....!!

قلم دوست

"بچے نرم شاخ کی مانند ہیں۔ انہیں جس طرف موڑا جائے مُڑ جائیں گے۔" "بچے بہت نازک اور حساس ہوتے ہیں وہ اپنے اِرد گرد کے ماحول کا بہت اثر لیتے ہیں۔" اس طرح کی باتیں آپ نے سُنی اور پڑھی ہوں گی۔

موجودہ دور الیکٹرونک میڈیا کا دور ہے اور ٹی وی اس کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ نئے چینلز کے آغاز میں اب یہ بات کہی جانے لگی ہے کہ "بچے کی تربیت والدین نہیں ٹی وی کر رہا ہے۔" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کا ٹی وی بچوں اور نوجوانوں کو کیا دے رہا ہے اور کس طرح ان کے ذہنوں کو متاثر کر رہا ہے؟"

ٹی وی کی خوفناک پالیسی پر ہم نے اسکول کے بچوں اور نوجوانوں سے ایک سروے کیا جو اس خاص نمبر میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مصعب : ہماری ملاقات سب سے پہلے مصعب سے ہوئی جو گورنمنٹ بوائز اسکول جہانگیر روڈ میں نویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو کسی حد تک یہ بالکل درست ہے۔ بعض لوگ اس بے حیائی یعنی موڈرانائزیشن (Modranization) کو زمانے کی ترقی قرار دیتے ہیں اور نئی تہذیب کا رونا روتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ محض بھیڑ چال ہے۔ آج جو لابی ایسے پروگرامز پیش کر کے نئی نسل کو گمراہ کر رہی ہے میرے نزدیک یہ وہ کوے ہیں جو ہنس کی چال چل کر کالے انگریز بننا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے پہلے بھی اپنی ہر چیز گنوائی اور اب عزتِ مسلمانی کو بھی لُٹا رہے ہیں۔"

عرفان احمد صدیقی : عرفان لانڈھی میں رہتے ہیں اور انہوں نے کمپیوٹر پروگرامنگ میں ڈپلوما کیا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے کہا "اللہ نے ہمارا مستقبل خود ہمارے حوالے کیا ہے۔ (اہلِ مغرب کے حوالے نہیں) ٹی وی پر قوم کے نوجوانوں اور نونہالوں کا یہ حال ہے کہ فن کی دنیا میں قدم رکھنے کے لئے ان سے ذو معنی باتیں اور

بھونڈی حرکتیں کرائی جاتی ہیں۔ بہن اور بھائی مل کر ناچتے اور گاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کے درمیان اس طرح کی گفتگو اور ناچ گانوں کے ذریعے ہمیں کس چیز کی تعلیم دی جارہی ہے؟ اس بات کی تعلیم ٹی وی والے ہمیں دے رہے ہیں کہ ہم خود بے حیائی کے خوگر بن کر اپنے رب کی رحمتوں سے اپنے آپ کو محروم کرلیں۔ خدارا کچھ سوچیں؟ ٹی وی پر جن لوگوں کا قبضہ ہے انہوں نے نئے کلچر اور نام نہاد ترقی کی خاطر (جو درحقیقت تباہی ہے) اپنے دلوں سے خوفِ خدا کو نکال کر بے حیائی کو جگہ دے ڈالی ہے۔ خدا ان کو جنہوں نے بے حیائی کو قوم کی خدمت قرار دیا ہے، نیکی کی توفیق دے۔ آمین!"

محمد وقار نواز :

یہ ڈی جے سائنس کالج میں پری میڈیکل کے طالب علم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لفظ T . V مخفف ہے Vile Throughout یعنی "سراسر نجس" جہاں تک ٹی وی کے اثرات یعنی اچھے یا بُرے ہونے کا دارومدار ہے وہ انسان کی اپنی منشا پر ہے۔ ٹی وی نے ہمارے معاشرے پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں یہ بڑا ہی بھیانک سوال ہے۔ بقول شیطان،

ع ہم سے جو ہو نہ سکا کام
وہ کر گزرے ہو تم

کسی بھی معاشرے میں اس کی اقدار کے خلاف کسی دوسرے اقدار کا آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ معاشرہ اپنے مقصد کو بُھلا چکا ہے۔ درحقیقت ہمارا مقصد پاکستان کا قیام نہ تھا بلکہ مملکتِ خداداد میں اسلامی معاشرے کا قیام تھا اور حالات کو دیکھ کر (پاکستان کے ابتدائی حالات) ہمیں یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ، ع

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

فرحان :

سہیل اکیڈمی کے طالب علم فرحان سے ہماری اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جس طرح بچے ایک نرم شاخ کی مانند ہیں اسی طرح نوجوان نسل بھی ایک گرم لوہے کی مانند ہے۔ ان پر جس طرح کی چوٹ ہم میڈیا لگائے گا یہ اسی صورت میں ڈھل جائیں گے۔ ہمارے ٹی وی پر جس طرح کے پروگرامز دکھائے جاتے ہیں اس میں نہ تو ہمارے ملک کی ثقافت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی مثبت پیغام بلکہ ٹی وی کی وجہ سے مغربی تہذیب ہماری نوجوان نسل میں اپنی جڑیں مضبوط کررہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہمارے نوجوانوں کے ہیپی ٹائپ کے ناچ گانوں

کے مختلف گروپس ہیں جو اودھم بازی کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ N.T.M سے "کڈز کلب" "ٹاپ آف دی پاپ" "مرینہ کچن" "ہپ ہپ ہرے" کو صرف اس لئے اوّلیت دی جارہی ہے کہ یہ مغربی اسٹائل پر ہیں۔ حالانکہ اس میں سوائے فضول حرکتوں اور ذو معنیٰ جملوں اور بے مقصد گفتگو کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" فرحان نے آخر میں کہا'

"اللہ اربابِ اقتدار اور اربابِ ٹی وی کو ہدایت دے اور ان کا قبلہ دُرست کردے۔"

مزمّل احفاظ :

پرنس علی بوائز اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں اور دسویں جماعت کے ہونہار طالب علم ہیں۔ انہوں نے ٹی وی سے زیادہ الزام حکومت کو دیا اور کہا' "موجودہ حکومت کے برسراقتدار آتے ہی ٹی وی کی نشریات میں مغربی تصوّرات کو فروغ ملا ہے۔ پی ٹی وی اور ایس ٹی این سے رقص و موسیقی اور فنکارانہ بے حجابی فروغ پارہی ہیں۔ ہماری سیاسی ' معاشی اور انتظامی عوارض کی خامیاں کینسر کی طرح بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہیں۔ وہیں پر..... پی ٹی وی اور این ٹی ایم کی نشریات ہمارے بچّوں پر منفی اثرات ڈال رہی ہیں جن سے ہمارے بچّوں میں قومی حمیت اور ضبطِ نفس رخصت ہوچلے ہیں۔ یہ دونوں اوصاف ماں کی آغوش اور مکتب کی تربیت سے حاصل ہوتے ہیں مگر افسوس یہ دونوں سرچشمے ہمارے الیکٹرونک میڈیا سے معمور ہوچلے ہیں۔ ہماری نشریات سے ہماری قومی زندگی میں انتشار اور فساد دکھائی دیتا ہے۔ مغربی طرزِ زندگی سے والدین کا احترام ہمارے بچّوں میں سے یکسر ختم ہورہا ہے اور اگر ہم نے اپنے بچّوں کو ایک اچھا مسلمان' ایک اچھا پاکستانی اور ایک اچھا شہری بنانا ہے تو ہمارے والدین اور اربابِ اقتدار کو بچّوں کی بہتر تربیت کرنی پڑے گی۔"

راحیل خان :

ان کے امی ابو ڈاکٹر ہیں اور ان کا ارادہ بھی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننے کا ہے۔ ہمارے سوال کے جواب میں انہوں نے کہا " آج کل ہمارا الیکٹرونک میڈیا (ٹیلی ویژن) جس طرح کے پروگرام نشر کررہا ہے اسے دیکھ کر واقعی بڑا افسوس ہوتا ہے.... ٹی وی بچّوں کے ذہنوں کو بے حیائی اور بُرائی کی طرف لے جارہا ہے۔ اس طرح یہ بچّے کس طرح ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔"

"یہ تو واقعی پاکستان کا مستقبل تاریک کرنے

کی سازش ہے۔ حکومت کو اس سازش کا قلع قمع کرنا چاہیئے۔"

راشد :

گلشن اقبال میں رہتے ہیں انہوں ہمارا سوال سننے کے بعد کہا "سب سے پہلے تو میں یہ پوچھتا ہوں ہمارے ملک کی شہری آبادی کتنی ہے صرف تیس فیصد۔ اس شہری آبادی میں سے بھی صرف پانچ فیصد لوگ ایسے ہیں جو اپنے Underhand طریقوں سے پورے معاشرے پر چھائے ہوئے ہیں۔ ٹی وی بُرا نہیں بلکہ یہی پانچ فیصد لوگ ہیں جنہوں نے باقی تمام ۹۵ بز فیصد پر اس طرح کے پروگرام مسلط کردیئے ہیں ورنہ ہمارے ہاں ایسا کب ہوتا ہے۔ لیکن قصور وار اسّی فیصد عوام بھی ہیں آخر وہ ایسے بے حیائی، بے ہودہ اور اخلاقی قدروں سے عاری پروگراموں پر خاموش کیوں ہیں؟"

شعیب :

سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ "سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ٹی وی پر بچّوں کے لئے سرے سے پروگرام پیش ہی نہیں کئے جاتے اور جو پیش کئے جاتے ہیں ان کو دیکھتے ہی ہم ٹی وی آف کرکے بیٹ سنبھالتے ہیں اور گراؤنڈ کا رُخ کرتے ہیں۔ مگر آج کل جو پروگرام پیش ہورہے ہیں جیسے کھیل ٹائم، کڈز کلب وغیرہ تو ایسے پروگرام مغربی پروگرامز کی نقل ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہم خوب ہنستے ہیں۔ آدھی ٹانگوں والی چڈھیاں پہنے آدمیوں اور ناچتی لڑکیوں کو دیکھ کر.... لیکن ہنسنے سے تو کام نہیں چلے گا ایسے لوگوں کا علاج کرنا پڑے گا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے کوئی مغربی ملک نہیں کہ جس کا جو جی میں ... آئے وہ یہاں کرتا پھرے۔"

نعمان احمد خان :

نے کہا "والدین کے پاس تربیت کے لئے وقت نہ رہا تو انہوں نے تربیت کے لئے شیر خواروں کو ٹی وی کی گود میں ڈال دیا اور ٹی وی جس کو خود تربیت کی ضرورت ہے، کینسر کی بیماری کی طرح بچوں اور نوجوانوں کو تباہ کررہا ہے۔ مخلوط پروگرام ناچ گانے، ٹھمکے لگانے والے ہیرو، ہیروئن کے بے سروپا انٹرویوز اور عشقیہ ڈرامے....

خدارا ذرا ہوش کے ناخن لیں ورنہ پانی سروں سے اوپر چلا گیا تو ہم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

یہ شعر مجھے پسند ہے

قارئین کے منتخب اشعار

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
مرسلہ : فیصل احمد شجراہ، کندھ کوٹ

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے!
مرسلہ : محمود شامی، کراچی

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
مرسلہ : صدف مظفر، راولپنڈی

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تونے؟
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
مرسلہ : عبدالرشید، عاصم، اسلام آباد

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
مرسلہ : کلثوم شیخ، کراچی

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں؟
مرسلہ : خیرانسا، کراچی

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
مرسلہ : فرسان غوری، کراچی

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا!
مرسلہ : اظہرخان، کراچی

تو راز کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا، خدا کا تر جماں ہوجا
مرسلہ : شبانہ رشید، کراچی

بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تو رانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!
مرسلہ : راشد، کراچی

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی
مرسلہ : ریاض احمد، سکھر

تو اسے پیمانہ امروز فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی
مرسلہ : اجمل انصاری، کراچی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
: طارق انصاری، کراچی

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپادے
مرسلہ : ریاض، حیدر آباد

آخری بات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"جو کوئی چاہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے پیار کریں' اسے چاہئے اپنے ہمسایہ کا حق ادا کرے۔

ہم جس جگہ رہتے ہیں وہاں آس پاس رہنے والے لوگ ہمارے ہمسائے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ جب ہم چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو سب سے پہلے ہماری جان پہچان آس پاس رہنے والوں سے ہوئی تھی۔ ہم کھیلنے کے لئے ان کے گھروں میں جاتے تھے۔ رسول اللہؐ نے ہمیں ہمسایوں کے آداب بھی بتائے ہیں۔

ایک دن آپؐ نے فرمایا :

"لوگو! جانتے ہو ہمسایہ کا کیا حق ہے؟ سنو انہیں مدد کی ضرورت ہو تو ان کی مدد کرو۔ بیمار ہوں تو انہیں دیکھنے کے لئے جاؤ۔ خوشی اور غم میں ان کے ساتھ رہو۔"

اپنے ہمسایوں کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہئے۔ ہمسایوں کو دکھ دینا بہت بری بات ہے ایک دن آپؐ نے فرمایا :

"اللہ کی قسم وہ مومن نہیں بن سکتا۔
اللہ کی قسم وہ مومن نہیں بن سکتا۔
اللہ کی قسم وہ مومن نہیں بن سکتا۔"

لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا :

"اے اللہ کے رسولؐ! کون مومن نہیں بن سکتا!"

آپؐ نے فرمایا:

"وہ آدمی جس کا ہمسایہ اس سے تنگ ہو۔"

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ہمسایوں کا ہمیشہ خیال رکھیں۔ انہیں کبھی تنگ نہ کریں۔ ہمسایوں کو خوش رکھنے سے اللہ بھی خوش ہوتا ہے اور اس کے رسولؐ بھی۔!!

ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ کیجئے

PREMIER Plus

پریمیئر پلس استعمال کیجئے

واحد گیسولین جس میں سیسے کی آمیزش نہایت کم ہے۔ اب ملک بھر میں دستیاب ہے

- دھوئیں کے اخراج پر بہتر کنٹرول
- اعلیٰ کارکردگی
- بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ

PSO

پاکستان اسٹیٹ آئل

آپ کی خدمت ہماری اولین ترجیح

PARAGON

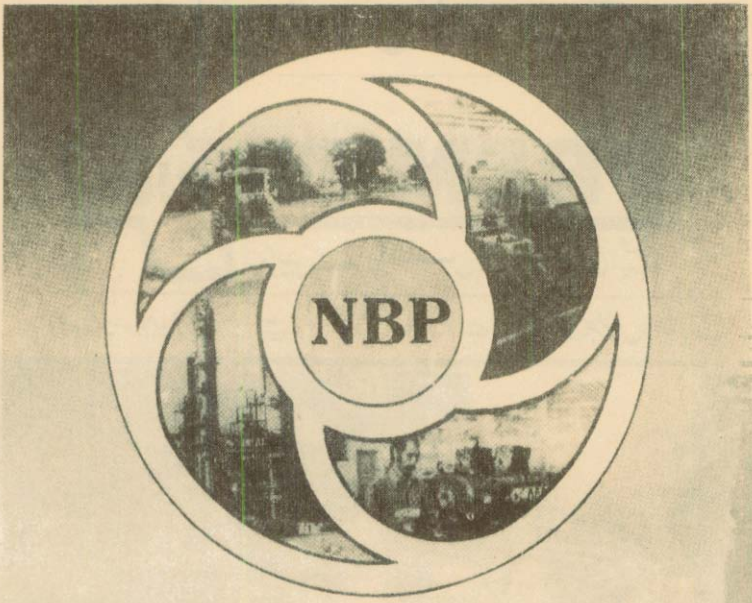

ہر پہلو سے ممتاز بینک

- ۴۵ سال سے ترقی کی راہ پر گامزن
- قومی ترقیات اور ملکی مالیات میں کلیدی کردار
- اندرون ملک و بیرون ملک وسیع براہ نیٹ ورک
- ملکی اور غیر ملکی کرنسی کا مکمل بینکاری نظام
- ڈپازٹس پر زیادہ منافع کی ادائیگی
- جدید ترین سہولتوں سے آراستہ
- آپ کے قیمتی وقت کا مکمل احساس

ہر پاکستانی بینک سے زیادہ مُنافع حاصل کرنے کا ریکارڈ

بینکاری کی تمام خدمات کے لیے
کامل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجیے۔

نیشنل بینک آف پاکستان
مستحکم قدریں، جدید بینکاری

UNITED

FIRST-AID BANDAGE

SANIPLAST®

چھوٹا زخم فوری آرام

SANIPLAST
سنی پلاسٹ اب گول شکل میں بھی
دستیاب ہے
SANIPLAST-SPOT

پیارے بچو! آپکو اسکول کے اوقات، کھیل کود اور دیگر مشاغل میں عموماً خراش، چھالے، چھوٹے زخم لگ جاتے ہیں۔ فوری امدادی چٹی سنی پلاسٹ استعمال کریں.... ہمیشہ سنی پلاسٹ کو اپنے اسکول بیگ، اسپورٹس کِٹ، کتابوں کی الماری یا جیب میں دو ایک پٹیاں رکھیں تاکہ فوری ضرورت پر آپ SANIPLAST فوری امدادی پٹی استعمال کرسکیں۔

سنی پلاسٹ کا پیغام
صاف ستھرا ماحول صحت مند معاشرہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے

Marketed by:
uniferoz

UF/SP/MP/A/95

NATIONAL

سوشل سیکورٹی اسکیم

محنت کشوں اور اُنکے اہلِ خانہ کو
معاشی تحفظ فراہم کرتی ہے۔

اس اسکیم کے فروغ میں

ادارہ سماجی تحفظ ملازمین سندھ

سے تعاون کیجئے۔

منجانب ..... اراکینِ عملہ

سندھ سوشل سیکورٹی

ڈائریکٹریٹ

APPETA *Finger Chips*

A -IS FOR APPETA

D ON'T BUY ANY OTHER CHIPS

B -ECAUSE.... APPETA IS THE BEST

E NJOY APPETA

C -CHILDREN LOVE US

F -INGER CHIPS

ذائقے کی دنیا میں

A IS THE **APPETA**

32-33, Industrial Triangle Estate, Kahuta Road, Islamabad, Pakistan. Phone: 51-490471-4 (PABX-4 Lines) Fax: 51-491117-4, Telex: 54421

REGD. No. M-266 NOVEMBER 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

Interflow